یزید

ایک تاریخ ـــــ ایک ناول

سید رئیس احمد جعفری

مقبول اکیڈمی
199۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

اہتمام ——— ملک مقبول احمد
مطبع ——— شاہ اینڈ سنز پریس پرنٹرز

○

مقبول اکیڈمی، لاہور

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد، و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر
مدینۃ الرسولؐ	۱۷
دمشق کے ایوان شاہی میں	۲۶
کھچڑی پکنے لگی	۳۴
مدینہ کے گورنر کے نام فرمان	۴۰
امام حسینؑ کا نظریہ	۴۷
دو ٹوک بات	۵۰
تلوار کا فیصلہ	۶۶
لیلےٰ	۷۳
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟	۷۸
یزید کی دعوت	۸۲
باغی لڑکی	۸۸
لیلےٰ اور رقیّہ	۹۸
لیلےٰ چلی پردیس	۱۰۵
کوفہ	۱۱۱
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ	۱۱۶
دل سے دل تک	۱۲۱
حرفِ محبّت	۱۲۶
سسکیاں	۱۳۱
فکرِ فردا	۱۳۵
غمِ محبّت	۱۴۰
اقرار	۱۴۴
حیرت اور حسرت	۱۴۹
خواب اور حقیقت	۱۵۳
نافرمان	۱۵۵
آتش فشاں	۱۵۸
سبطِ رسولؐ کے دربار میں	۱۶۲
میں کسی فضیلت کا مدعی نہیں	۱۶۷
شرطِ جہاد	۱۷۱

ولید بن عتبہ حاکمِ مدینہ	۱۷۵
مدینہ چھوٹتا ہے	۱۷۹
حق اور باطل	۱۸۳
جب میدانِ حشر میں سوال ہوگا	۱۸۷
یزید کا غصّہ	۱۹۱
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے	۱۹۶
عجیب شرط	۲۰۱
منذر یزید کے سامنے	۲۰۶
تشویش انگیز حالات	۲۱۰
ابن سرجون رومی	۲۱۵
ابن زیاد	۲۱۹
بہت عجیب فیصلہ	۲۲۴
محشرستانِ جذبات	۲۲۹
سنگ دلی	۲۳۳
خفیہ اجتماع	۲۳۷
یہ کون تھا!	۲۱۴
سنسنی خیز فیصلہ	۲۴۶
ہم بھی عاشق ہیں	۲۵۰
وہ ساربان	۲۵۵
نئے پروگرام نئے ولولے	۲۶۰
راہِ فرار	۲۶۵
جوشِ جہاد	۲۷۱
محبت کی کسک	۲۷۶
وقتِ رخصت	۲۸۱
یزید بن مسعود	۲۸۷
پہلا شہید	۲۹۲
رات کی تاریکی میں	۲۹۸
پھر سفر	۳۰۳
ایمان مجھے روکے ہے تو / کھینچے ہے مجھے کفر	۳۰۹
ابنِ زیاد کا اضطراب	۳۱۵
ابن زیاد کی تلوار	۳۲۰
بے چاری لیلے	۳۲۶
ایک اور حادثہ	۳۳۱
تیرا ارادہ کدھر ہے آج	۳۳۶
آتش نمرود	۳۴۱
ابن زیاد کے سامنے	۳۴۷
مسلم بن عقیلؓ کی شہادت	۳۵۲
سر ایک طرف دھڑ ایک طرف	۳۵۹
انوکھی مصیبت	۳۶۵
لگاوٹ کی باتیں	۳۷۱
موقع مل گیا	۳۷۷
خدا وہ دن کرے اس سے / جو میں یہ بھی کہوں وہ بھی	۳۸۰
نیا ساتھی	۳۸۹
وہ مرا پہلے پہل داخل زندان ہونا	۳۹۶

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اِسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(مولانا محمدؐ علی جوہر)

یہ بھی ہوتا ہے	۴۰۲
ایک اور شہید	۴۰۹
من دوست و دامان آلِ رسولؐ	۴۱۶
امام حسینؑ کی تقریر	۴۲۲
شمر	۴۲۸
پری تمثال حباب	۴۳۴
قتل کے مشورے	۴۳۹
مومن کی معراج	۴۴۲
جنت کا خواب	۴۴۹
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی	۴۵۵
قتلِ حسینؑ	۴۶۱
قتل، قتل، قتل	۴۷۱
مردِ مجاہد	۴۷۶
حضرت زینب اور یزید کا مکالمہ	۴۸۲
بخت و اتفاق	۴۸۷
قاتلانِ حسینؑ کا انجام	۴۹۰
اے فلک رشک سے نہ جل مرنا	۴۹۵

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

(اقبالؔ)

انتساب

سردار محمدؒ اسحاق خاں (کوئٹہ)

کے نام

پیش لفظ

گذشتہ چند سالوں میں اس تاریخی ناول کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اب تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ گذشتہ ایڈیشنوں میں متعدد غلطیاں رہ گئی تھیں اس تیسرے ایڈیشن میں ان کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ نہ صرف گذشتہ غلطیوں کی تصحیح بلکہ نظر ثانی کر کے حذف و اضافہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اور اب یہ کتاب صحیح معنی میں دوگانہ حیثیت کی حامل ہے، یہ اپنی جگہ تاریخ بھی ہے اور ناول بھی۔

بعض اخبارات کے ضرورت سے زیادہ قابل اصحاب قلم پورا زور اس پر صرف کر رہے ہیں کہ تاریخی ناولوں کی افادیت کا انکار کریں۔ ایسے لوگ ہمدردی کے مستحق ہیں۔ انہوں نے چند لفظ سن لئے ہیں اور انہی کی رٹ لگائے چلے جا رہے ہیں۔ تاریخ کو بنیاد بنا کر، اصلاحی ناول ہر زبان میں لکھے جاتے رہے ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی، فرنچ اور دوسری زبانوں میں اس طرح کا لٹریچر بکثرت موجود ہے۔ اس کی افادیت اور مقصدیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو لوگ تاریخ سے بھی ناواقف ہیں اور ادب میں بھی دسترس نہیں رکھتے وہ اپنی جہالت چھپانے اور علمیت جتانے کے لئے اس طرح کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر اُردو زبان میں بھی نام نہاد نقاد اور ادیب اس طرح اپنی علمی کوتاہیوں کو چھپاتے ہیں، تو وہ ملامت سے زیادہ ہمدردی کے مستحق ہیں۔

بہرحال "یزید" کے نام سے ایک تاریخی اور ادبی کوشش آپ کے سامنے ہے۔ اور میرا یہ مستقل خیال ہے کہ سب سے اچھا نقاد وہ نہیں ہے جو اخبار میں تنقید لکھ کر دل کی بھڑاس نکالتا ہے بلکہ وہ ہے جو اپنی گاڑھی کمائی کے پیسے خرچ کر کے کتاب خریدتا ہے۔

رئیس احمد جعفری
۸۲۔ ٹیگور پارک
لاہور
۱۲؍ فروری ۱۹۶۸ء

حضرت امام کا ایک خطبہ

"اے لوگو! نیکیوں کی جانب متوجہ ہو اور جو مواقع تمہیں ملیں ان سے جتنی جلدی ممکن ہو فائدہ حاصل کرو۔ دیکھو مواقع کو ضائع نہ ہونے دو، اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں کلمہ و خیر سے یاد کریں اور تمہیں عظمت حاصل ہو تو یاد رکھو کہ اعمال نیک اور جود و سخا اس کا سب سے بہتر ذریعہ ہیں۔ ایک نیک کام خودبخود داد و تحسین حاصل کر لیتا ہے۔ اور اس کا نیک انجام اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔"

خطبۂ امام کا ایک حصّہ

"اے لوگو! رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی ظالم بادشاہ کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے محرمات کو حلال کرتا ہے، رسول کی پیروی نہیں کرتا، خلق اللہ میں ظلم وگناہ کے کام کرتا ہے اور یہ دیکھ کر اس نے کسی قسم کی دست اندازی قول سے یا عمل سے نہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی اس کے ساتھ ہی شمار کرے گا۔

آگاہ ہو جاؤ کہ ان لوگوں (یزید و امرائے یزید) نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت چھوڑ کر شیطان کی تابعداری شروع کر دی ہے۔ فتنہ و فساد برپا ہو چکا ہے۔ حدود شرعی سے دست کش ہو گئے ہیں۔ مال غنیمت کو ذاتی مال سمجھ لیا ہے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا ہے۔ ان حالات میں غیرت آنے کا موقع سب سے زیادہ میرے ہی لئے ہے!"

حضرت امام کا ایک ارشاد

"ہاں! سرداری اس کو ملتی ہے جو سعی و عمل اور جد و جہد سے کام لیتا ہے۔ بخل سے کام لینے والا شخص اپنی ذلت کے سامان خود فراہم کرتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سب سے بڑا فیاض کون ہے؟ وہ جو ایسے شخص کے ساتھ حسن سلوک کرے جس سے اسے کوئی امید نہ ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ معاف کرنے والوں میں سب سے پسندیدہ کون ہے؟ وہ جس میں سزا دینے کی طاقت ہو مگر اس کے باوجود بھی وہ معاف کر دے۔ تمہیں معلوم ہے کہ صلہ رحمی سے پیش آنے والوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ وہ جو ان لوگوں سے بھی صلہ رحمی کا برتاؤ کرے جو قطع رحمی کرتے ہیں۔"

ارشادِ ہمام

"میں فاطمہؓ بنت محمدؐ اور علیؑ کا بیٹا ہوں۔ میری جان تمہاری جان کے ساتھ اور میرے اہل وعیال تمہارے اہل وعیال کے ساتھ ہیں، تم کو میرے ساتھ بھلائی کرنی چاہیے لیکن اگر تم نے ایسا کیا اور عہد شکنی کی تو یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے، اس سے پہلے تم نے میرے والد، میرے برادر حقیقی اور عم زاد مسلم بن عقیلؓ کے ساتھ بھی تو یہی سلوک کیا تھا۔ افسوس کہ تم لوگ مجھے دھوکا دے کر اپنی دینداری کا حصہ ضائع کر رہے ہو، جو شخص بدعہدی کرے گا وہ اپنی جان کے ساتھ بدعہدی کرے گا۔ اور جلد ہی خدا تعالیٰ مجھے تم سے بے نیاز کر دے گا۔"

باب ۱

مدینۃ الرسولؐ

یہ وہی شہر ہے جو اسلام سے پہلے یثرب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اب مدینۃ الرسولؐ کے معزز نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کو الوداع کہہ کر یہاں رونق افروز ہوئے تھے۔ جب آپؐ تشریف لائے تھے تو گنتی کے چند مسلمانوں نے والہانہ جوش وخروش کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں نے فرطِ مسرت سے بیتاب ہو کر ترانۂ عقیدت گانا شروع کر دیا تھا۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

یہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں نے حیرت اور دہشت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ عجیب وغریب منظر دیکھا۔ ایک شخص تھا جو بالکل سادہ لباس میں ایک سانڈنی پر سوار تھا لیکن جلالِ شاہی، سطوتِ جم، شکوہِ دارا اس کے خاکِ پا کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی تھی۔ یہ مٹھی بھر مسلمان جو اس کے دائیں بائیں ادب سے سر جھکائے عقیدت سے چُور اور محبت سے مخمور چل رہے تھے۔ ان کے تیوروں سے معلوم ہو رہا تھا۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اور وہ سوچ رہے تھے کہ جس انجام کا آغاز یہ ہے اس آغاز کا انجام کیا ہوگا۔ پھر واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ اندیشہ بے جا نہ تھا۔ بہت مختصر مدت میں مدینے کے بام ودر اللہ اکبر کی صداؤں سے گونجنے لگے۔ ایک نیا دین نمودار ہوا جو

جنگل کی آگ کی طرح پھیلا اور استعداد و صلاحیت رکھنے والا کوئی دامن بھی اس سے نہ بچ سکا۔ آنے والا نبیؐ بظاہر بے یار و مددگار تھا نہ اس کے پاس فوج تھی، نہ روپیہ، نہ قوت، نہ طاقت لیکن اس کے منہ سے نکلے ہوئے بول فرمانِ الٰہی بن جاتے تھے۔ لوگوں نے بہت کوشش کی کہ اس کی آواز نہ سنیں لیکن جن کانوں تک وہ پہنچ گئی وہ پھر اپنے دل کو اس کے قبول کرنے سے نہ روک سکے۔ جن کی چودھراہٹ ختم ہو رہی تھی، جن کی سرداری اور قیادت کا پرچم سرنگوں ہو رہا تھا۔ وہ دل میں مخالفت، عداوت اور ایذا رسانی کا طوفان سمیٹے ہوئے بارگاہ رسالت میں پہنچے تھے لیکن یہاں آ کر بے بس ہو جاتے تھے۔ ان کی تلوار کاٹ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کند ہو گئی ہے۔ ان کی زبان مخالف کے دلائل توڑنے اور اسے خاموش کرنے میں بے مثال تھی۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گنگ ہے۔ یہ سر آن پر کٹ سکتے تھے کسی کے آگے جھکنا انہوں نے نہ سیکھا تھا۔ لیکن یہاں آتے ہی یہ سرِ تسلیم بن کر رہ جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھر سے چلتے وقت یہ کچھ اور تھے اور یہاں پہنچ کر کچھ اور ہو گئے ہیں۔

مدینہ مسلمانوں کا ملجاء اور اسلام کا ماوئی بن گیا — یہاں سے اسلام کی دعوت بلند ہوئی اور دور و نزدیک قبولیت کا اثر لئے ہوئے پہنچ گئی۔

مکہ فتح ہو گیا۔ حجاز کے سارے قبائل اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے جو کعبہ بتوں کا سب سے بڑا استھان تھا وہ خدائے واحد کی عبادت اور پرستش کی سجدہ گاہ بن گیا۔ جہاں سے اسلام کی مخالفت اور نبیؐ کی عداوت کے سوتے پھوٹتے تھے۔ آج وہیں سے اسلامیت اور للٰہیت کے چشمے ابلنے لگے جو اس کے بدترین دشمن تھے وہ اسلام کے جانباز اور فداکار بن گئے۔ جو شمس و قمر، شجر و حجر اور دریا و سمندر کی پوجا کرتے تھے۔ وہ خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے لگے۔ جو قتل و غارت کشت و خون، لوٹ مار کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا چکے تھے۔ وہ تقدس اور دیانت کے پیکر بن گئے۔ جو فواحش کا ارتکاب علی الاعلان کرتے تھے

انہوں نے حیا کی چادر اوڑھ لی اور زندگی کو نئے سانچے میں ڈھال لیا۔ جو ظالم تھے وہ رحمدل بن گئے، جو شراب کے رسیا تھے وہ موج کوثر میں غرق ہو گئے جو لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے انھوں نے عورتوں کو مساوات کا درجہ عطا کر دیا۔ جو مجبوروں پر ظلم کرتے تھے وہ رحیم بن گئے۔ جو دوسروں کے حقوق پر چھاپا مارتے تھے وہ عادل بن گئے جو اقدار انسانی کو پامال کرتے تھے وہ دکھی اور مظلوم انسانیت کے پاسبان بن گئے، خیانت اور بدعہدی جن کا وطیرہ تھا وہ دیانت اور دیانت کے پتلے بن گئے۔ اسلام ہر قبیلہ، ہر گھر، ہر فرد کا مذہب بن گیا۔

اور جب اسلام کا کام پورا ہو گیا تو اسلام کا پیامبر تمام نعمت کا توشہ لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا ــــ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال امت مسلمہ کے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اسلام کی عمارت متزلزل ہونے لگی ہے لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی کے جذبۂ ایمانی اور فراست مومن نے راستہ کا ہر پتھر ہٹا دیا اور اسلام کا کارواں پھر آگے بڑھنے لگا ــ ابوبکر رضی کا انتقال بھی ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی کے تدبر اور اخلاص و ایمان نے تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اسلام کا قافلہ پھر صراطِ مستقیم اور منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ حضرت عثمان رضی کے عہد میں فتنوں نے سر اٹھایا لیکن حضرت علی مرتضیٰ رضی کی مشکل کشائی غالب آئی اور اسلام کا بحرِ بیکراں اپنے صاف اور شفاف پانی کے ساتھ پھر لہریں مارنے لگا۔ لیکن ابن ملجم کے خنجر نے اس کی روانی میں رکاوٹ ڈال دی۔

اور اب تختِ خلافت پر امیر معاویہ رضی متمکن ہیں۔ یہ دور عہد نبوی اور خلافت راشدہ سے کتنا مختلف ہے ؎

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک جام
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

واقعی اب دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ چوتھائی صدی سے کچھ زیادہ

کی مدت میں اتنا بڑا انقلاب آگیا تھا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ لوگ جنہوں نے رسول مقبولؐ کی آنکھیں دیکھی تھیں، جنہوں نے ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و حیدرؓ کی رفاقت میں زندگی بسر کی تھی جنہوں نے دیکھا تھا کہ ان کا رسولؐ سیم وزر کے ڈھیر حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتا اور خود فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتا تھا اور جو اپنی چہیتی اور اکلوتی بیٹی فاطمہؓ کو ایک کنیز یا خادم دینے پر تیار نہ ہوا جس نے اپنے محبوب نواسوں کو بیت المال کی ایک معمولی سی چیز سے بھی فائدہ نہ اٹھانے دیا جس کے خلفاء راشدین نے بے لوثی اور بے غرضی کی نہ مٹنے والی روایات قائم کردیں۔ ابوبکرؓ نے جانشینی کے لئے اپنے بیٹے پر نظر بھی نہ ڈالی جو ہر اعتبار سے اپنے باپ کا جانشین بننے کا مستحق تھا۔ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت عمرؓ نے وصیت کی کہ عبداللہ نہ خلیفہ بن سکتا اور نہ خلافت کا امیدوار۔ علی مرتضیٰؓ ابن ملجم کے خنجر سے خون میں نہا کر عالم بالا کے لئے جب سفر آخرت فرمانے لگے تو لوگوں نے دریافت کیا۔ آپ کے بعد ہم کس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ حسنؓ یا حسینؓ کے؟ ارشاد ہوا میں نہیں جانتا میں تمہیں اس طرح چھوڑے جاتا ہوں جس طرح رسول اللہ نے چھوڑا تھا۔ نہ انہوں نے کسی کے سر پر خلافت کی دستار باندھی تھی نہ میں ایسا کروں گا۔ تم جانو اور تمہارا کام۔

جن لوگوں نے اور جس امت نے یہ روح پرور اور یہ دلکشا مناظر دیکھے تھے آج وہی امت یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ بیت المال کا روپیہ کس بیدردی سے "خلیفہ" کے ذاتی عیش و تنعم پر خرچ ہو رہا ہے۔ جس کے سامنے رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کی یہ سنت تھی کہ استحقاق اور اہلیت کے باوجود اپنے کسی عزیز قریب کو جانشین نہیں بنایا وہی آج یہ دیکھ رہی تھی کہ امیر معاویہؓ اپنے نااہل اور غیر مستحق بیٹے یزید کو تخت خلافت سونپنے کی علانیہ کوشش کر رہے ہیں۔ جس قوم نے یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے چاروں جانشینوں نے مسجد میں نماز بغیر کسی امتیاز اور اختصاص کے ہمیشہ ادا کی۔ آج امیر معاویہؓ جب مسجد میں آتے ہیں تو

مقصورہ میں نماز پڑھتے ہیں گویا اسلام کی یہ خصوصیت کہ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمودؔ و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بالکل ختم ہو چکی تھی۔

حکمران کی سیرت اور کردار کا اثر قوم پر ضرور پڑتا ہے۔ چنانچہ آج کے شام کی حالت جہاں امیر معاویہؓ برسرِ حکومت تھے اس حالت سے بالکل مختلف تھی جو ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے دورِ خلافت میں نظر آتی تھی پہلے صرف للّٰہیت تھی اب ذاتی منفعت اور سود و زیاں کا خیال بھی دل و دماغ میں گردش کرنے لگا تھا۔

لیکن مدینہ اب تک پہلی حالت پر قائم تھا۔ بیماری کے آثار اور علامتیں صرف جسم کے مختلف اعضا پر نظر آتی تھیں دل اب تک محفوظ تھا۔

اور جب تک مدینہ میں سبطِ رسولؐ جگر گوشۂ بتولؑ امام عالی مقام حسین علیہ السلام کا وجود باوجود موجود تھا اس وقت تک اس دل پر کوئی آنچ نہیں آسکتی تھی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام مدینہ میں ایسے تھے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔

مدینے کے رہنے والے اگرچہ بہت بڑی نعمت سے محروم ہو چکے تھے لیکن اب بھی بہت بڑی نعمت ان کے پاس تھی۔ آنحضرت اس خاکدان عالم سے پردہ فرما چکے تھے لیکن دوشِ رسولؐ کا سوار ان کے درمیان موجود تھا —— کیا یہ بہت بڑی نعمت نہیں تھی؟

جب کوئی خلش پیدا ہوتی، قلب و دماغ میں کوئی سوال ابھرتا حالات و مسائل پریشان کن صورت اختیار کرتے یہ ایک در تھا جہاں پہنچتے اور پہنچنے کے بعد ان کی ہر پریشانی دور ہو جاتی، ہر وسوسہ نابود ہو جاتا، ہر خلش راحت سے بدل جاتی۔ مدینہ میں اب بھی بہت سے اکابر صحابہ موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے رسول اکرمؐ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ جنہوں نے غزوات

میں جنگوں میں رسول صلعم کی رفاقت کی تھی۔ زخم کھائے تھے۔ تکلیفیں برداشت کی تھیں، دُکھ جھیلے تھے۔ جو پہلے کی طرح آج بھی دین کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے جنھیں نماز میں جو لذت ملتی تھی وہ تختِ شاہی اور مسندِ شہریاری پر نہیں ملتی تھی۔ دمشق کی حکومت جو کچھ کر رہی تھی وہاں جس طرح سونے چاندی کی ریل پیل تھی، جاگیریں تقسیم ہوتی تھیں، انعامات ملتے تھے، شعراء کو، ادیبوں کو نوازا جاتا تھا۔ اس سے اہلِ مدینہ بے خبر نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہاں ہُن لُٹ رہا ہے۔ لیکن ان میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ دیارِ رسولؐ کو چھوڑ کر دمشق کی راہ لیں اور وہاں بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر فلاحِ دنیا حاصل کریں۔ دن میں پانچ مرتبہ وہ مسجدِ نبوئی میں حاضری دیتے تھے روضۂ رسولؐ کی زیارت کرتے تھے اور زندگی کا حاصل پا لیتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کی یہ آرزو تھی کہ ؎

تمنّا ہے کہ چوکھٹ پر ترے روضے کی جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقیّد کا

دنیا کی ہر لذت، ہر انعام، ہر جاگیر، ہر سرفرازی اور سر بلندی اس نعمت کے آگے ہیچ تھی اور حضرت امام حسینؑ کی موجودگی نے اس نعمت اور کیفیت میں کہیں زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ امام والا مقام کو دیکھ کر شبیہ رسولؐ آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ابھی ان کے پاس ایسی نعمت موجود ہے جس پر وہ ہر متاعِ دنیوی کو بڑی خوشی سے قربان کر سکتے ہیں اور قربان کر کے خوش ہو سکتے ہیں۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم ،
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

حضرت کا معمول یہ تھا کہ وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اس لئے کہ جانتے تھے کہ حکومتِ وقت انہیں مشکوک اور مشتبہ نظر سے دیکھتی تھی۔ آپ لب کشائی سے احتراز فرماتے تھے کہ حکومتِ وقت کو شکایت کا موقعہ نہ ملے۔ یہ وضع احتیاط اس لئے تھی

کہ آپ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی ایسی بات ہو جس سے نظامِ حکومت میں اختلال واقع ہو۔ اب تک آپ مایوس نہیں تھے آپ کو امید تھی۔ حالات افسوسناک ضرور ہیں لیکن ناقابلِ اصلاح اور مایوس کن نہیں ہیں۔ ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ انہیں سیدھے راستے پر لگایا جا سکتا ہے۔ خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کیا جا سکتا ہے اور حکومت کو پھر اسی رنگ میں رنگا جا سکتا ہے۔ جو عہدِ خلافت راشدہ میں صاف نمایاں اور ممتاز نظر آتا تھا۔

دمشق کے جو واقعات اور حالات مدینے کے لوگوں تک پہنچتے تھے ان سے یہ لوگ بہت پریشان تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سنتِ نبویؐ قیصر و کسریٰ کی سنت بھی بنائی جا سکتی ہے۔ خلافت اور امامت بادشاہت اور ملوکیت میں تبدیل ہو سکتی ہے ـــــ لیکن واقعات بہرحال واقعات تھے ان سے آنکھیں نہیں بند کی جا سکتی تھیں۔ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہیں جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ایک روز مسجدِ نبویؐ میں نمازِ عشا کے بعد خلافِ معمول کچھ لوگ بیٹھے رہ گئے جب باقی لوگ چلے گئے تو ان میں آپس میں باتیں شروع ہو گئیں۔ ایک نے کہا: "دمشق سے جو اطلاعیں آ رہی ہیں وہ بہت زیادہ پریشان کن اور اضطراب انگیز ہیں۔"

دوسرا بولا "آخر وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو مضطرب اور پریشان کر رکھا ہے؟"

پہلے نے جواب دیا: "بات یہ ہے کہ دمشق کی خلافت اب بادشاہت اور ملوکیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اسلامیت کے اثرات کم ہو رہے ہیں۔ دنیا پرستی غالب آ رہی ہے۔ جن چیزوں کو مٹانے کے لئے اسلام نمودار ہوا تھا وہ پھر ابھرنے لگیں۔ ہم اگر ان حالات کی اصلاح نہیں کر سکتے جان تو قربان کر سکتے ہیں۔"

ایک تیسرے ساتھی نے کہا: "کیا آپ خروج کرنا چاہتے ہیں یعنی بغاوت؟"

اس نے جواب دیا "ہاں! ہم نے اپنی زندگی میں کئی جہادوں میں حصّہ لیا ہے اور ان جہادوں کا مقصد مالِ غنیمت نہ تھا۔ ذاتی منفعت نہ تھی۔ وہ صرف خدا کے لئے تھے۔ یہ آخری جہاد بھی مالِ غنیمت یا ذاتی منفعت کے لئے نہیں صرف رضائے الٰہی کے لئے ہوگا۔"

ایک اور ساتھی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا "یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب اصلاح سے مایوسی ہو جائے۔ ابھی تک اصلاح کی توقع ہے اور جب تک یہ توقع ہو ہمیں صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ جہاد بڑی اچھی چیز ہے لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ مسلمانوں سے بھی جہاد کیا جا سکتا ہے۔"

ایک اور ساتھی نے کہا "بات تو ٹھیک ہے مسلمانوں سے جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن شاید آپ یہ بھول گئے ہیں کہ مسلمانوں کو تخریب کی اجازت بھی نہیں دی جا سکتی۔ آج جو کچھ دمشق کی خلافت کر رہی ہے کیا آپ اس کا تصوّر بھی خلافتِ راشدہ کے دور میں کر سکتے تھے؟"

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا "ہرگز نہیں قطعاً نہیں۔"

پہلے آدمی نے کہا "یہی میں بھی کہتا ہوں۔"

ایک اور شخص نے بحث میں حصّہ لیتے ہوئے کہا "سوال یہ ہے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

جواب ملا "بہت کچھ ـــ میں پھر یہی کہوں گا۔ اگر ہم کچھ اور نہیں کر سکتے تو اپنی جان دے سکتے ہیں۔ سرخرو ہو کر خدا کے حضور میں حاضر ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے یہ کہہ سکتے۔ ہم تیرے دین کو بدعتوں سے اور تخریبی کوششوں سے نہ بچا سکے لیکن اس راہ میں اپنی زندگی نچھاور کر دی۔"

ایک اور آدمی نے مشورہ دیا "بجائے اس کے کہ اس مسئلہ پر ہم یہاں گفتگو کریں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ سبطِ رسولؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور ان کی خدمت میں اپنے معروضات پیش کر کے ہدایت کے طالب ہوں۔

اس تجویز پر سب لوگ متفق ہو گئے اور طے ہوا کہ صبح حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جائے۔

باب ۲

دمشق کے ایوان شاہی میں

دمشق اب مشرق کا بہت بڑا شہر ہے چونکہ امیر معاویہؓ نے اسے مرکز خلافت بنا دیا ہے۔ اس لئے اس کی مرکزیت اور مرجعیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ وہ لوگ جن کی آنکھوں نے اس شہر میں عمرؓ فاروق کو آتے دیکھا تھا۔ وہ آج یہ دیکھ کر حیران پریشان نظر آتے تھے۔ کہ کس قدر جلد خلافت کی سادگی بادشاہت کے دبدبے میں منتقل ہو گئی ــــ امیر معاویہؓ اب بوڑھے ہو چکے تھے اور انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ روز بروز دنیا سے رختِ سفر باندھنے کا زمانہ قریب تر آتا جا رہا ہے۔ وہ بہت زیادہ مضطرب تھے کہ ان کے بعد خلافت کا بار کس کے کندھوں پر رکھا جائے گا؟

ایک روز اپنے قصر میں خاموش و مضمحل بیٹھے تھے اتنے میں حاجب حاضر ہوا اور اس نے کہا۔

امیر المومنین کی خدمت میں شیخ احمد باریاب ہونے کی اجازت چاہتے ہیں"

شیخ احمد کا نام سن کر امیر معاویہؓ کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ کچھ دیر انھوں نے تامل کیا پھر بلند آواز میں کہا۔

"اجازت ہے"

حاجب چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں شیخ احمد نمودار ہوئے انہیں دیکھ کر امیر معاویہؓ نے اخلاق اور تپاک کے ساتھ اپنے قریب مسند پر بٹھا لیا اور تبسم کرتے ہوئے کہا۔

"خوب ہوا تم آ گئے۔ آؤ بیٹھو"

شیخ احمد:۔ اگر اجازت پاؤں تو کچھ عرض کر دوں۔

امیر معاویہ:۔ ہاں شوق سے کہو۔ تمہاری باتیں ہم توجہ سے سنتے ہیں۔ ان میں وزن ہوتا ہے، اخلاص ہوتا ہے۔ وفاداری ہوتی ہے۔

شیخ احمد:۔ آج خلافِ معمول آپ کچھ مضمحل اور افسردہ سے نظر آتے ہیں۔ میں اس وقت تک بے کل رہوں گا جب تک آپ کے اضطراب اور پریشانی کا سبب معلوم نہ ہو جائے اور میں اسے دور نہ کر لوں۔

امیر معاویہ:۔ اس وقت جو چیز ہمیں پریشان کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے بعد خلافت کا بارِ گراں کون اُٹھائے گا؟

شیخ احمد:۔ خدا امیر المومنین کو مدتوں سلامت رکھے جب تک وہ زندہ ہیں اس مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

امیر معاویہ:۔ یہ نہ کہو شیخ احمد! انسان کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں پھر میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس بڑھاپے نے میرا کس بل چھین لیا ہے۔ بہت زیادہ کمزور ہو گیا ہوں۔ موت میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتی نظر آ رہی ہے کوچ کا نقارہ بج چکا ہے۔ بس اب زادِ راہ لے کر اُٹھ کھڑے ہونے کی دیر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ موت کو لبیک کہنے سے پہلے ہم اپنی جانشینی کا فیصلہ کر جائیں۔

شیخ احمد:۔ بجا ارشاد ہوا امیر المومنین!

امیر معاویہ:۔ تمہاری رائے میں اس منصب کا اہل اور مستحق کون ہے؟

شیخ احمد:۔ علیؓ کے بیٹے حسینؓ، عائشہؓ کے بھانجے، عبداللہ بن زبیرؓ، عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ اور بہت سے صحابہ کرامؓ موجود ہیں۔ جنہوں نے رسول اللہؐ کا فیضِ صحبت حاصل کیا ہے۔ یا غزوات میں حصّہ لیا ہے خلافتِ راشدہ کے دور میں بڑے بڑے اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص خلافت کی اہلیت رکھتا ہے جسے بھی آپ نامزد کریں گے اُمت بے چون و چرا اسے اپنا خلیفہ مان لے گی۔ اس کے احکام کی اطاعت کرے گی۔ اس کے ہر اشارے پر سرِ تسلیم خم کر دے گی۔ لیکن مجھے یہ معلوم

ہونا چاہیئے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔

امیر معاویہ:۔ بہت مشکل ہے میرا چاہا پورا ہونا۔

شیخ احمد:۔ نہایت ادب کے ساتھ میں اختلاف کرانے کی جرات کرتا ہوں۔ یقین کیجئے۔ وہی ہو گا جو آپ چاہیں گے ۔۔۔ کیا اب تک وہی نہیں ہوا جو آپ نے چاہا؟

امیر معاویہ:۔ فرض کرو ہم یہ چاہتے ہیں کہ یزید ہمارا جانشین ہو۔ کیا امت ہمارے اس فیصلے کو تسلیم کرے گی؟

شیخ احمد:۔ کیوں نہ کرے گی! کرنا پڑے گا۔

امیر معاویہ:۔ تمہاری بات باور کرنے میں ہمیں تامل ہے۔

شیخ احمد:۔ امیر المومنین اس تامل کی وجہ بھی تو معلوم ہونی چاہیے۔

امیر معاویہ:۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ یزید کے اطوار کیا ہیں ہیں اس کا باپ ہوں۔ وہ میری پرواہ نہیں کرتا۔ رنگ رلیوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ سیر و شکار میں وقت ضائع کرتا ہے۔ اس نے شکاری کتے پال رکھے ہیں۔ اب بندروں کا شوق ہوا ہے۔ بڑے چاؤ سے اس نے ایک بندر پالا ہے۔ اس کے لباس، رکھ رکھاؤ، ٹیپ ٹاپ اور خورد و نوش پر بے دریغ روپیہ صرف ہو رہا ہے[1]: اور مجھے تو یہاں تک اطلاع ملی ہے کہ اب وہ بادہ و ساغر سے بھی اپنا دامن الجھا چکا ہے کیا لوگ اس کے نام سے بھڑک نہ اٹھیں گے؟

شیخ احمد:۔ امیر المومنین نے شہزادہ یزید کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ واقعی ان میں یہ کمزوریاں اور کوتاہیاں موجود ہیں اور اس لئے ہیں کہ انہیں ضرورت سے زیادہ مہر پدر کی نعمت حاصل رہی ہے۔ بہرحال امیر المومنین کی گفتگو سے میں نے اندازہ کر لیا کہ آپ اپنا جانشین یزید کو بنانا چاہتے ہیں۔

---

[1] یہ واقعہ عربی کی تمام متداول کتابوں میں بسط و تفصیل کے ساتھ درج ہے۔

امیر معاویہ:۔ ہاں! تم غلط نہیں سمجھے لیکن انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ شاید ہم اپنی اس آرزو میں ناکام رہیں گے۔

شیخ احمد:۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں امیر المومنین! کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک بات چاہیں اور وہ نہ ہو۔ آپ کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔

امیر معاویہ:۔ شاید ہمیں خوش کرنے کے لئے یہ باتیں کر رہے ہو۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی لیکن تم نے ہمیں فکر و پریشانی سے نجات دلادی۔

شیخ احمد:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے امیر المومنین کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ لوگ شہزادہ یزید کی بیعت کرنے میں تامل کریں گے۔

امیر معاویہ:۔ ہاں یہی بات ہے ــــ جب تک حسینؓ ابن علیؓ، عبداللہؓ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن زبیرؓ اور صحابہ کا ایک گروہ موجود ہے۔ اس وقت تک یزید کو کون پوچھے گا!

شیخ احمد:۔ جو لوگ ہمارے راستے میں پتھر بن کر حائل ہو سکتے ہیں انہیں راستے سے ہٹایا بھی جا سکتا ہے۔

امیر معاویہ:۔ کیونکر! جو بات تم نے اتنی آسانی سے کہہ دی۔ ذرا سوچو تو سہی عملی طور پر وہ کتنی دور از کار ہے!۔

شیخ احمد:۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان لوگوں کو قتل کر دیا جائے اور طریقے بھی ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے۔ آخر حسنؓ ابن علیؓ کو ہم نے کس طرح اپنے راستے سے ہٹایا[1]۔ کیا زہر ہلاہل کوئی معمولی چیز ہے۔

امیر معاویہ:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) لیکن ان لوگوں کے علاوہ بھی متعدد اشخاص اور مختلف گروہ ایسے ہیں جو مخالفت کی آواز بلند کریں گے۔

شیخ احمد:۔ یقیناً ایسا ہو گا۔ لیکن مخالفت کی ہر آواز دبا دی جائے گی۔ کسی مخالفت کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ افراد پر ملت قربان نہیں کی

---

[1] ابوالفدا۔

جا سکتی۔ ملت پر افراد قربان کئے جا سکتے ہیں۔

غور فرمائیے۔ آپ کے بعد کیا ہو گا۔ مختلف اشخاص امیدوار خلافت بن کر میدان میں آئیں گے، مختلف قبائل ان کے حامی اور پشت پناہ بن کر تلواریں میان سے نکالیں گے۔

—— امن وامان کی نعمت چھن جائے گی قتل وغارت کا دور شروع ہو جائے گا۔ ایک بات اور بھی عرض کر دوں۔ حدیث نبوی میں ارشاد ہوا ہے کہ امیر کی اطاعت کرو خواہ وہ کانا اور بدصورت حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن مجید میں اولی الامر کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر آپ نے اپنی زندگی میں ولیعہدی کا فیصلہ کر لیا تو وہ اٹل ہو گا۔ سب کو ماننا پڑے گا۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بدل سکے گی جو شخص مخالفت میں آواز بلند کرے گا وہ غدار اور باغی تصور کیا جائے گا اور اسے وہی سزا ملے گی جو ایک غدار اور باغی کو ملنی چاہیئے۔

امیر معاویہ:۔ (مسکرا کر) جزاک اللہ —— اس بحث میں مسئلے کے متعدد پہلو صاف ہو گئے۔ لیکن ایک کھٹک دل میں اب بھی موجود ہے۔

شیخ احمد:۔ وہ خلش کس قسم کی ہے امیر المومنین؟

امیر معاویہ:۔ سوال یہ ہے کہ خود یزید بھی خلافت کے بوجھ کو اٹھا سکے گا۔ اس کے لاابالی پن نے ہمیں بہت مایوس کر دیا ہے۔

شیخ احمد:۔ نہیں امیر المومنین! مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ شاہزادہ یزید کے اندر خامیاں اور کوتاہیاں ہیں صرف اس لئے ہیں کہ ابھی وہ نوعمر ہیں۔ نوجوان ہیں۔ اس عمر میں لوگ بہک جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ مسندِ خلافت پر رونق افروز ہوں گے تو بالکل بدل چکے ہوں گے۔

امیر معاویہ:۔ (گردن ہلا کر) ہاں یہ ہو سکتا ہے۔

شیخ احمد:۔ جیسے ہی وہ شکار سے واپس آئے، میں ان سے عرض کروں گا۔ اپنے

اطوار و انداز میں تبدیلی پیدا کریں۔ اپنے آپ میں اس منصب بلند کی صلاحیت اور استعداد پیدا کریں۔ رنگ رلیاں کم کر دیں۔ امورِ سلطنت اور مہاتِ مملکت میں حصہ لیں۔

امیر معاویہ:۔ ہم تمہارے بہت شکر گزار ہوں گے اگر یزید کو تم اس طرف متوجہ کر سکو۔ یہ اس کی زندگی اور مستقبل کا سوال ہے۔

شیخ احمد:۔ میں جانتا ہوں امیر المومنین! اور مجھے امید ہے وہ اس جاں نثار کی بات رد نہیں کریں گے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہو گئیں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ لوگ صرف وہ چیزیں جو انہیں نظر آتی ہیں۔ لیکن جو باتیں نظر سے اوجھل رہتی ہیں اول تو وہ کسی کے علم میں نہیں آتیں اور اگر آتیں بھی ہیں تو جہاں دس آدمی چہ میگوئیاں کرتے ہیں وہاں پچاس تردید کرنے کو بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

امیر معاویہ:۔ ذرا وضاحت کے ساتھ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم اچھی طرح تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکے۔

شیخ احمد:۔ میں شہزادہ یزید سے عرض کروں گا کہ وہ اپنی بداعتدالیوں کا ارتکاب علانیہ نہ کریں۔ اندرونِ خانہ جو چاہیں سو کریں۔ میرا مدعا یہ ہے کہ وہ شوق سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ چنگ و رباب، دف اور بربط اور جام و ساغر کی آوازیں محل کی چار دیواری سے اونچی نہ ہوں۔ وہ شکاری کتوں سے شغل رکھیں۔ بندر پالیں دوسرے شوق بھی پورے کر لیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ان مشاغل سے عوام بھی واقف ہوں۔ کم از کم اتنا قابو تو انسان کو اپنے اوپر رہے۔ مجھے امید ہے میرے سمجھانے سے سمجھ جائیں گے اور آئندہ امیر المومنین کو ان سے شکایت کا موقعہ پیدا نہیں ہو گا۔

امیر معاویہ:۔ ہم چاہتے ہیں کہ یزید وہ تمام باتیں ترک کر دے جنہوں نے اس کے

دامن کو داغدار کر دیا ہے۔

شیخ احمد:۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا لیکن اپنے وقت پر اس کام میں افہام و تفہیم سے جتنا فائدہ ہو سکتا ہے زجر و توبیخ اور تہدید و تخویف سے نہیں۔

امیر معاویہ:۔ خدا کرے تمہاری امیدیں پوری ہوں ۔وہ بڑا مبارک دن ہوگا جب تم ہمیں یہ خوش خبری سناؤ گے کہ یزید اب بالکل بدل چکا ہے۔

شیخ احمد:۔ لیکن اس مبارک دن کے انتظار میں ہمیں اپنی سرگرمیاں معطل نہیں کرنی چاہئیں۔

امیر معاویہ:۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا یہ کوششیں جاری رہیں گی۔ اور ہم خود تکلیف اٹھا کر وہ تمام امور انجام دیں گے جو ضروری ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ جب تک ان دونوں کا تعاون حاصل نہ ہوگا۔ گوہر مقصود ہاتھ نہیں آسکتا۔

شیخ احمد:۔ بجا ارشاد ہوا لیکن عمرو بن العاص تو مصر میں ہیں۔ ان سے مشورہ حاصل کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

امیر معاویہ: وہ بلائے جا سکتے ہیں۔ آجائیں گے۔

شیخ احمد:۔ درست، لیکن ایسا نہ ہو کہ اس صلاح مشورہ میں کافی وقت صرف ہو جائے اور تاخیر معاملہ کو بگاڑ دے۔

امیر معاویہ:۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی، جو کچھ ہوگا غور و فکر کے بعد کیا جائے گا ـــ ضرورت ہوئی تو مدینہ بھی جانا پڑے گا۔

شیخ احمد:۔ وہاں جانے کی کوئی ایسی خاص ضرورت تو محسوس نہیں بلکہ اندیشہ ہے کہ بنا ہوا کام بگڑ نہ جائے۔

امیر معاویہ:۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے ـــ وہ خلافت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی جس کی اطاعت مدینے والے نہ کریں۔ مسلمانوں کا پایہ تخت دمشق ہے لیکن مدینے کی سلطانی اور بالادستی اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اگر اہل مدینے

بیعت سے انکار کیا تو سارے عالم اسلام میں اختلاف و انتشار پیدا ہو جائے گا۔ خلافت اور حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی قتل و غارت اور کشت و خون کا نہ ختم ہونے والا دور شروع ہو جائے گا ہمیں وہاں جانا پڑے گا۔ یزید کی ولیعہدی پر سب سے پہلے وہاں کے لوگوں سے بیعت لینی ہو گی۔

شیخ احمد:۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لوگ بیعت کر لیں گے۔

امیر معاویہ:۔ تمہارا کیا خیال ہے۔

شیخ احمد:۔ جس شہر میں حسینؓ ابن علیؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ جیسے لوگ موجود ہوں وہاں آسانی سے یہ بیل منڈھے چڑھتے نظر نہیں آتی مجھے اندیشہ ہے قتل و غارت اور کشت و خون کا آغاز وہیں سے نہ ہو۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ کام دمشق سے شروع ہوتا۔ عراق اور مصر کی تائید حاصل کی جاتی۔ نجد و یمن کو ہمنوا بنایا جاتا۔ پھر مکہ اور مدینہ کے لوگوں سے بیعت کو کہا جاتا۔

امیر معاویہ:۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ بیعت کا آغاز مدینہ سے ہو گا۔ اس کے بعد دمشق اور دوسرے مقامات کی باری آئے گی۔

باب ۳

کھچڑی پکنے لگی

امیر معاویہؓ اور شیخ احمد کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی اس نے ایک واضح پروگرام معین کردیا۔ یہ بات طے ہوگئی کہ ولی عہد یزید ہوگا۔ لیکن کب تک ؟ یہ مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔
امیر معاویہؓ بڑے مدبّر، دوراندیش معاملہ فہم، متحمل، بردبار اور صاحب فراست انسان تھے انھیں غصّہ پی جانے میں کمال حاصل تھا۔ وہ مخالفوں کی باتیں بھی خاموشی اور حوصلہ سے سنتے تھے۔ وہ اپنے تیور سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ کسی سے انتقام لیتے ہیں۔ وہ بڑی خاموشی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ایک رائے قائم کرتے تھے۔ اور پھر اس پر چٹان کی طرح جم جاتے تھے۔ انھوں نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد بھی انہیں معاف نہیں کیا۔ مساجد کے ممبروں پر ان کے حکم سے علی الاعلان جمعہ کے خطبہ میں حضرت علیؓ پر سب وشتم کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔[1] کچھ لوگ یہ تبرا خاموشی کے ساتھ سُن لیتے تھے۔ کچھ چیں بجبیں ہوتے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی زندگی اور مستقبل سے بے پرواہ ہوکر اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے تھے۔ یعنی وہ جواب میں امیر معاویہ کو برسر عام برا بھلا کہتے تھے۔ انہیں لوگوں میں ایک حجر بن عدی بھی تھے۔ یہ بڑے پایہ کے صحابی تھے۔ ان کا ادب واحترام سب ہی کرتے تھے۔ لیکن امیر معاویہ نے انہیں دمشق طلب کیا اور وہاں انہیں اور ان کے چند ساتھیوں کو بے دردی سے قتل کردیا۔[2] اس حادثہ نے ساری دنیائے اسلام میں ایک تہلکہ مچادیا۔ حجر بن عدی جیسے بلند مرتبت

---

[1] تاریخ اسلام ۔ یعقوبی ۱ ص ۲۷۳ ، الغدا ج ۱ ص ۱۸۶
[2] تاریخ اسلام ۔ اخبار الطوال ص ۲۳۶ ،

صحابیِ رسولؐ کا اتنا بے دردانہ قتل ایسا نہ تھا کہ لوگ خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیتے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھی بے گناہ حجر بن عدی کے مظلومانہ قتل کا بے حد صدمہ ہوا چنانچہ امیر معاویہؓ سے انہوں نے باز پرس کی اور پوچھا۔

"معاویہ! تمہیں حجر اور ان کے ساتھیوں کے قتل پر خدا کا خوف نہیں آیا؟"

امیر معاویہ نے نہایت بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔

حجر کو ان لوگوں نے قتل کیا جنہوں نے ان کے خلاف شہادت دی تھی[۱]۔

حالانکہ یہ شہادت ان لوگوں نے خود نہیں دی تھی۔ انہیں شہادت کے کٹہرے میں لایا گیا تھا۔ اور ان کے لائے جانے کی کیفیت یہ تھی کہ ؎

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں!

اس واقعہ کے بعد امیر معاویہ کی یہ رائے اور زیادہ پختہ ہو گئی کہ جلد از جلد ولیعہد کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔"

اب انہوں نے وقت کے بہت بڑے صاحب فراست سیاستدان مغیرہ بن شعبہ کو دمشق بلوایا۔ وہ کوفہ کے گورنر تھے۔ اور امیر معاویہ کے حسب مرضی وہاں کا انتظام والنصرام کر رہے تھے۔ مغیرہ کی رائے کو وہ بہت زیادہ وقیع سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا مغیرہ کی رائے بیٹ نہیں پڑ سکتی۔ وہ جو کچھ کہیں گے قابل قبول بھی ہوگا اور قابل عمل بھی۔

مغیرہ بن شعبہ سے بھی انہوں نے وہی باتیں کہیں جو شیخ احمد سے کی تھیں انہوں نے امیر معاویہؓ کا منشا سمجھ لیا اور صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دی۔ انہوں نے کہا۔

عثمانؓ کی شہادت کے بعد سے مسلمانوں میں جو اختلاف اور خونریزی قائم ہے وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس لئے میری رائے میں یزید کی ولیعہدی کی بیعت لے کر اسے اپنا جانشین مقرر کر دیجئے۔

---

[۱] تاریخ اسلام استیعاب ج صـ۱۳۸

تاکہ جب وقت آئے اور آپ اس دنیا سے رخصت ہوں، تو مسلمانوں کے لئے ایک سہارا اور جانشین موجود رہے اور ان میں خونریزی اور فتنہ و فساد برپا نہ ہو۔[1]

مغیرہ بن شعبہ نے جو بات کی وہ امیر معاویہ کے دل میں تھی۔ وہ اس سے بہت خوش ہوئے۔ لیکن مشکلات راہ نے ان کا حوصلہ پست کر رکھا تھا انہوں نے مغیرہ بن شعبہ سے دریافت کیا — آپ کی رائے یقیناً صائب ہے اور دور اندیشی پر مبنی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مہم کو سر کون کرے گا؟ سب سے اہم اور بڑا سوال تو یہی ہے۔

مغیرہ بن شعبہ :۔ کوئی شبہ نہیں معاملہ اہم ہے لیکن اگر طے کر لیا جائے کرنا ہے تو بڑی آسانی سے یہ مہم سر ہو سکتی ہے۔

امیر معاویہ :۔ اسی لئے تو میں پوچھتا ہوں کس طرح یہ مہم اتنی آسانی سے سر ہو جائے گی!

مغیرہ بن شعبہ :۔ کوفہ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں اور بصرہ کو زیاد ہموار کرے گا اور حجاز کی ذمہ داری وہاں کے گورنر مروان بن حکم کو سونپ دیجئے۔[2] مجھے یقین ہے بغیر کسی دشواری کے کام بن جائے گا۔" یہ بات امیر معاویہؓ کے دل میں اتر گئی۔

انھوں نے محسوس کیا مغیرہ بن شعبہ کی رائے میں وزن ہے معقولیت ہے اور واقعی یہ تدبیر اس طرح عملی جامہ پہن سکتی ہے۔ کوفہ شورش پسندوں کا مرکز تھا۔ اس پر مغیرہ نے قابو پا لیا تھا۔ بصرہ فتنہ پردازوں کا سب سے بڑا ملجا و ماویٰ تھا۔ وہاں زیاد کا طوطی بول رہا تھا۔

اور یہ زیاد کون تھا۔

یہ زیاد حضرت علیؓ کے جان نثاروں اور فدا کاروں میں تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے یہ ان کی رکاب سے لپٹا رہا۔ جب انہوں نے جام شہادت

---

[1] تاریخ اسلام — طبری [2] تاریخ اسلام — ابن اثیر

نوش کیا تو یہ امام حسنؓ کے وفادار ساتھیوں میں تھا۔ یہ امیر معاویہ سے سخت اختلاف رکھتا تھا۔ یہ ابو سفیان یعنی امیر معاویہ کے والد کا ناجائز بیٹا تھا وہ لے انکا بیٹا نہیں تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ زیاد ابن ابیہ یعنی" زیاد اپنے باپ کا بیٹا" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ تلوار کا دھنی، میدانِ جنگ کا سورما، نڈر، اور دلیر شخص تھا۔

امیر معاویہ نے سوچا کہ اگر ہمارے ساتھ ہو جائے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اسے باقاعدہ اپنے والد ابو سفیان کا بیٹا یعنی اپنا سوتیلا بھائی تسلیم کر لیا جو از روئے شرع نہایت قبیح فعل تھا۔[ل] دوسرا کام یہ کیا۔ کہ فارس کی آمدنی اور خرچ کا جو حساب کتاب اس نے پیش کیا بغیر کسی اعتراض اور ردو قدح کے تسلیم کر لیا۔ اس طرح انہوں نے زیاد کو حاصل کر لیا۔ اسے اپنا رفیق بنا لیا۔ اور اپنے معاملات اور منصوبوں میں اس کی تائید اور پشت پناہی حاصل کر لی اور اسے بصرہ کا والی (گورنر) مقرر کر دیا۔ اب رہ گیا حجاز کا معاملہ۔ حجاز اب بھی مسلمانوں کا سب سے بڑا روحانی مرکز تھا، وہاں کی رائے کو، وہاں کے لوگوں کو، وہاں کے اربابِ فکر و عمل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ امیر معاویہؓ نے سوچا وہاں کی ذمہ داری یقیناً مروان، خوش اسلوبی کے سا انجام دے گا۔ اور اگر وہ نپٹ نہ سکا تو میں خود وہاں جاؤں گا اور اس وقت تک واپس نہیں آؤں گا جب تک یزید کی ولی عہدی کی بیعت لوگوں سے نہ لے لوں۔ خطرہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کوفہ اور بصرہ سے ہے۔ مدینہ اور مکّہ سے نہیں۔ کوفہ اور بصرہ کے لوگ شوریدہ پشت ہیں۔ بدخو ہیں، جھگڑالو ہیں، فتنہ و فساد سے رغبت رکھتے ہیں۔ مدینہ اور مکہ کے لوگ امن پسند ہیں ان سے کسی طرح کا اندیشہ نہیں۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد امیر معاویہ نے اپنے معزز مہمان سے کہا۔ "ہمیں آپ کی رائے سے کامل اتفاق ہے۔ آپ کوفہ تشریف لے جائیے

ل ڈاکٹر حسین نے اپنی کتاب "مراۃ الاسلام" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اور جو کچھ کہا ہے اسے کر دکھائیے۔ زیاد سے بھی کہہ دیجئے۔ وہ اپنا فریضہ انجام دے۔

مغیرہ بن شعبہ:۔ آپ مطمئن رہیں ہیں کل ہی واپس جاتا ہوں اور ایسی صورت پیدا کر دوں گا کہ وہاں کے لوگ ایک وفد کی صورت میں آپ کے پاس آئیں اور آپ سے استدعا کریں کہ آپ یزید کو اپنا ولی عہد بنا لیں۔

امیر معاویہ (خوش ہو کر) اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو میرے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اور پھر بڑے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ میں حجاز کا سفر کر سکوں گا۔

مغیرہ بن شعبہ: انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔

امیر معاویہ: ۔ بصرہ سے بھی مطمئن رہنا چاہیئے۔

مغیرہ بن شعبہ:۔ ضرور، زیاد کو آپ کیا سمجھتے ہیں، وہ مجھ سے بھی زیادہ کامیاب ہے وہ جس بات کا فیصلہ کر لے وہ ہو کر رہتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی دہشت وہاں کے لوگوں پر ایسی قائم ہو گئی ہے کہ اس کے سامنے کوئی چوں نہیں کر سکتا۔

امیر معاویہ:۔ (زیر لب تبسم کے ساتھ) ہمارا انتخاب کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ کوفہ اور بصرہ کی طرف سے ہم پورے طور پر مطمئن ہیں۔"

مغیرہ بن شعبہ:۔ اور حجاز کی طرف سے؟ کیا آپ کو اندیشہ ہے کہ وہاں سے اختلاف کی صدا بلند ہو گی؟

امیر معاویہ:۔ ہاں مجھے اس کا اندیشہ ہے۔ یقیناً ایسا ہو سکتا ہے۔

مغیرہ بن شعبہ:۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ گو آپ نے مروان بن حکم کو وہاں کا گورنر بنا کر بھیج دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر انتخاب کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ لیکن آپ مروان کی قدر و قیمت، صلاحیت اور استعداد، تدبر اور دانش مندی سے پورے طور پر اب تک واقف نہیں ہیں وہ بڑا زیرک اور ہوشیار آدمی ہے۔ اس پر بھروسہ رکھیے۔ مجھے یقین ہے وہ یزید کی ولی عہدی قبول کرنے پر وہاں کے

لوگوں کو راضی کر لے گا۔

امیر معاویہ: مجھے اس کا یقین ہے اور اگر بہ فرضِ محال ایسا نہ ہوا تو میں خود حجاز کا سفر کروں گا۔ میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔ وہاں کے لوگوں سے واقف ہوں۔ ان کے انداز و اطوار کو جانتا ہوں۔ ان کی سیرت اور کردار سے آشنا ہوں۔ ان کی خصلت اور مزاج کا راز دان ہوں بہت اچھی طرح اس گتھی کو حل کر لوں گا۔ جو دشواریاں اس وقت حائل نظر آ رہی ہیں۔ وہ میرے پہنچنے کے بعد ختم ہو جائیں گی۔

مغیرہ بن شعبہ: ضرور ایسا ہی ہوگا۔

مغیرہ بن شعبہ امیر معاویہ سے رخصت ہو کر کوفہ پہنچے۔ اگرچہ کوفہ والوں پر ان کی وہ دہشت نہ تھی جو بصرہ کے لوگوں پر زیاد نے قائم کر رکھی تھی۔ لیکن اپنی تدبیر اور دانش مندی سے انھوں نے وہاں کے لوگوں کو اپنے قبضہ میں کر رکھا تھا۔ چنانچہ کوفہ کا وفد امیر معاویہ کی خدمت میں بصرہ کے وفد سے پہلے پہنچ گیا۔ اس وفد نے بہت اصرار کے ساتھ امیر معاویہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی زندگی میں کسی کو اپنا جانشین مقرر کر جائیں۔ اور وہ جانشین یزید کے سوا اور کوئی نہیں ہونا چاہیے[1]۔ کیونکہ یزید ہی کی شخصیت ایسی ہے جس پر عالم اسلام آسانی سے متفق ہو سکتا ہے۔ امیر معاویہ نے وفد کے معروضات توجہ سے سنے اور عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دیا اس وفد کے بعد زیاد کا بھیجا ہوا وفد بصرہ سے آیا اس نے بھی امیر کی خدمت میں اپنا "مطالبہ" پیش کیا اور خوش خوش رخصت ہو گیا۔

---

[1] تاریخ اسلام ــــ طبری اور ابن اثیر

باب ۴

مدینہ کے گورنر کے نام فرمان

مغیرہ بن شعبہ سے گفتگو کے بعد امیر معاویہ نے طے کر لیا تھا کہ جب ایک کام کرنا ہی ہے تو التوا اور انتظار بے کار ہے اسے جلد از جلد طے کر لینا چاہیے مغیرہ نے کوفہ کی طرف سے اطمینان دلا دیا تھا۔ اور اس اطمینان کی تصدیق اس وفد سے بھی ہو گئی تھی جس نے کوفہ سے آ کر مطالبہ کیا تھا کہ یزید کو ولی عہد بنا دیا جائے بصرہ کی طرف سے بھی کوئی اندیشہ نہیں تھا کیونکہ وہاں زیاد جیسا صاحب تدبر و فراست کار فرما تھا۔ خلش جو کچھ تھی وہ صرف حجاز اور حجاز میں بھی مدینہ سے تھی۔ چنانچہ نہایت ہوشیاری سے مدینہ کی مہم مروان بن الحکم کے سپرد کی گئی۔ امیر معاویہ نے اسے ایک مکتوب لکھا۔

"اب میں ضعیف ہو گیا ہوں۔ میرے قویٰ کمزور ہو گئے ہیں معلوم نہیں کب وقت آ جائے (اور میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں) مجھے خوف ہے میرے بعد پھر امت میں اختلاف نہ پیدا ہو جائے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی کے لئے اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین بنا جاؤں۔ اس معاملہ میں تمہارا مشورہ ضروری ہے۔ اس کو اہل مدینہ کے سامنے پیش کرو۔ اور وہ جو جواب دیں وہ مجھے لکھو"[1]

---

[1] تاریخ اسلام — طبری و ابن اثیر۔

مروان بن الحکم ایک زیرک شخص تھا۔ اس نے اہل مدینہ کے سامنے اس تجویز کو بڑی معصومیت کے ساتھ پیش کیا۔ اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

" اگر بغیر کسی جانشین کے امیر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو خانہ جنگی کا اندیشہ ہے انہیں اس کی اجازت دینی چاہیئے کہ وہ کسی موزوں مناسب اور اہل شخص کو اپنا جانشین نامزد کر دیں لیکن چونکہ کوئی نامزدگی بھی آپ کی صلاح اور مشورہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے لہٰذا۔ آپ سے مشورہ لینے اور استصواب کرنے کی امیر نے مجھے، ہدایت کی ہے۔ اگر آپ اس مشورہ کو منظور کریں گے تو وہ کوئی قدم اٹھائیں گے ورنہ پھر خدا کے حوالہ کر دیں گے اس مسئلہ کو۔!"

اس تقریر میں اتنا عجز تھا۔ اتنی خاکساری تھی۔ اتنا قومی درد تھا کہ لوگوں کے دل نرم ہو گئے۔ پھر اس تجویز میں کہیں اشارۃً بھی یزید کا ذکر نہیں آیا تھا اور کوئی شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ یزید کو یہ منصب سونپا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر اس تجویز کو سب نے منظور کر لیا۔ امیر معاویہ جانتے تھے۔ مدینہ کا معاملہ کوفہ اور بصرہ سے بہت زیادہ اہم ہے۔ وہاں ہنگامہ آرائی ہو سکتی تھی۔ شورش ہو سکتی تھی۔ بدامنی کے مظاہرے ہو سکتے تھے اور انہیں بڑی آسانی سے دبایا جا سکتا تھا۔ لیکن کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو خلافت کا مدعی بن کر میدان میں آنے کی جرأت کر سکتا۔ اس کے برعکس مدینہ کی صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ یہاں متعدد ایسے بزرگ موجود تھے جو یزید کے مقابلے میں ہر حیثیت سے کہیں زیادہ خلافت کے مستحق تھے۔ اور مدعی بن سکتے تھے۔

پہلے مرحلہ پر مروان کامیاب ہوا۔ اس نے خوشی خوشی امیر معاویہ کو اطلاع دی۔

" امیر المؤمنین کی خدمت میں یہ غلام اس اطلاع کا پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس نے اہل مدینہ کے سامنے امیر کی تجویز رکھی اور

انہوں نے بے تامل اسے مان لیا۔ سب کی یہ رائے ہے کہ امیر کو اپنی زندگی ہی میں کسی موزوں اور مناسب شخص کو اپنا جانشین مقرر کر دینا چاہیئے تاکہ پھر کسی فتنہ اور فساد کا احتمال نہ رہے۔"

امیر معاویہ یہ خط پاکر بہت خوش ہوئے۔ فوراً ہی اس خط کا جواب لکھا اور ایک تیز رَو قاصد کے ہاتھ روانہ کر دیا۔ اپنے فرمان میں امیر معاویہ نے لکھا تھا۔

"تمہارا خط پاکر ہمیں مسرت ہوئی۔ ہم اس بات سے بھی بہت مسرور ہوئے کہ اہل مدینہ نے ہماری رائے کو پسند کیا اور وہ ہمیں اس کا حق دیتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں ہم اپنا جانشین کسی کو مقرر کردیں۔ چنانچہ ہم نے کامل غور خوض کے بعد یزید کو اپنا ولی عہد منتخب کیا ہے۔ تم اہل مدینہ کو اس کی اطلاع دے دو۔"

جیسے ہی مروان کو یہ خط ملا اس نے فوراً مدینہ کے باشندوں اور وہاں کے ارباب صلاح و تقوی کو طلب کیا۔ مدینہ کی رائے عامہ پر حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ جن لوگوں کا اثر تھا۔ وہ یہ چار آدمی تھے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ (۲) حضرت عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۴) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

مروان نے اس اجتماع میں جن لوگوں کو مدعو کیا تھا ان میں یہ پانچوں حضرات بھی تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام تو اپنی فراست سے معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکے تھے۔ لہٰذا وہ تشریف نہیں لے گئے۔ البتہ باقی چاروں اصحاب تشریف لے گئے۔ مروان بن الحکم نے ان سب کا بہت پرتپاک استقبال کیا۔ خاطر مدارات اور حسن سلوک سے پیش آیا۔ پھر اس نے سب موقع ایک تقریر کی اور حاضرین کو اس رائے سے باخبر کر دیا۔ کہ امیر نے اپنا جانشین اپنے فرزند ارجمند دولپسند و سعادت مند یزید کو بنایا ہے۔ یہ سنتے ہی حاضرین میں چہ میگویاں شروع ہوگئیں۔ لوگ اس خبر کے سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا امیر کسی ایسے شخص کو منتخب کریں گے جو

زہد و تقویٰ کے اعتبار سے، تدبر اور فراست کے اعتبار سے، ایثار اور فدویت کے کے اعتبار سے، خلوص اور راستی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہوگا جس کے تقدس اور جمال و جلال کے سامنے سب کی گردنیں جھک جاتی ہوں گی۔ وہ کوئی ایسا ہی نام سننے کے لئے خوش خوش آئے تھے۔ لیکن انہوں نے سوچا کچھ تھا، ہوا کچھ۔ ان کے سامنے یزید کا نام پیش کیا گیا جس کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ کوئی شرعی عیب ایسا نہیں ہے جو اس میں موجود نہ ہو۔ اسے قرآن و حدیث اور صوم و صلوٰۃ سے تو کوئی سروکار نہیں البتہ وہ لہو و لعب کا بندہ ہے۔ سیر و شکار کا رسیا ہے۔ عیش و عشرت کا اسیر ہے۔ شراب و کباب کا عادی ہے۔ رقص و نغمہ کا متوالا ہے۔ فضول خرچ ہے بدچلن ہے، عیاش ہے، ایسے شخص کو وہ فخر کائنات، سرور موجودات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنالیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر حضرت حسین علیہ السلام اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ۔ عبدالرحمان بن ابو بکرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اس دنیا سے پردہ کر چکے ہوتے تو بھی یزید کو خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین بنانے کے کوئی معنی نہیں تھے نہ کہ ان کی زندگی ہی میں ایسا اندھیر گوارا کر لیا جائے یہ ناممکن اور قطعی ناممکن ہے۔

بڑی دیر گزر گئی مگر مروان بن الحکم کو اس کے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کہا۔

"میں نے آپ حضرات کے سامنے امیر المومنین کی ایک تجویز پیش کی ہے۔ جو یزید کی ولی عہدی سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ آپ خاموش ہیں۔ کوئی جواب نہیں دیتے۔

عبدالرحمٰن بن ابو بکرؓ:۔ یہ تجویز اس قابل نہیں ہے کہ اس پر غور کر کے وقت ضائع کیا جائے۔

مروان بن الحکم:۔ (چیں بہ جبیں ہو کر) آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ کا کیا مقصد ہے؟

عبدالرحمٰن :- یہ تجویز نامعقول ہے۔ ناقابلِ قبول ہے! مہمل ہے!

مروان :- یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ اس تجویز پر امت کی فلاح و صلاح اور بھلائی منحصر ہے۔

عبدالرحمٰن :- (بگڑ کر) تم غلط کہتے ہو۔ اور اگر امیر معاویہ کا خیال ہے تو وہ بھی غلط کہتے ہیں۔

مروان :- کیونکر ـــــ ؟

عبدالرحمٰن :- تمہارا خیال ہے کہ امیر کے خیال میں اس پر امت کی فلاح و صلاح اور بھلائی منحصر ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اسے خود فریبی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور فریب کاری سے بھی۔ میں نہیں جانتا تمہیں فریب کار سمجھوں یا خود فریب بہر دونوں صورتیں افسوسناک ہیں۔

مروان :- پھر آپ کے خیال میں کیا مقصود ہے اس تجویز سے ؟

عبدالرحمٰن :- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب خلافتِ اسلامیہ کو ہرقل کی بادشاہت میں منتقل کرنے کی تدبیریں سوچی جارہی ہیں کہ ہرقل کے بعد دوسرا ہرقل اس کا جانشین ہو[1] ہم اسے گوارا نہیں کر سکتے۔ کسی طرح بھی نہیں مان سکتے اس تجویز کو۔ یہ تجویز پیش کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہئے تھی۔ کیا ایک مسلمان کے منہ سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔

مروان :- میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اسے ناقابلِ قبول کیوں قرار دے رہے ہیں؟ اس میں ان ہونی اور نئی بات کون سی ہے۔ کیا ابو بکرؓ نے عمرؓ کو اپنا جانشین نہیں بنایا تھا؟ کیا عمرؓ نے کسی کو اس منصب کے لئے نامزد نہیں کیا تھا؟ امیر المؤمنین معاویہ کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہیں۔ وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی طرح اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت میں خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کر رہے ہیں۔

---

[1] تاریخ اسلام ـــ طبری ۔ ابن اثیر ۔

: تم جھوٹے ہو یہ خلفائے راشدین کی سنت نہیں ــــــ قیصروکسریٰ کی سنت ہے[1] وہی اس طرح کی نامزدگیاں کیا کرتے تھے۔ یہ نامزدگی اسلام کی روح اس کی تعلیم اور اس کے فلسفہ کے یکسر خلاف ہے۔ تم ہم سے ایسی بات منوانا چاہتے ہو جو کسی طرح بھی ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں۔ جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

: میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ابوبکرؓ اور عمرؓ نے خود اپنے اپنے جانشین منتخب نہیں کئے تھے؟

: ہاں کئے تھے لیکن اس سوال کا مطلب؟

: مطلب یہ کہ امیر معاویہ کوئی نئی بات تو نہیں کر رہے ہیں؟

: تم چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم ہمیں مغالطہ دے رہے ہو۔ اور یاد رکھو ہم دھوکا نہیں کھا سکتے۔ فریب میں نہیں آ سکتے۔ ہمیں بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ ہمیں پرچانے کی ہر کوشش ناکام رہے گی۔

: تعجب ہے آپ ایک بات مانتے بھی ہیں اور اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ آپ اسے تسلیم کرتے ہیں اور تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنے جانشین نامزد کئے تھے۔ اور وہی کام جب امیرالمؤمنین معاویہؓ کرنے لگتے ہیں تو خفگی اور برہمی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ بڑی عجیب سی بات ہے یہ!

: یہ بات بالکل صاف اور سادہ ہے تم اپنا دعویٰ اور اپنی تجویز پیش کرتے وقت یہ بھول جاتے ہو کہ نہ ابوبکرؓ نے صاحبِ اولاد ہونے کے باوجود اپنے کسی بیٹے کو جانشین بنایا نہ عمرؓ نے۔ عبداللہ بن عمرؓ جیسے بیٹے کا باپ ہونے کے باوجود انہیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ بلکہ ان دونوں بزرگوں نے تو یہاں تک احتیاط ملحوظ رکھی کہ اپنے خاندان

---

[1] تاریخ اسلام ــ طبری اور ابن اثیر۔

کے کسی فرد کو یہ منصب نہیں سونپا[1]۔ کیا امیر معاویہؓ بھی یہی کر رہے ہیں کیا یزید ان کا بیٹا نہیں ہے؛ ہم نے یہ سمجھ کر پہلی تجویز مانی تھی۔ کہ وہ کسی اہل مستحق اور عابد و زاہد شخص کو اپنا جانشین منتخب کریں گے ہمیں اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ان کی نگاہِ انتخاب وقت کے بزرگ ترین اور مقدس ترین افراد کو نااہل سمجھ کر بدکردار بیٹے پر جا کر ٹھہرے گی۔ ہم اسے منظور نہیں کر سکتے۔

مروان اس تقریر کا کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس نے کہا۔

میری حیثیت تو نامہ بر کی ہے۔ مَیں آپ کے خیالات امیر المومنین تک پہنچا دوں گا۔ پھر وہ جانیں اور آپ ؟

---

[1] تاریخ اسلام — طبری، ابن اثیر

باب ۵

امام حسینؑ کا نظریہ

مروان بن الحکم کے مکتوب نے ان اندیشوں کو درست اور حق بجانب ثابت کر دیا جو مدینہ کے بارے میں ایک عرصہ سے امیر معاویہ کے دل میں پرورش پا رہے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ یہ کام مروان سے نہیں بن سکتا۔ مجھی کو مکہ اور مدینہ جانا پڑے گا۔ جب تک خود نہ جاؤں گا معاملہ یونہی معلق رہے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے حالات زیادہ نازک اور سنگین صورت اختیار کر لیں۔ چنانچہ دوسرے ہی روز پورے خدم و حشم کے ساتھ حجاز روانہ ہو گئے۔

جس رات امیر معاویہ مدینہ پہنچے ہیں اسی کی صبح کو امام حسین علیہ اسلام مدینہ سے مکہ روانہ ہو گئے۔ انہیں امیر معاویہ کی آمد کا کوئی علم نہ تھا ــــ وہ سامانِ سفر باندھ چکے تھے۔ کہ وفد حاضر خدمت ہوا یہ انہی لوگوں پر مشتمل تھا جنہوں نے گذشتہ رات مسجد نبوی میں بیٹھ کر ملک کی موجودہ صورتِ حال پر غور کیا تھا۔ بے دینی کے بڑھتے ہوئے اثرات پر فکر و تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اور فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک زندہ ہیں ایسے حالات رونما نہیں ہونے دیں گے۔ کہ دین پس پشت ڈال دیا جائے اور دنیا سر بلند کر دی جائے اس وفد کے لوگوں میں ایک شخص "مقاتل" بڑا پرجوش اور سراپا جذبہ و احساس انسان تھا۔ وہی دراصل وفد کی رہنمائی کر رہا تھا۔ امام حسین علیہ اسلام نے ان لوگوں کی اخلاق و تپاک کے ساتھ پذیرائی کی۔ مقاتل نے سامانِ سفر بندھا دیکھ کر کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کہیں باہر تشریف لے جا رہے ہیں؟"

امام حسینؑ :- "ہاں، مکہ مکرمہ جا رہا ہوں۔ کوئی خاص بات ہے جو تمہیں یہاں لائی ہے؟

مقاتل :۔ بے شک۔ ایک اہم مسئلہ پر اپنے معروضات پیش کرنے کے لئے ہم آپ کی خدمت میں حاظر ہوئے تھے۔ لیکن آپ تو جا رہے ہیں۔

امام حسین ع :۔ لیکن میرے پاس اتنا وقت ہے کہ آپ حضرات کا مقصد معلوم کروں فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں۔

مقاتل :۔ ہماری حاضری کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ دورِ حکومت میں ان لوگوں کی زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ جو ایمان پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ قرآن کے احکام پسِ پشت ڈال دیئے گئے ہیں۔ سنتِ رسول ص کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کا اسوۂ حسنہ یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم عہدِ رسول اللہ سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ جیسے آنحضرت ص کو اس دنیا سے پردہ فرمائے صدیاں بیت گئی ہیں۔ حالانکہ ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے آنحضرت کی زیارت کی تھی جنہیں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ صحابی رسول ص کہلاتے ہیں ـــــ جو جانتے ہیں کہ رسول اللہ کی حیات طیبہ کی نہج کیا تھی ؛ اسلوب کیا تھا ؟ اگر ہم خاموشی کے ساتھ یہ مناظر دیکھتے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے اسلام ختم ہو جائے گا۔

امام حسین ع : نہیں میرے بھائی تم نے غلط سمجھا۔ حالات پریشان کن ضرور ہیں۔ لیکن اسلام کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام خدا کا بھیجا ہوا آخری مذہب ہے یہ اس لئے نہیں کہ مٹ جائے اس لئے ہے کہ ساری دنیا کو اپنی پہنائی میں لے لے۔ جو اسلام کو مٹانا چاہے گا خود مٹ جائے گا۔ اسلام کی فکر ہم سے اور تم سے زیادہ خدا کو ہے۔

مقاتل :۔ بجا ارشاد ہوا لیکن کیا ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض نہیں کہ اگر اسلام کی بے حرمتی دیکھیں تو اس پر نثار ہو جائیں ؟

امام حسین ع :۔ بے شک ہے اور اگر خدانخواستہ ایسا وقت آیا تو جو شخص اس وقت تم سے باتیں کر رہا ہے شاید وہ پہلا شخص ہو گا جو اسلام کے راستے اپنی گردن

کٹانے کے لئے آگے بڑھے گا۔ تم ضرورت سے زیادہ پُرجوش معلوم ہوتے ہو اپنے جوش کو قابو میں رکھو۔ یقیناً تم مخلص مسلمان ہو۔ میں تمہارے اخلاص کی قدر اور عزت کرتا ہوں لیکن میرے عزیز! یاد رکھو کہ جوش کا استعمال نہ مقصد کو فائدہ پہنچاتا ہے نہ نصب العین کو۔

مقاتل:۔ امام ہمام کی رائے سے میں اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن بات جو میرے دل میں کھٹک رہی ہے ضرور عرض کروں گا۔

امام حسینؑ:۔ کہو، کہو، شوق سے کہو۔

مقاتل:۔ کیا امیر معاویہ کا طرزِ عمل اسلام کی روح، مقصد اور فلسفہ کے منافی نہیں ہے؟

امام حسینؑ:۔ یعنی؟ ــــ تم اپنا مقصد بتاؤ۔

مقاتل:۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کیا مسجد میں مقصورہ بنانا جائز ہے؟ کیا خلفائے راشدین نے ایسا کیا؟ کیا رسول اللہ کی سنت میں اس کی مثال ملتی ہے؟ کیا بیت المال کا روپیہ ازروئے اسلام امیر یا خلیفہ یا اس کی اولاد پر اس طرح بے دریغ صرف ہو سکتا ہے جس طرح امیر معاویہ اپنے اوپر اور اپنی اولاد پر خرچ کر رہے ہیں؟ کیا خدا کے ایک بہت برگزیدہ بندے، ایک بہت بڑے انسان اور رسول اللہ کے برادرِ عزیز علی مرتضیٰ کے لئے مسجد کے ممبروں سب وشتم جائز ہے؟ کیا ان باتوں سے ہمارا خون نہیں کھولتا؟ ہمیں غصہ نہیں آتا؟ ہم میں کٹ مرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا؟ کیا حجر بن عدی جیسے صحابی رسول کا قتل بھلایا جا سکتا ہے؟

امام حسینؑ:۔ تمہاری باتیں درست ہیں۔ آگے چلو، اور کیا کہنا چاہتے ہو؟

مقاتل:۔ پھر ہمیں اجازت مرحمت ہو کہ ہم اس کے رد و استیصال کے لئے جو کچھ مناسب سمجھیں کریں۔

امام حسینؑ:۔ نہیں تمہیں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

مقاتل:۔ یا امام کیوں؟ ہم حکومت نہیں چاہتے، مال و زر نہیں چاہتے اقتدار اختیار کی طلب نہیں رکھتے۔ ہم تو اسلام کو زندہ رکھنے کے لئے خود فنا ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس کی اجازت کیوں نہیں مل سکتی۔

امام حسینؑ:۔ اس لئے کہ حالات گو حد درجہ تکلیف دہ، دل خراش اور اشتعال انگیز ہیں پھر بھی تمہیں یا کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ امت میں افتراق و انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اُمت کی مرکزیت اور مرجعیت ان اختلافات پر بھاری ہے۔

مقاتل:۔ یعنی ہم یہ سب کچھ دیکھتے رہیں اور خاموش رہیں؟

امام حسینؑ:۔ ہاں میرا مدعا یہی ہے ۔۔۔ میں دیکھتا ہوں میری یہ بات سن کر تم خوش نہیں ہوئے بلکہ کچھ روٹھے ہوئے نظر آتے ہو؟

مقاتل:۔ بے شک مجھے ان باتوں سے صدمہ پہنچا۔ میں کسی طرح اپنے آپ کو ان حالات سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا۔

امام حسینؑ:۔ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔

مقاتل:۔ میرا اسلام ہی مجھے اکساتا ہے کہ میدان میں کود پڑوں۔

امام حسینؑ:۔ نہیں ۔۔۔ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو، میرے عزیز۔

مقاتل:۔ وہ کس طرح یا امام۔

امام حسینؑ:۔ تم نے امیر معاویہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ ہمیں بھی ذاتی اور اصولی طور پر ان سے کئی شکایتیں ہیں لیکن تم دیکھتے نہیں۔ ہم خاموش ہیں۔

مقاتل:۔ دیکھ رہا ہوں یا امام! اور اپنے دل کی بات کیسے چھپاؤں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔

امام حسینؑ:۔ میرے عزیز! امت کے اتحاد کا تقاضا یہ ہے کہ بہت سی ناگوار باتیں گوارا کر لی جائیں۔ کیا تم نے یہ حدیث نبویؐ نہیں سنی کہ اگر کوئی نکٹا حبشی

بھی تمہارا امیر اور حکمران بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔

مقاتل :۔ بے شک سنی ہے یا امام!

امام حسینؑ :۔ اگر سنی ہے تو یہی کردار اس حدیث کا تقاضا ہے۔۔ ہم جانتے ہیں کہ امیر معاویہ نے کئی ایسی باتوں کو رواج دیا ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہیں مسجد میں مقصورہ بنا کر نماز پڑھنا، بیت المال کا روپیہ اپنی ذات پر، اپنی اولاد پر، اپنے مداحوں پر بے دریغ صرف کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں، جن سے تم کو تکلیف پہنچتی ہے اور ہم بھی دکھ کے ساتھ انہیں محسوس کرتے ہیں لیکن اسے بھی اچھی طرح یاد رکھو کہ امیر معاویہ نے اب تک کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کے قبول کرنے سے ہمارے دین میں خلل آتا ہو، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا اثر صرف ان کی ذات پر پڑ سکتا ہے، سو مسلمانوں کے اتحاد کے لئے ہمیں اسے نظر انداز کرنا چاہیئے۔ انہوں نے اب تک کوئی حکم ایسا نہیں دیا ہے جو خلاف شرع ہو۔ وہ اپنی ذات سے جو کچھ بھی کریں لیکن ان کے دور میں ہمارے مذہب پر تو کوئی آنچ نہیں آئی۔ بس یہی بات ہے۔ امت کی اصلاح و فلاح، اتحاد و اتفاق اور مرکزیت اور مرجعیت کے لئے ہمیں ان کی بعض کمزوریاں بھی برداشت کر لینی چاہئیں۔ یہی ہماری اسلامیت کا تقاضا ہے۔

مقاتل :۔ آپ کو معلوم ہو گا۔ مروان بن الحکم نے اہل مدینہ کو مجبور کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ یزید کی ولی عہدی تسلیم کر لیں۔ اور یزید جیسا کچھ ہے کسے نہیں معلوم؟ اور یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ مروان صرف ایک پیامبر ہے ورنہ حقیقتاً امیر معاویہ ہی کی یہ خواہش اور فیصلہ ہے کہ یزید ولی عہد بنا دیا جائے۔ اب میں صاف صاف پوچھتا ہوں کیا ہم یزید کی ولی عہدی تسلیم کر لیں؟

امام حسینؑ :۔ میرا بھی صاف صاف جواب یہ ہے کہ نہیں، خود امیر معاویہ خلفائے راشدین کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن انہیں ہم گوارا کر رہے ہیں۔

رہا یزید تو امیر یا خلیفہ ماننے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسلام کے ساتھ دشمنی کرنے لگ جائیں۔

مقاتل :- میرے عرض کرنے کا یہی مدعا تھا ـــــ اب بتائیے ہم کیا کریں!

امام حسینؑ :- مروان نے انہیں مطلع کر دیا ہوگا کہ اہل مدینہ یزید کو ولی عہد اور خلیفہ ماننے پر آمادہ نہیں ہیں اور چونکہ وہ دانش مند اور معاملہ فہم آدمی ہیں لہذا یقیناً اس فیصلہ سے دستبردار ہو گئے ہوں گے۔ میرے خیال میں ایک وقتی خیال تھا جو ان کے دل میں آگیا۔ خوشامدی مصاحبوں کے کہنے سننے سے انہوں نے اس اظہار کا اعلان بھی کر دیا ورنہ ان کی فراست اور تدبر سے میں امید رکھتا ہوں کہ ضرور وہ اس فیصلہ کو واپس لے لیں گے اس لئے کہ اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ اور سوچو تو ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے شخص کی خلافت پر کس طرح بیعت کی جا سکتی ہے؟ اس معاملہ میں نہ کوئی معقولیت ہے نہ استدلال۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ امام حسنؑ سے ان کا جو معاہدۂ صلح طے پایا تھا اس کی رو سے ان کے بعد خلافت کا مسئلہ ملت کے ارباب حل و عقد طے کریں گے نہ کہ امیر معاویہ یا ان کا کوئی نامزد شخص[1] وہ اتنی بڑی عہد شکنی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تم مطمئن ہو جاؤ۔

مقاتل :- مجھے اندیشہ ہے کہ اب ہم پر سختیوں کا دور شروع ہونے والا ہے۔

امام حسینؑ :- اس یقین کی بنیاد و اساس کیا ہے؟

مقاتل :- مروان بن الحکم وہ انتہائی سفاک اور بدباطن شخص ہے۔ وہ معمولی مقصد کے لئے سب کچھ کر گزرے گا۔

امام حسینؑ :- لیکن جب وہ دیکھے گا کہ لوگ اس کی بات نہیں مانتے تو اسے خاموش ہونا پڑے گا۔ وہ رائے عامہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

---

[1] تاریخ اسلام کی کتب متداولہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

مقاتل :۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس کا تشدد اور زیادہ بڑھ جائے گا۔

امام حسینؑ :۔ انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا اور بفرض محال ایسا ہوا تو ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیت الخالق اگر خدا کی نافرمانی ہوتی ہو تو ہم ہر اطاعت سے آزاد ہیں۔

مقاتل :۔ (خوش ہوکر) بس میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

امام حسینؑ :۔ لیکن جب تک تمہارا یہ اندیشہ واقعہ کی صورت اختیار نہ کرے صبر و تحمل سے کام لو۔

مقاتل :۔ ایسا ہی ہوگا یا امیر۔ لیکن اگر یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تو پھر ہم ہر امکانی اقدام کرنے میں آزاد ہوں گے "

امام حسینؑ :۔ اگر ایسا وقت آیا تو تم تنہا نہیں ہوگے خدا کے کچھ اور بندے بھی ہوں گے جو تن من کی بازی لگا کر میدان میں اتریں گے اور اسلام کے پرچم کو بلند رکھیں گے۔ اسلام نہ رہا تو ہم رہ کر کیا کریں گے ہم مٹ جائیں اور اسلام زندہ رہے تو ایک بات بھی ہے۔ لیکن ہم زندہ رہیں اور اسلام مٹ جائے کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرمناک بات ہو سکتی ہے۔

من دتو گر فدا شدیم چہ باک

غرض اندر میاں سلامت اوست

امیر معاویہ کو ہم نے اس لئے گوارا کیا کہ خانہ جنگی کا دور ختم ہو جائے لیکن ان سے شرط کر لی تھی کہ ان کے بعد خلافت کا معاملہ ملت اسلامیہ اپنی صوابدید پہ کرے گی۔ اور اس میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ اگر وہ اپنے عہد پر قائم ہیں تو ہم کسی قیمت پر پیمان شکنی نہیں کریں گے۔ لیکن اگر وہ اپنے عہد کا احترام نہیں کرتے اور اسے توڑ دیتے ہیں تو پھر ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ پھر از روئے شرع و اخلاق ہم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ معاہدہ اس وقت تک معاہدہ ہے جب تک فریقین اس پر

قائم ہیں۔ لیکن معاہدہ کرنے والوں میں سے کوئی فریق بھی اگر اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے تو خود بخود معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔ کیا تم میری باتوں سے مطمئن ہو گئے۔

مقاتل نے خوشی اور مسرت کے ساتھ جواب دیا۔

بے شک یا امام اب میں مطمئن ہوں۔ پورے انشراح قلب کے ساتھ مطمئن ہوں۔

باب ۶

دوٹوک بات

امیر معاویہ، اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دمشق سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوتے۔ ان کی آمد سے پیشتر ان کے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی، مروان بن الحکم نے اپنے دربار میں بار بار اس چیز کو مشتہر کیا تھا کہ امیر معاویہ مدینہ تشریف لا رہے ہیں۔ اوران کے آتے ہی ولی عہد کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے گا۔ جو دستِ بیعت بڑھائے گا وہ شادکام اور بامراد ہوگا اور جو رکے گا اور کھینچے گا وہ کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔ نظم مملکت کے معاملات میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی جاسکتی خواہ وہ ؎

ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

میں نے کوشش کی تھی کہ بغیر کسی بدمزگی و بے لطفی کے یہ معاملہ طے ہو جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ اب ٹیڑھی انگلی سے گھی نکال لینے کا وقت آگیا ہے۔

مقاتل سے گفتگو کے بعد امام حسین علیہ السلام مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کے جانے کے بعد عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ ابن زبیرؓ اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکرؓ بھی مکہ چلے گئے ان کے اس سفر کا مقصد کچھ بھی ہو عام طور پر سمجھا یہی گیا کہ یہ لوگ اس لئے مکہ گئے ہیں کہ امیر معاویہ سے آمنے سامنے رد و قدح کی نوبت نہ آئے۔ بہرحال کوئی وجہ بھی ہو امیر معاویہ جب مدینہ منورہ پہنچے تو ان لوگوں میں سے کوئی شخص بھی موجود نہ تھا۔ انہوں نے مروان کو ڈانٹا کہ اس نے ان لوگوں کو مدینہ سے باہر کیوں جانے دیا۔ انہوں نے مروان کو جھڑکتے ہوئے

کہ انہیں بیعت کر لینے پر آمادہ کیا جائے۔

مروان عقیدت مندانہ لہجہ میں کہنے لگا۔

امیر المومنین کی روشن ضمیری شک و شبہ سے بالا ہے جو باتیں وہ سوچ سکتے ہیں وہ ہمارے فہم و تخیل سے ماورا ہیں۔

امیر معاویہ :۔ (مسکرا کر) اچھا بتاؤ ہمارے جانے کے بعد اگر وہ لوگ آئے تو کیا کرو گے؟

مروان :۔ جو ارشاد عالی ہو۔

امیر معاویہ :۔ خود تمہاری فہم رسا کام نہیں کرتی؟ تم گورنر ہو، ایک بہت بڑے اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز ہو۔ ایسے موقعہ پر خود سوچو تمہیں کیا کرنا چاہیے ہر بات میں اگر تم ہماری ہدایت کے طالب رہے تو کام کیسے چلے گا؟

مروان :۔ میں انہیں مدینہ سے باہر نہیں نکلنے دوں گا۔

امیر معاویہ :۔ شاباش بالکل درست فیصلہ کیا تم نے ـــــ لیکن کس طرح روکو گے؟

مروان :۔ میں انہیں حکم دوں گا کہ تا اطلاع ثانی وہ مدینہ کی حدود سے باہر قدم نہ نکالیں۔

امیر معاویہ :۔ اور اگر انہوں نے تمہارے حکم کی تعمیل نہ کی تو؟ گرفتار کر لو گے؟ (مسکرا کر) نہیں ایسا کرو گے تو غلطی کرو گے۔ ان پر لطف و کرم کی بارش کرو۔ ان کی دوستی نہ حاصل کر سکو تو خود ان کے دوست بن جاؤ۔ انہیں پرچاؤ۔ ان کے ساتھ نیازمندی اور فروتنی کا برتاؤ کرو۔ اس طرح انہیں روکو کہ وہ یہ محسوس نہ کر سکیں کہ ان پر کوئی پابندی عائد کی گئی ہے۔

مروان :۔ بہت خوب! انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔

امیر معاویہ :۔ ہمارا سامان سفر تیار کرو ہم مکہ جائیں گے۔

مروان :۔ آج ـــــ کیا امیر آج ہی تشریف لے جائیں گے۔

امیر معاویہ :۔ ہاں! آج، اور نہ صرف آج بلکہ ابھی۔

کہا۔

"تمہیں معلوم تھا اور تم یہ بھی جانتے تھے ہمارے آنے کا مقصد کیا ہے پھر بھی تم نے ان سب لوگوں کو جانے دیا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی غفلت، کوتاہی اور فرض ناشناسی کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔"

مروان نے ندامت سے سر جھکا کر عرض کیا۔

"امیر نے بجا فرمایا۔ لیکن میرے پاس کوئی وجہ نہ تھی کہ میں انہیں عزم سفر سے روکتا۔ بیشک امیر تشریف لارہے ہیں اور مجھے معلوم تھا کہ وہ کیوں تشریف لارہے ہیں لیکن ان میں سے کسی شخص نے بھی مجھے اپنے ارادہ سفر سے مطلع نہیں کیا۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوتی جب یہ لوگ مدینہ سے رخصت ہو چکے تھے۔

امیر معاویہ برہمی کے ساتھ گویا ہوئے۔

"اس کے یہ معنی ہیں کہ مجھے اب مکہ جانا چاہیئے ——— لیکن اگر وہ لوگ میرے پہنچتے پہنچتے پھر یہاں آگئے تو کیا ہوگا؟ اس آنکھ مچولی کا سلسلہ تو وہ جب تک چاہیں جاری رکھ سکتے ہیں۔"

مروان نے دست بستہ عرض کیا۔

"نہیں امیر المومنین ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اگر امیر کے تشریف لے جانے کے بعد وہ لوگ یہاں تشریف لائے تو سب کو گرفتار کر کے دمشق روانہ کر دوں گا۔"

امیر معاویہ نے زہر خند کرتے ہوئے فرمایا۔

کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ گرفتار کیوں کروگے؟ کس کے حکم سے؟ کیوں؟ کس مصلحت اور مقصد کے تحت؟ خدا کے بندے عقل کے ناخن لو اگر گرفتاری پیش نظر ہوتی تو ہم دمشق میں بیٹھ کر یہ حکم صادر نہیں کر سکتے تھے اس موقع پر اگر قید و بند کا سلسلہ شروع کیا گیا تو اس کے نتائج ناخوشگوار ہوں گے اور حتی الامکان ہر قسم کی ناگواری اور تلخی سے ہم بچنا چاہتے ہیں۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ انہیں سزا دی جائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے

عبداللہ ابن زبیرؓ اس تعلق سے متاثر نہ ہوتے کہنے لگے۔

دیارِ رسولؐ سے چمٹا ہوا ہوں اور وہیں رہتا ہوں اور زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ اگر چند روز کے لئے بھی کہیں جانا ہوتا ہے تو طبیعت نہیں لگتی۔ یہی جی چاہتا ہے پرواز کروں اور مدینہ واپس پہنچ جاؤں۔ زندگی بھی وہیں بسر کر رہا ہوں۔ اور چاہتا ہوں موت بھی وہیں آئے۔

یہ کہتے کہتے عبداللہ ابن زبیرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ معاویہ کی آنکھیں بھی نم آلود ہوگئیں۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

سچ کہا تم نے عزیز گرامی۔ ایک مسلمان کی اس سے بڑھ کر خوش بختی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دیارِ رسولؐ میں زندگی کے دن گزارے اور یہیں آسودۂ خاک ہو۔

کتنی مبارک تمنا ہے، کتنی مقدس آرزو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ دعا کیجئے۔ خدا یہ آرزو پوری بھی کر دے۔

امیر معاویہ:۔ جو آرزو خلوص پر مبنی ہو۔ وہ ضروری پوری ہوتی ہے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ میں آمین کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

امیر معاویہ:۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے تم دمشق تو کبھی نہیں آئے؟

عبداللہ ابن زبیرؓ جی نہیں ـــــ وہاں آنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔

امیر معاویہ:۔ تو آتے کیوں نہیں۔ آؤ وہ تمہارا گھر ہے۔ یزید تمہارا ابن عم ہے وہ تمہارا بہت احترام کرتا ہے۔ دیکھنا تمہاری کیسی کیسی خاطر داری کرے گا اور میرے لئے تو جیسا یزید ویسے تم۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ نوازش ہے آپ کی۔

امیر معاویہ:۔ وعدہ کرو۔ آؤ گے۔ بلکہ میرے ساتھ چلو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ آپ کی کرم گستری کا شکر گزار ہوں۔ کوشش کروں گا۔ کہ کسی موقعہ پر تعمیل ارشاد کروں۔ لیکن فی الحال معاف کیجئے۔

امیر معاویہ:۔ ایک بہت اہم مسئلہ پر تم سے مشورہ کرنا تھا۔

مروان نے سامانِ سفر تیار کیا اور تھوڑی دیر کے بعد امیر مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں ان کا قیام بہت مختصر رہا لیکن وہ قیام کرنے کی نیت سے آئے بھی نہ تھے۔ جو۔ مقصد لے کر آئے تھے اس کا مرکز مدینہ سے مکہ منتقل ہو چکا تھا لہذا وہاں جلد از جلد پہنچنا ناگریز ہو گیا۔

مکہ پہنچنے کے بعد امیر معاویہ نے مذکورہ حضرات کو الگ الگ ملاقات کے لئے بلایا۔ چونکہ ان کے آنے کا مقصد ان سب حضرات کو معلوم ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ وہ کسی طرح بھی یزید کو جانشینِ رسولؐ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ امیر معاویہ کی طرف سے جب ملاقات کا بار بار اصرار کیا گیا تو ان سب نے اپنا نمائندہ عبداللہ بن زبیرؓ کو بنا دیا۔ اور ان سے کہہ دیا کہ آپ جانتے ہیں اس معاملہ میں ہمارا موقف کیا ہے۔ تشریف لے جایئے اور امیر سے گفتگو کر لیجئے اور ان پر واضح کر دیجئے۔ کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ یزید کی بیعت نہیں کی جا سکتی اس کے علاوہ اگر وہ کسی مردِ صالح کو پسند کریں جس کا کردار بے داغ ہو جس کی سیرت روشن اور تابناک ہو، جس کا عمل تعلیمات اسلامی کا آئینہ دار ہو تو بلاشبہ بے چون وچرا ہم اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ اگر پھر بھی وہ اصرار کریں تو ان سے کہہ دیجئے ـــ الفراق بینی و بینک، ہمارے اور آپ کے درمیان اشتراک اور تعاون کی کوئی قدرِ مشترک موجود نہیں ہے ـــ آپ جانئے اور آپ کا کام۔ ہم کسی طرح اور کسی قیمت پر بھی گناہ اور معصیت کے معاملہ میں اتحاد اور اشتراک سے قطعاً معذور ہیں۔

عبداللہ ابن زبیر اپنے ساتھیوں کا خیالات کا توشہ لے کر امیر معاویہ کے ہاں پہنچے وہ ان سے بہت زیادہ تپاک اور گرم جوشی سے پیش آئے۔ انہوں نے کہا۔

"تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہو بہو اپنے یگانہ روزگار باپ کی تصویر ہو۔ تمہیں دیکھ کر زبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ یاد آ گئے۔ صحابی رسول۔ مردِ مومن، جانباز، سرفروش بہادر، شجاع کون سی خوبی تھی جو ان میں بدرجۂ اتم موجود نہ تھی۔ یہ بتاؤ آج کل کیا کر رہے ہو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ فرمائیے۔ اگرچہ اس لائق تو نہیں کہ مشیر بن سکوں لیکن جو دیانتدارانہ رائے ہو گی ظاہر کر دوں گا۔

امیر معاویہ :۔ تم جانتے ہو میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ قبر کی منزل قریب ہوتی جاتی ہے۔ کیا معلوم کب موت کا پیغام آجائے اور مجھے لبیک کہنا پڑے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے حضرت علیؓ کا یہ قول کبھی نہیں بھولتا کہ "میری موت میری محافظ ہے۔"

امیر معاویہ :۔ بہر حال امت کے مصالح کو پیش نظر رکھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنا ایک ولی عہد نامزد کروں۔ اپنے سامنے اس کی بیعت لے لوں تاکہ میرے بعد مسلمانوں کی مرکزیت میں اختلال نہ پیدا ہو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ بات تو بظاہر معقول ہے لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آپ کی نگاہِ انتخاب کس پر پڑی ہے۔ اس وقت تک کوئی قطعی رائے میں نہیں دے سکتا۔

امیر معاویہ :۔ یوں تو متعدد اصحاب ہیں جو اس منصب کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن میرے زیر سایہ امور مملکت کی تربیت حاصل کر کے تمہارے ابنِ عم اور میرے بیٹے یزید نے ایک قسم کا استحقاق حاصل کر لیا ہے جو اسے دوسروں پر ترجیح دیتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میری رائے سے اتفاق کرو گے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ نہایت ادب اور افسوس کے ساتھ میں آپ کی اس رائے سے اختلاف کرتا ہوں۔

امیر معاویہ :۔ اختلاف کرتے ہو ! تم اختلاف کرتے ہو ! اچھا ہوا یہ بات تم نے مجھ سے کہہ دی۔ اگر یہ بات تم نے اپنے ابن عم یزید کے سامنے کہی ہوتی تو اسے بہت دکھ ہوتا۔ تم نہیں جانتے اس کے دل میں تمہاری کتنی قدر و منزلت ہے۔ میں اس سے تمہارے اختلاف کا ذکر نہیں کروں گا۔ لیکن میرے عزیز، تم اپنے اختلاف کو اتفاق سے کیوں نہیں بدل دیتے آخر اس

عزیب میں اس کے سوا اور کیا عیب ہے کہ وہ تم لوگوں سے عام طور پر اور تم سے خاص طور پر بہت محبت کرتا ہے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ سوال ذاتی محبت اور دوستی، عزلت اور منزلت، وقت اور محبت کا نہیں، اصول کا ہے۔ آپ اسے اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ اور ہم اسے اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ جس راستے پر وہ چل رہا ہے وہ غلط ہے۔ اس کی زندگی، اس کا کردار، اس کی سیرت اس کی رفتار و گفتار، اس کے انداز و اطوار کسی چیز پر بھی اسلام کی چھاپ نہیں۔ پھر کس طرح ہم اسے رسولؐ کا جانشین، امت کا سردار اور خلیفۃ اللہ فی الارض تسلیم کر لیں۔

امیر معاویہ:۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ عیوب سے مبرّا ہے۔ انسان ہے اور انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ خطا و نسیان تو لازمہ بشریت ہے۔ مشکل تو یہ ہے کہ وہ جس طرز پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسے اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ کل تک جس مسند پر خلفائے راشدین رونق افروز ہوتے تھے آج آپ اس پر یزید کو متمکن کرنا چاہتے ہیں۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند آپ کو پسند آتا ہو تو ہمیں تو نہیں بھاتا۔

امیر معاویہ:۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم اپنی رائے پر سختی سے قائم ہو اس میں تبدیلی نہیں کر سکتے؟

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔

امیر معاویہ:۔ حیرت اور افسوس ہے کہ تم میرے طرز عمل کی قدر نہیں کرتے۔ میں صلہ رحمی کرتا ہوں اور تم اس کا جواب یہ دیتے ہو۔ افسوس۔

عبداللہ ابن زبیرؓ:۔ آپ کا جہاں تک تعلق ہے آپ نے اپنے بارے میں کوئی غلط بات نہیں کہی۔ لیکن یزید کے بارے میں آپ سچ سننے کے لئے ذرا بھی تیار نہیں ہیں۔

امیر معاویہ :۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنے بھائی اور ابن عم کے ساتھ زیادہ روادارانہ برتاؤ کرنا چاہیئے۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ میں آپ سے بالکل سچ عرض کرتا ہوں اور خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر میرے سگے بھائی کی بھی وہ زندگی ہوتی جو یزید کی ہے تو میں اس کی مخالفت کرتا۔ اگر میرا باپ بھی نا اہل ہوتا تو میں اس کی تائید نہ کرتا۔ اگر میرا بیٹا ہوتا اور وہ اسلام کے معیار پر پورا نہ اترتا تو میں اسے ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیتا۔ اگر وہ بڑھنا چاہتا تو میں اسے پیچھے دھکیل دیتا۔

امیر معاویہ :۔ اچھا ایک بات پر سمجھوتہ کر لو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ فرمایئے، میں ہر اس بات پر سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں جو حق و صداقت اور اصولِ اسلام سے نہ ٹکراتی ہو۔

امیر معاویہ :۔ یزید کے بارے میں تمہیں یہی شکایت ہے ناکہ اس کی زندگی اسلام کا نمونہ نہیں۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ جی ہاں سب سے بڑی شکایت یہی ہے۔

امیر معاویہ :۔ اور اسی لئے تم اسے خلافت کا اہل اور

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ جی ہاں، سب سے بڑی وجہ یہی ہے

امیر معاویہ :۔ تو ایسا کرو۔ یزید تمہارا بھائی اور ابن عم ہے، میں چاہتا ہوں کہ —— تم اسے صرف خلیفہ کا لقب دیدو۔ باقی حکومت کا پورا انتظام، عمال کا عزل و نصب، خراج کی تحصیل و وصولی اور اس کا سارا صرف تمہارے ہاتھوں میں رہے گا۔[1]

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ اس بندہ نوازی کا شکریہ قبول فرمایئے۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں اپنے آپ —— کو اس منصب کا حقدار سمجھتے ہوئے یزید سے اختلاف کر رہا ہوں تو یہ غلط ہے۔

امیر معاویہؓ :۔ گویا یہ صورت بھی تمہیں منظور نہیں۔؟

---

[1] تاریخ اسلام۔ ابن اثیر۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ کس طرح اس تجویز کو منظور کر سکتا ہوں۔ جس میں مفاسد زیادہ ہیں اور خوبیاں کم بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ غور تو فرمایئے، ایسی خلافت، خلافت کہلا سکتی ہے کہ خلیفہ کوئی ہو اور اختیار کسی اور کے ہاتھ میں ہو۔ اسلام کا خلیفہ، مسجد کا امام، میدان جنگ کا سپہ سالار اور تنہا سربراہِ مملکت بھی ہوتا ہے۔ آپ اس کے دو ٹکڑے دو ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ یہ امت امن و سکون سے کبھی آشنا نہ ہو۔"

امیر معاویہؓ :۔ تم میری ہر تجویز رد کر دیتے ہو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ کاش! آپ نے کوئی قابلِ قبول تجویز پیش کی ہوتی۔

امیر معاویہؓ :۔ میں کوئی ایسی تجویز نہ پیش کر سکا جو تمہارے لئے قابلِ قبول ہوتی۔ تم کوئی ایسی تجویز پیش کرو جو میرے لئے قابلِ قبول ہو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ میں تو بہت صاف اور دو ٹوک بات کہنے کا عادی ہوں۔

امیر معاویہؓ :۔ کہو۔ میں سننا چاہتا ہوں۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ ہمارے سامنے اس وقت تک انتخاب خلیفہ کی تین صورتیں ہیں۔ ان ہی سے کسی پر عمل کیجئے۔

امیر معاویہؓ :۔ وہ صورتیں کیا ہیں۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کسی کو نامزد نہ کیجئے۔ مسلمان جس کو پسند کریں گے منتخب کر لیں گے۔

امیر معاویہؓ :۔ یہ تو ایک صورت ہوئی ——— دوسری؟

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ یا ابو بکرؓ کی طرح ایسے شخص کو نامزد کیجئے۔ جس کا آپ سے کسی طرح کا تعلق نہ ہو۔

امیر معاویہؓ :۔ دو، تم نے دو تدبیریں پیش کیں۔ تیسری تدبیر کیا ہے؟

عبداللہ ابن زبیرؓ :۔ یا عمرؓ کی طرح چند آدمیوں میں سے ایک کا انتخاب مشورہ پہ چھوڑ دیجئے جو بھی منتخب ہو جائے۔[1]

---

[1] تاریخ اسلام ۔ ابن اثیر۔

امیر معاویہ :- تو یہ ہیں تمہاری تجویزیں !

عبداللہ ابن زبیرؓ :- جی ہاں ! میرے علم کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہی ہیں۔

امیر معاویہؓ :- کوئی اور صورت !

عبداللہ ابن زبیرؓ :- جی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی چوتھی صورت ہم قبول نہیں کر سکتے۔

امیر معاویہؓ :- اس کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھے سختی کرنے پر مجبور کر رہے ہو۔

عبداللہ ابن زبیرؓ :- آپ اپنے فعل کے مختار ہیں جو چاہیں کریں کون آپ کو روک سکتا ہے۔

امیر معاویہ :- ہاں میں اپنے فعل کا مختار ہوں جو مناسب سمجھوں گا کروں گا۔ میری رائے فیصلہ کن اور آخری ہے۔ اگر کسی نے اختلاف کی جرأت کی تو اس کا جواب میری تلوار دے گی۔[1]

ابن زبیرؓ کی تیوری پر بل آ گئے۔ ان کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ انہوں نے درشت لہجہ میں کہا۔

آپ تلوار کی دھمکی دیتے ہیں ! یہ دھمکی صرف ان لوگوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے جو دنیا کے لئے زندہ ہیں۔ سیم و زر کے طالب ہیں۔ جو موت سے ڈرتے ہیں۔ جو ایک خدا کو چھوڑ کر سینکڑوں خداؤں کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ یہ دھمکی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ میں مرعوب نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسلام اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ مسلمان کہلاؤں۔ اور غیر اسلامی نظام حکومت میں زندگی بسر کروں۔ آپ نے جتنی دلیلیں دی ہیں بودی ہیں آپ ڈرتے ہیں کہ آپ کے بعد کہیں مرکزیت پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ لہذا یزید کو ولی عہد نامزد کر دینا چاہتے ہیں۔ کیا امت کی اور اسلام کی فکر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے مرکزیت کے پارہ پارہ ہو جانے کا۔ اب اتنا اندیشہ نہیں ہے۔ جتنا وفات رسول اللہ کے وقت تھا۔ لیکن رسول اللہ کو اپنی امت پر۔ اس کی دیانت پر اس کی اسلامیت

---

[1] تاریخ اسلام — ابن اثیر۔

پر اعتماد تھا۔ انہوں نے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ امت نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنا لیا۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ انتخاب غلط تھا۔ ؟ ابوبکرؓ نے عمرؓ جیسے شخص کے لئے امت سے سفارش کی اور امت نے یہ سفارش قبول کر لی کیا امت کا یہ انتخاب غلط تھا؟ عمرؓ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت ایک کمیٹی بنا دی۔ جس نے عثمانؓ کو یہ منصب سونپا، اور اگر عثمانؓ کے مشیر آپ اور مروان نہ ہوتے تو ان کا دور بھی حد درجہ شاندار ہوتا۔ عثمانؓ کے بعد علیؓ کے دوش پر یہ ذمہ داری ملت نے ڈال دی اور کون کہہ سکتا ہے کہ علیؓ مرتضےٰ کا دور اسلام کی حقیقی روح کا آئینہ دار نہ تھا۔ علیؓ کے بعد حسنؓ نے خانہ جنگی سے بچنے کے لئے آپ سے صلح اس شرط پر کر لی کہ آپ کے بعد امت جسے چاہے گی منتخب کرے گی لیکن آپ کے لوگوں نے حسنؓ کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اور اب نہایت اطمینان سے عہد شکنی کر کے یزید کو میراث کی طرح مسندِ خلافت سونپنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم اسے تسلیم کر لیں گے ــــ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

باب ۲

تلوار کا فیصلہ

عبداللہ ابن زبیرؓ اور امیر معاویہؓ کے مابین تلخ و تند گفتگو کے بعد حالات اور زیادہ ناسا عد ہو گئے۔ امیر معاویہؓ یہ فیصلہ کر کے آئے تھے کہ یزید کی ولی عہدی پر بیعت لے کر واپس جائیں گے۔ لیکن ایک بڑا طبقہ عوام کا اور خواص کا ایک ایسا گروہ ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اس پر تلا ہوا تھا کہ اگر ولی عہد کی نامزدگی ضروری ہے تو کسی ایسے شخص کو اس منصبِ بلند پر مامور کرنا چاہیئے ——— جو مسندِ رسولؐ پر بیٹھنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہو۔

پہلے تو امیر معاویہؓ نے لطف و کرم سے اس مرحلہ کو طے کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب کسی طرح کام نہ چلا تو ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔ اہل حجاز کی نظر میں امام حسینؑ اور عبادلہ[1] کرام کی جو قدر و منزلت و رفعت تھی اس کی بنا پر وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ کہ جو کچھ یہ حضرات کریں گے۔ وہی وہ بھی کریں گے۔ اگر انہوں نے بیعت کر لی تو وہ بھی دستِ بیعت بڑھا دیں گے اور اگر انہوں نے بیعت کرنے سے انکار کیا تو وہ بھی کسی قیمت پر بیعت نہیں کریں گے۔

امیر معاویہؓ کو اپنے لوگوں سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ایسا فیصلہ ہو چکا ہے وہ تدبر، فراست اور اندازِ جہانبانی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے اس مرتبہ ایسی ترکیب کی کہ اس کا کوئی توڑ ہی نہیں تھا۔ جو وہ چاہتے تھے۔ ہو گیا۔ جو بات دوسروں کے

---

[1] عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ۔

پیشِ نظر تھی وہ نہ ہو سکی۔

انہوں نے مسجد میں اذنِ عام دیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ مذکورہ حضرات بھی طبعی پر تشریف لائے۔ امیر معاویہؓ نے ایک خطبہ دیا۔ اس میں اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا۔ خانہ جنگی کے اندیشہ کا اظہار کیا۔ اور اپنی زندگی میں ولی عہدی کا مسئلہ طے ہو جانے پر زور دیا۔ پھر کہا۔

"آپ لوگ (ان مذکورہ حضرات کی طرف اشارہ کر کے) ان حضرات کا احترام کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں۔ میں آپ حضرات کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں ان لوگوں کو مسلمانوں کا نمائندہ اور خیر اندیش سمجھتا ہوں۔ ان حضرات کے مشورہ اور صلاح کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیا جائے گا۔ ان سب نے یزید کی بیعت کر لی۔ اب آپ لوگ بھی بیعت کر لیں[1]

یہ اعلان اس سرعت کے ساتھ اور اس طرح آناً فاناً ہوا کہ کسی کو تردید کا موقعہ نہیں ملا۔ لوگ اب تک صرف انہی حضرات کے باعث تذبذب میں تھے۔ یہ سن کر ان کا تذبذب دور ہو گیا۔ انہوں نے بیعت کر لی بیعت کے ہنگامہ سے فراغت کے بعد لوگوں کو اصل حقیقت معلوم ہوئی۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بیعت کی رسم انجام پا چکی تھی۔ چنانچہ لوگ خاموش رہے۔ اور مخالفت کی آواز دب گئی[2]

امیر معاویہؓ پریشان اور مضطر اس سرزمینِ مقدس میں وارد ہوئے تھے لیکن یہاں سے ان کا کوکبۂ جلال جب دمشق واپس ہوا تو ان سے بڑھ کر خوش اور مطمئن کوئی نہ تھا جس بات کو زبان سے نکالتے ہوئے متامل تھے۔ وہ اب ایک حقیقت بن چکی تھی ایک ایسی حقیقت جو ناقابلِ تردید تھی۔

دمشق میں امیر معاویہؓ کا شاہانہ داخلہ ہوا۔ لوگوں نے ان کا پر جوش اور پُر خروش

---

[1] تاریخ اسلام ۔ ابن اثیر۔

[2] تاریخ اسلام ۔ ابن اثیر ج ۳ صـ۲۲۱

استقبال کیا۔ خاندانِ معاویہؓ میں یہ سن کر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کہ یزید ولی عہد مملکت قرار پایا۔ خود یزید یہ سن کر بہت مسرور ہوا۔ مسرت کی تکمیل میں اگر کوئی چیز حارج تھی تو صرف امیر معاویہ کا وجود۔ وہ اب یہ چاہتا تھا کہ امیر معاویہؓ جلد از جلد دنیا سے رخصت ہوں اور وہ تختِ خلافت پر بانہراراں جاہ و تمکنت رونق افروز ہو۔ دمشق پہنچنے کے چند روز بعد امیر معاویہؓ نے ایک روز یزید کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ طلبی کا جب پیغام پہنچا تو وہ اپنے مخصوص مشاغل میں منہمک تھا۔ ایک ماہ وش کنیز حضور میں حاضر تھی۔ جامِ بلوریں سامنے رکھا تھا۔ رقص و سرور کی محفل جمی ہوئی تھی۔ بے تکلف اور معتمد مصاحب حاضر تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ مستقبل کے پروگرام بن رہے تھے۔ نغمہ و آہنگ اور نشاط و سرور کی کیفیت سب پر چھائی ہوئی تھی۔ ساقیِ گلفام بادۂ ناب کا جام اپنے دستِ بلوریں پر رکھ کر سامنے موجود تھا۔ یزید نے گلاس لیا اور پینے ہی والا تھا کہ طلبی کا پیام پہنچا۔ وہ منغض ہو کر اٹھا اور یارانِ مجلس کو اپنے انتظار کی تاکید کرتا ہوا قصرِ معاویہؓ کی طرف روانہ ہو گیا۔

امیر معاویہؓ کے چہرے پر اس وقت فکر و تردد کے آثار ہویدا تھے۔ اپنے کمرے میں بالکل تنہا تھے۔ اور انتہائی استغراق کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ یزید کو آتا دیکھ کر ان کے چہرے پر شکن پڑ گئی۔ انہوں نے سرد مہری کے ساتھ کہا۔

امیر معاویہؓ: میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔

یزید:۔ جیسے ہی معلوم ہوا کہ آپ نے یاد فرمایا ہے فوراً حاضر ہو گیا۔

امیر معاویہؓ:۔ تم سن چکے ہو کہ تمہاری ولی عہدی پر میں نے نہ صرف کوفہ اور بصرہ سے بلکہ اہل حجاز سے بھی جس بنا پر بیعت لے لی ہے تمہارے راستے کے تمام کانٹے میں نے ہٹا دیئے ہیں۔ ہر وہ کانٹا جو تمہارے دامن سے اُلجھ سکتا تھا اسکی چبھن خود لے لی ہے۔ اور تمہارے لئے صرف پھول ہی پھول رہنے دیئے ہیں۔

یزید:۔ میں جانتا ہوں امیر المومنین! آپ نے اپنے نالائق بیٹے کے لئے وہ کام کیا ہے جو کوئی باپ نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے اہل حجاز کو بیعت پر آمادہ

کرلینا صرف آپ ہی کا کام ہے۔ یہ بات میرے علم میں ہے۔ کہ وہاں کے لوگ میرے نام سے بیزار ہیں۔

امیر معاویہؓ:۔ اگر بیزار ہیں تو انہیں ملامت نہیں کی جاسکتی۔ تمہارے اطوار ہی ایسے ہیں۔ میں نے تمہیں اس لیئے بلایا ہے کہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو۔ تم صرف ایک معمولی شخص نہیں ہو ایک بہت بڑے خاندان کے فرد ہو۔ ایک بہت بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ تم سے شکایت غیروں ہی کو نہیں ہے۔ بلکہ اپنوں کو بھی ہے۔ دوسروں کا کیا ذکر خود مجھے بھی ہے۔

یزید:۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ کو بھی مجھ سے شکایت ہے۔ میں دنیا کی پرواہ نہیں کرتا۔ دنیا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لیکن آپ کو کسی قیمت پر بھی ناراض نہیں دیکھ سکتا۔ میں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ اب کسی شکایت کا موقعہ میری ذات سے نہیں ملے گا۔

امیر معاویہؓ:۔ (باچشم پرنم) خدا کرے تمہارا یہ وعدہ سچا ہو۔ خدا کرے۔ تم اپنے قول کو نباہو ــــ بیٹے! میں بوڑھا ہو چکا۔ میری حیثیت اب پیر فانی کی ہے۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ تمہیں ابھی زندہ رہنا ہے اپنی زندگی بنانی ہے۔ میں نے تمہیں ایک صاف اور ہموار راستے پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اب تمہارا کام ہے کہ آگے بڑھو اسی راستے پر چلتے رہو۔ اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ۔

یزید:۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ میں اب ہرگز آپ کو کسی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گا۔

بڑی دیر تک امیر معاویہ یزید کو نشیب وفراز سمجھاتے رہے اور وہ ان سے وعدے وعید کرتا رہا لیکن اس کے دل اور زبان میں ہم آہنگی نہیں تھی۔ وہ زبان سے وعدے کر رہا تھا، عہد کر رہا تھا اپنی اصلاح کا اعلان کر رہا تھا۔ اور دل میں عیش وعشرت اور نشاط وطرب کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اپنے باپ کی جن باتوں سے وہ اس وقت بہت زیادہ متاثر نظر آرہا تھا۔ حقیقت میں انہیں وہ پوری توجہ سے سن بھی نہیں رہا تھا۔ باپ کے سامنے

وہ سراپا ادب بھی بنا بیٹھا تھا۔ لیکن دراصل وہ یہاں سے جلد از جلد رخصت ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے اپنی وہ محفلِ طرب یاد آ رہی تھی۔ جسے چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ اسے وہ جامِ ارغوانی نظر آ رہا تھا جو اس کے ہونٹوں تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کا ایک گھونٹ بھی وہ نہ پی سکا تھا۔ اسے وہ پری پیکر اور نازک اندام کنیز یاد آ رہی تھی جو ساقیِ گلفام کے روپ میں اس کے سامنے رہزنِ تمکین و ہوش بنی کھڑی تھی۔ کہاں وہ رنگینیاں، کہاں یہ خشک اور بدمزہ باتیں۔

اس گفتگو کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

امیر معاویہ اپنی مصروفیتوں میں منہمک ہو گئے اور یزید اپنے مشاغل میں۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ رات، دن کا لباس پہنتی رہی اور دن رات کی چادر اوڑھتا رہا۔ ماہ و سال کا قافلہ تیز پا کسی کا انتظار کئے بغیر ماضی کے دھندلکے میں روپوش ہوتا رہا مستقبل حال کی شکل میں نظر کے سامنے آتا رہا۔ یہاں تک کہ امیر معاویہؓ بیمار پڑ گئے۔ ہر طرح کے طبیب موجود تھے۔ مسلمان بھی اور عیسائی بھی، سب نے دوائیں دیں تشخیص کی معالجہ کیا۔ لیکن حالت روز بروز مایوس کن ہوتی گئی۔

ایک روز انہوں نے یزید کو طلب کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنے عملہ کے ساتھ شکار کو گیا ہے۔ کس سمت گیا ہے؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ کب آئے گا۔ اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سن کر امیر معاویہ پر برہمی کی کیفیت طاری ہو گئی لیکن مجبور تھے کیا کر سکتے تھے۔ انہوں نے کمزور اور نقیہہ آواز میں کہا۔

کچھ نہیں معلوم وہ کب آئے گا؟ موت اس کا انتظار نہیں کر سکتی۔ میں اپنی حالت کا اندازہ کر رہا ہوں۔ اب آخری وقت قریب آ رہا ہے۔ کاش وہ ہوتا اور کچھ نصیحتیں اور ہدایتیں اسے کر دیتا۔

یہ کہہ کر امیر معاویہ خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے کروٹ بدلی اور پوچھا۔

"ابھی تک نہیں آیا؟"

جواب ملا۔

"ابھی تک نہیں آئے۔"

امیر معاویہ نے پھر بڑی حسرت کے ساتھ پوچھا۔

"کوئی اسے بلانے گیا ہے؛ کسی کو بھیجو کہ وہ اسے ڈھونڈ کر لائے۔" عرض کیا گیا۔

"ہر طرف آدمی دوڑائے لیکن سراغ نہ لگا۔ فقط اتنا معلوم ہے کہ شکار پر گئے ہیں۔

یہ سن کر مایوسی کی کیفیت ان پر طاری ہو گئی۔ وہ خاموش ہو کر لیٹ گئے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولیں اور فرمایا۔

قلم اور دوات لاؤ میں وصیت نامہ لکھوانا چاہتا ہوں۔"

فوراً اس ارشاد کی تعمیل ہوئی۔ کاتب، قلم دوات لے کر حاضر ہوا اور امیر معاویہ نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔

"جان پدر! میں نے تمہاری راہ کے تمام کانٹے ہٹا کر تمہارے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ دشمنوں کو زیر کر کے سارے عرب کی گردنیں تمہارے آگے جھکا دی ہیں اور تمہارے لئے ایک بڑا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اہل حجاز کے حقوق کا ہمیشہ لحاظ رکھنا کہ وہ تمہاری اصل بنیاد ہیں۔ جو حجازی تمہارے پاس آئے اس سے حسن سلوک سے پیش آنا۔ اس کی عزت کرنا۔ اس پر احسان کرنا اور جو نہ آئے اس کی خبر گیری کرتے رہنا۔ اہل عراق کی ہر خواہش پوری کرنا۔ اگر وہ روزانہ عاملوں کا تبادلہ چاہیں تو روزانہ کر دینا کہ عمال کا تبادلہ تلواروں کے بے نیام ہونے سے بہتر ہے۔ شامیوں کو اپنا مشیر بنانا ان کا خیال ہر حال میں مدنظر رکھنا۔ جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے مقابلہ میں آئے تو ان سے مدد لینا لیکن کامیاب ہونے کے بعد ان کو فوراً واپس بلا لینا۔ ورنہ دوسرے مقام پر زیادہ ٹھہرنے سے ان کے اخلاق بدل جائیں گے۔

سب سے اہم خلافت کا معاملہ ہے اس میں حسینؓ ابن علیؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ — عبدالرحمن بن ابی بکرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ کے علاوہ کوئی حریف نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہیں زہد و عبادت کے علاوہ اور کسی چیز سے واسطہ نہیں۔ عام مسلمانوں کی بیعت کے بعد انہیں بھی کوئی عذر نہ ہو گا۔ عبدالرحمان بن ابی بکرؓ میں کوئی ذاتی حوصلہ اور ہمت نہیں ہے۔

جو ان کے ساتھی کریں گے وہ اس کی پیروی کرلیں گے۔ البتہ حسین ابن علیؓ کی جانب سے خطرہ ہے۔ اہل عراق انہیں تمہارے مقابلہ میں لاکھڑا کریں گے۔ وہ تمہارے مقابلہ میں آئیں اور تم کو ان پر قابو حاصل ہو جائے تو درگزر سے کام لینا کہ وہ قرابت دار، بڑے حق دار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ہیں۔ البتہ جو شخص لومڑی کی طرح کاوے دے کر شیر کی طرح حملہ کرے گا۔ وہ عبداللہ ابن زبیرؓ ہیں۔ اگر وہ صلح کرلیں تو فبہا ورنہ قابو پانے کے بعد ان کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ان کے ٹکڑے اڑا دینا[1]

---

[1] یہ وصیت طبری اور الفخری کے بیان کا خلاصہ ہے۔ طبری ج ۵ ص ۱۹۶-۱۹۷ الفخری ص ۵۰

باب ۸

لیلے

دمشق میں قتل عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کے خلاف بڑا زبردست پروپیگنڈا کیا گیا تھا۔ رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ کی اہلیہ سے خون آلود پیراہن تک منگا لیا گیا تھا جسے شہادت کے وقت آپ پہنے ہوئے تھے۔ اور اس کی ایک ایک گلی اور کوچہ میں اور ہر چوراہے پر نمائش کی گئی۔ عوام کالانعام ہوتے ہی ہیں۔ اس مسلسل پروپیگنڈے نے رائے عامہ کو متاثر کیا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف ایک عام فضا پیدا ہو گئی۔ امیر معاویہؓ کا مرکزِ خلافت اگر دمشق کی بجائے حجاز ہوتا تو وہ اپنے مقاصد میں بالکل کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ حجاز کے باشندے امیر معاویہ سے اور ان کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ حجاز کے علاوہ بھی اگر ان کا مرکز خلافت کوفہ، بصرہ یا کوئی اور شہر ہوتا تو بھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے کہ وہاں کے لوگ بھی اصل حالات سے آشنا تھے۔ وہ جانتے تھے حضرت عثمانؓ کے قاتل کون لوگ تھے یا یہ قتل کیوں ہوا؟ اس کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ اس کے برعکس شام کے لوگ اصل حقیقت سے ناواقف تھے اور نہ ختم ہونے والے پروپیگنڈے نے اور زیادہ انہیں غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا لہٰذا وہ آسانی سے دھوکا کھا گئے۔ اور سبّ علیؓ کی تحریک میں شریک ہو گئے۔ امیر معاویہؓ کے حکم سے جب مسجدوں میں منبروں پر حضرت علیؓ کے خلاف سب و شتم کا سلسلہ شروع ہوا تو دمشق کے سوا کوئی شہر ایسا نہیں تھا۔ جہاں اس خلافِ اسلام اقدام کے خلاف مظاہرے

نہ ہوئے ہوں۔ کوفہ میں حجر بن عدیؓ مشہور صحابی رسولؐ، اس لئے مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے کہ وہ حضرت علیؓ کی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے لیکن شام سے ایک آواز بھی مخالفت میں بلند نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے لوگ حضرت علیؓ سے بیزار کئے جا چکے تھے۔

" لیکن انہی اہل شام اور اہالیان دمشق میں ایک خاندان تھا جو سختی کے ساتھ حُبّ اہل بیعت کے مسلک پر قائم تھا۔ اس خاندان کا سربراہ نعمان تھا۔ نعمان صحیح معنیٰ میں مرد مجاہد تھا۔ اس نے حضرت علیؓ کی ہمرکابی میں متعدد جنگوں میں شرکت کی۔ بہادری سے لڑا۔ زخمی ہوا۔ لیکن اپنے مسلک سے دستبردار نہیں ہوا۔ نہروان کی جنگ میں جو خوارج سے حضرت علیؓ کی نہایت معرکہ آرا جنگوں میں شمار ہوتی ہے نعمان بھی شریک تھا۔ اس نے میدان جنگ میں ڈٹ کر خوارج کا مقابلہ کیا۔ گھائل ہوتا رہا۔ زخم کھاتا رہا لیکن پیٹھ نہ دکھائی منہ نہ موڑا۔ راہ وفا میں ثابت قدم رہا۔ یہاں تک کہ شہادت کے رتبۂ بلند پر فائز ہوا۔

منذر اسی نعمان کا بیٹا تھا۔ لیکن عادات اور خصلت، طبیعت اور مزاج میں باپ سے مختلف، باپ کا یہ حال تھا کہ وہ اسلام کا سرفروش تھا۔ اور اس کی کیفیت یہ تھی کہ بندۂ سیم وزر تھا۔ باپ حق وصداقت کے لئے ہر ایثار پر تیار رہتا تھا اور بیٹا نہ حق سے واقف تھا نہ صداقت سے، یہ امیر معاویہؓ کے مصاحبوں میں شریک ہو گیا۔ امیر معاویہ کا یہ اصول تھا کہ وہ مخالفوں کے ساتھ بہت زیادہ لطف وکرم اور احسان و مدارات کا برتاؤ کرتے تھے۔ اور آخر کار انہیں رام کر لیتے تھے۔ حد یہ ہے کہ زیاد ابن ابیہ جیسے شخص کو آخر کار انہوں نے اپنا زر خرید غلام بنا لیا۔ حالانکہ یہ وہ شخص تھا جو حضرت علیؓ کے فدائیوں میں تھا۔ ہر معرکہ میں پوری ثابت قدمی کے ساتھ ان کا ہمرکاب رہا۔ کسی رغبت، رشوت، دباؤ، دہشت یا لالچ سے متاثر نہیں ہوا۔ لیکن امیر معاویہ کی پیہم نوازشوں نے مزاحمت کی قوت سلب کر لی۔ اور رفتہ رفتہ وہ ان کا دست و بازو بن گیا۔

منذر بھی باپ کی زندگی میں اسی گروہ میں شریک تھا۔ یہ حضرت علیؓ کے دستِ مبارک

پر بیعت کر چکا تھا۔ لیکن زیاد کی چند چکنی چپڑی باتوں نے اسے قصرِ معاویہ میں پہنچا دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ اپنے سابقہ مسلک سے منحرف ہو گیا۔ اور ہر معاملہ میں امیر معاویہ کی ہمنوائی کرنے لگا۔ شروع میں اس کی یہ کیفیت تھی کہ اور باتوں میں وہ شریک رہتا تھا لیکن حضرت علیؓ پر تبرا کہنے کا جب وقت آتا تو الگ ہو جاتا تھا۔ اس لئے کہ ان کی عقیدت دل و دماغ کے ہر ہر ریشہ میں پیوست ہو چکی تھی۔ لیکن یہ کیفیت بھی بہت جلد زائل ہو گئی۔ اور وہ بھی ان لوگوں کی طرح ہو گیا جو انجام و نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر حضرت علیؓ پر (نعوذ باللہ) لعنت بھیجنا اپنا فریضۂ حیات قرار دے چکے تھے۔

منذر کی ایک لڑکی تھی ــــــ لیلیٰ !

وہ نور کا ایک پیکر تھی۔ حُسن کا مجسمہ تھی ــــــ سرو قامت، ہرن کی سی بڑی بڑی آنکھیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک ہونٹ، آواز میں ایک خاص قسم کی موسیقیت۔ انداز و اطوار میں بلا کی دل کشی، چھب اور اداؤں میں قیامت کی رعنائی۔ چاند اسے دیکھ کر شرما جاتا اور بادلوں کی اوٹ میں پناہ گزین ہو جاتا۔ ستارے اسے دیکھ کر جھلملانے لگتے۔ اس کی روشنی انہیں ماند کر دیتی۔ نسیم بہار نے رعنائی اسی سے مستعار لی تھی۔ پھولوں نے مسکرانا اسی سے سیکھا تھا۔ قیامت اسی کی رفتار کا نام تھا۔ فتنے اس کے قدم کے نیچے پامال ہوتے تھے۔ جو اسے دیکھ لیتا اس کا کلمہ پڑھنے لگتا تھا۔ اپنی سیرت اور کردار کے اعتبار سے بھی نہایت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ کیا مجال کسی وقت کی نماز قضا ہو جائے۔ کسی روز کی تلاوتِ قرآن مجید ناغہ ہو جائے۔ وہ فنونِ خانہ داری میں طاق تھی۔ ماں مر چکی تھی۔ بھائی کوئی نہ تھا۔ وقت کا بڑا حصّہ گھر کے کام کاج میں صرف کرتی تھی۔ اس سے فارغ ہو کر مذہبی اور دینی مسائل کی عقدہ کشائی میں مصروف ہو جاتی تھی۔ صالح اس گھر کا پرانا غلام تھا۔ شعور کی آنکھیں اسی گھر میں اس نے کھولیں۔ یہیں جوان ہوا۔ اور اسی گھر کے بام و در اب اس کے بڑھاپے کی قابلِ رحم کیفیت دیکھ رہے تھے۔ وہ نعمان کا ہم عمر تھا۔ منذر اس کی گود میں کھیلا تھا۔ اور بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ لیلیٰ کی پرورش اور پرداخت میں صالح کا بہت بڑا حصّہ تھا۔ وہی تھا جس

نے اسے گود میں کھلایا تھا۔ لکھنا پڑھنا سکھایا۔ ایک شریف خاندان کی غریب اور نادار بیوہ عورت کو ملازم رکھ کر اس نے لیلیٰ کو فنونِ خانہ داری میں طاق کر دیا۔

ایک روز لیلے خاموش اور افسردہ سی اپنے کمرہ میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ کہ صالح آگیا۔ اس نے اس حالت میں دیکھا تو گھبرا گیا۔ پوچھا۔

"بیٹی کیا بات ہے آج تمہیں مضمحل اور افسردہ دیکھ رہا ہوں کوئی بات ہو تو بتاؤ۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کوئی دکھ نہیں پہنچ سکتا۔

لیلیٰ نے ایک تاثر کے عالم میں جواب دیا۔

"جانتی ہوں آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میری ذرا سی پریشانی بھی آپ نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کو خوش دیکھنے کے لئے میں خوش رہنا چاہتی ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ خوشی میرے نصیب میں نہیں ہے۔"

صالح بے کل ہو گیا۔ بے قراری کے عالم میں پوچھا۔

"ہیں یہ تو کیا کہہ رہی ہے! خوشی تیرے نصیب میں نہیں ہے تو کس کے نصیب میں ہے! مجھے اس کا نام بتاؤ جس کے پاس یہ دولت ہو۔ میں اس سے چھین لاؤں گا۔ ساری خوشیاں، تیرے قدموں میں لاکر ڈال دوں گا۔"

لیلی ـــــ (مسکرا کر) یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ خوشی چھین لائیں گے۔ خوشی کا چھین لینا تو آسان اور ممکن ہے لیکن وہ تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ وہ تو صرف دل کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔

صالح :۔ آج تو کس طرح کی باتیں کر رہی ہے معلوم ہوتا ہے تو نے فلسفہ بھی پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

لیلے :۔ جی تو چاہتا ہے پڑھنے کو۔ ہر علم پڑھنا چاہیئے۔ اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے لیکن ـــــ

صالح :۔ تو خاموش کیوں ہو گئی۔ آخر بولتی کیوں نہیں ؛ بتاتی کیوں نہیں ؛

لیلے :۔ نہیں عم محترم۔ کوئی خاص بات نہیں۔ یونہی اس وقت طبیعت گھبرا رہی تھی۔

صالح :۔ تو جاؤں، رقیہ تیری سہیلی کو بلا لاؤں یقیناً اس سے تیرا جی بہل جائے گا۔

لیلیٰ :۔ اسے بلا کر کیا کیجئے گا۔ وہ تو ابھی ابھی گئی ہے یہاں سے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ منذر آتا دکھائی دیا۔ آج خلاف معمول بہت زیادہ خوش تھا باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ بند قبا ٹوٹے جا رہے تھے اسے اتنا زیادہ خوش دیکھ کر لیلیٰ سہم گئی۔ خواہ مخواہ اس کے دل میں یہ خیال گردش کرنے لگا۔ آج ضرور کوئی بات ہے۔

صالح بھی منذر کو اتنا زیادہ خوش اور مسرور دیکھ کر کھٹکا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ منذر کی خوشی قابو سے باہر اسی وقت ہوتی ہے جب اسے دنیاوی سربلندی کا کوئی نیا میدان نظر آتا ہے۔ ضرور آج بھی کوئی نئی اسکیم اور کوئی نیا منصوبہ لے کر آیا ہوگا۔ خدا خیر کرے۔

لیکن منذر کے طوفانِ نشاط میں صالح کا اندیشہ اور لیلیٰ کا خوف گم ہوگیا۔ کسی کو بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ اس نشاطِ بے سبب کی علت اس سے دریافت کرتا۔ دونوں ایسی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے جیسے وہ پوچھ رہے ہوں۔ فرمایئے کوئی نئی خبر؟

باب ۹

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

منذر نے سراپا نشاط و مسرت بن کر لیلےٰ کو یہ خوش خبری سنائی کہ اس نے ولی عہد مملکت یزید کو اپنے غریب خانہ پر مدعو کیا ہے اور ولی عہد بہادر نے ازراہ لطف و کرم یہ دعوت بطیبِ خاطر منظور بھی فرمالی ہے۔" اس خبر سے نہ صالح کو خوشی ہوئی نہ لیلےٰ کو۔ لیکن خود منذر اتنا خوش تھا کہ اس نے ان دونوں کی ناگواری کو محسوس بھی نہیں کیا۔ اس نے لیلیٰ سے کہا۔

"بیٹی! تمہیں کچھ ہدایت دینا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ ماشاء اللہ تم خود ذکی اور دانا ہو۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ اس دعوت میں اپنا سارا ہنر صرف کر دو۔ ایسے ایسے کھانے پکاؤ کہ ولی عہد مملکت انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔

لیلےٰ :- اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گی مطمئن رہیے۔

منذر :- میری بچی! مجھے تم سے یہ ہی توقع تھی۔ روپے کا منہ نہ دیکھنا۔ جتنا درکار ہو لے لو۔ جہاں خرچ کا موقع ہو ذرا دریغ نہ کرنا۔ لوگ مجھے بخیل کہتے ہیں۔ اگر بخیل ہوں بھی تو کس کے لئے۔۔۔؟ اپنی بیٹی کے لیے۔ اپنی بچی کے لئے۔ یہ دولت قبر میں تو اپنے ساتھ نہ لے جاؤں گا تیرے ہی کام آئے گی ——

لیلےٰ :- خدا آپ کا سایہ مدتوں سلامت رکھے۔ میری سب سے بڑی دولت آپ

ہیں۔ آپ کے ہوتے مجھے کسی دولت کی ضرورت نہیں۔

منذر :۔ بیٹی! تو سچ کہتی ہے لیکن سب کے ماں باپ ہمیشہ تو بیٹھے نہیں رہتے۔ عقلمند باپ وہ ہے جو اولاد کے لئے اپنی زندگی میں سب کچھ کر جائے۔

صالح :۔ جی ہاں۔ جیسے امیر معاویہ نے یزید کے لئے کیا ہے۔

منذر :۔ (مسکرا کر) تو کچھ غلط کیا؟ ایک باپ کو وہی کرنا چاہیئے۔ جو انہوں نے کیا ہے۔

صالح :۔ بجا ارشاد ہوا۔ مجھ میں یہ ہمت کہاں کہ آپ سے اختلاف کر سکوں۔

منذر :۔ اور کس طرح کرو گے؟ لیکن میں تمہارے اختلاف سے خفا نہیں ہوتا خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اپنی فطرت اور اپنے مزاج میں تبدیلی نہیں کر سکتے۔ میں بھی یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

لہٰذا کچھ نہیں کہتا۔

لیلےٰ :۔ ابا جان! دعوت ہے کب؟

منذر :۔ کل ــــ کل رات کو ولی عہد مملکت میرے غریب خانہ پر رونق افروز ہوں گے۔ یہاں ماحضر تناول فرمائیں گے۔ اس عزت افزائی، کرم گستری اور بندہ نوازی کی کوئی حد ہے۔؟ بھلا کہاں وہ کہاں میں۔ کہاں آفتاب عالمتاب، کہاں ذرۂ بے مقدار! کہاں امیر معاویہ کا لختِ جگر۔ خلافتِ اسلامیہ کا ولی عہد، قصرِ شاہی کا گلِ سرسبد، کہاں مجھ جیسا ناچیز۔ یہ قدرت کی مہربانی ہے کہ میں نے دعوت دی اور انہوں نے قبول فرمالی۔ صالح، روپیہ کا منہ نہ دیکھو۔ خوب خرچ کرو۔ بے دریغ بے درنگ۔ میں چاہتا ہوں۔ یہ دعوت یادگار رہ جائے۔ لوگ اس کا چرچا کریں کہ منذر نے کسی کی دعوت کی تھی۔ یہ دعوت میری قسمت کا رخ بدل دے گی۔ مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دے گی۔ میرا سویا ہوا مقدر جاگ جائے گا۔

صالح :۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

منذر :۔ ہاں صالح! میں غلط نہیں کہتا۔ تم نہیں جانتے، تم میری باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

یہ دعوت نہیں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ ایک شاندار یادگار اور پُربہار دور کا آغاز، دنیا بدل جائے گی کایا پلٹ جائے گی۔

بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لئے

منذر کا خاندان اب تک بے مایہ تھا۔ کم سواد تھا۔ اب وہ بلندی میں آسمان سے چشمک زنی کرنے لگے گا۔ بھلا تم یہ باتیں سمجھ سکتے ہو؟

صالح :۔ نہیں سمجھ سکتا___ اس لئے نہیں کہ سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوں اسلئے کہ سمجھنا چاہتا نہیں۔

منذر :۔ یہ کیوں؟___ آخر اس سرد مہری اور بے پروائی کی وجہ؟

صالح :۔ مزاج اور طبیعت کا اختلاف۔ آپ جسے سربلندی سمجھتے ہیں۔ میں اسے بے مائگی سمجھتا ہوں۔

منذر :۔ نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔ بظاہر مجھ پر طنز کر رہے ہو۔ لیکن میں اس وقت اتنا خوش ہوں۔ کہ ان باتوں پر غور بھی نہیں کر سکتا۔ تم جو چاہو سمجھو لیکن میرا کہا کر دو۔ میری عزت رکھ لو۔ ایسی شاندار دعوت ہو۔ اتنا اچھا انتظام کرو کہ شرکاء دعوت عش عش کر جائیں۔ کامیابی کا سہرا صرف میرے سر ہی نہیں بندھے گا تمہارا بھی نام ہوگا۔ تمہاری بھی تعریف کی جائے گی۔ تمہیں بھی سرفراز کیا جائے گا۔

صالح :۔ شکریہ! اس توجہ فرمائی کا لیکن بندہ اپنے حال میں مگن ہے۔ مجھے سرفرازی نہیں چاہیئے۔ میں سربلندی کا بھوکا نہیں۔ ساری دنیا ناخوش ہو جائے، مجھے کوئی پرواہ نہیں"

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے

میری تو یہی حسرت اور آرزو ہے۔

منذر :۔ تمہاری یہ حسرت اور آرزو پوری ہوگی۔ میں تمہیں خوش خبری دیتا ہوں جو شخص اپنے آقا، اپنے مالک، اپنے امیر، امام اور خلیفہ کی خدمت کرے۔ خدا اس سے

ضرور خوش ہوگا۔ اس سے بڑھ کر خدا کی خوشنودی کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے —
لیکن تم تو بحث و گفتگو میں وقت ضائع کر رہے ہو۔ وقت بہت کم ہے کام ہونا چاہیئے۔

لیلےٰ :۔ وہ ہو جائے گا اطمینان رکھیے۔

منذر :۔ تم اکیلی یہ سارا کام کس طرح کر پاؤگی؟ میرے خیال میں اپنی سہیلی رقیہ کو بلا لو۔ جی بھی بہلے گا اور کام بھی اچھی طرح انجام پائے گا۔

لیلےٰ :۔ یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہی۔ میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔

منذر :۔ میں اسی طرف جا رہا ہوں۔ اسے بھیجتا جاؤں گا۔

یہ کہہ کر منذر رخصت ہوگیا۔ صالح اپنے کام میں لگ گیا اور لیلیٰ اپنے دل میں سوچنے لگی۔ اب کیا ہوگا۔ ابا جان کی دعوت کہیں کوئی گل تو نہیں کھلائے گی؟ آج جس قسم کی باتیں وہ کر رہے ہیں۔ ایسی باتیں تو انہوں نے کبھی نہیں کی تھیں — خیر! ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

باب ۱۰

یزید کی دعوت

وقت مقررہ پر یزید، منذر کے گھر پہنچ گیا۔ آج اس گھر کی رونق دیکھنے کے قابل تھی۔ امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، معاویہ کا فرزند دلبند شاہانہ وقار اور تمکنت کے ساتھ وارد ہوا تھا۔

منذر اپنی خوش بختی پر نازاں تھا۔ دمشق کے امراء و رؤسا یہ حسرت رکھتے تھے کہ یزید ان کے درِ دولت پر مہمانِ عزیز بن کر پہنچے۔ لیکن کسی میں یہ ہمت نہ تھی کہ حرف مطلب زبان پر لاتے اور کسی میں تھی بھی تو یزید اتنا سہل الحصول کب تھا کہ آسانی سے کسی کے ہاں مہمان بن کر پہنچ جاتا۔ روزِ ازل سے یہ خوش بختی صرف منذر ہی کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

منذر نے اس دعوت کو زیادہ سے زیادہ شاندار اور پُر تکلف بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ دستر خوان پر رنگا رنگ کی نعمتیں موجود تھیں۔ لوگ اسے کنجوس اور بخیل کہتے تھے اور واقعی وہ تھا بھی ایسا ہی۔ لیکن آج اگر حاتم بھی زندہ ہوتا تو فضول خرچی کی حد تک اس کی مہمان نوازی کے جلوے دیکھ کر حیران رہ جاتا۔ جب تک یزید نے گھر میں قدم نہ رکھا تھا وہ سرخوشی اور دیوانگی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چکر کاٹ رہا تھا۔ کبھی گھر میں اور کبھی گھر سے باہر کبھی لیلٰے سے الجھ رہا ہے کبھی صالح کو ڈانٹ رہا ہے۔ کبھی رقیہ پر اعتراض کر رہا ہے۔ یہ چیز ٹھیک نہیں ہے۔ وہ چیز خراب ہے۔ صالح ایک خاموشی میں ہزار بلائیں ٹال رہا تھا۔ کسی

اعتراض کا جواب نہیں دیتا تھا۔ یسلےٰ اتنی مصروف اور منہمک تھی کہ اس نے گوش و ہوش سے نہ کوئی بات سنی نہ کوئی جواب دیا۔ رقیہ جواب دیتی تھی لیکن صرف تبسم سے اس صورت حال سے زچ اور لاجواب ہو کر وہ برہمی اور آشفتہ مزاجی کے عالم میں پھر اندر باہر کے چکر کاٹنے لگتا تھا۔ یزید کے آنے کے بعد اس کی اضطرابی کیفیت کچھ اور بڑھ گئی۔ بہتر سے بہتر چیزیں دسترخوان پر موجود تھیں۔ لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ ابھی بہت کمی ہے۔ فلاں فلاں چیزیں اور ہوتیں تو اچھا ہوتا لیکن اب مہمان آ چکا تھا۔ دسترخوان بچھ چکا تھا۔ کھانا چنا جا چکا تھا۔ کسی قسم کا اضافہ ممکن نہ تھا۔ منذر نے دسترخوان پر صرف حاضر باشی کافی سمجھی۔ اس کی تمنا تھی کہ یزید کھانے کے ساتھ دسترخوان بھی کھا لے تاکہ اس کا دل سکھ پائے۔ لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ یزید بہت آہستہ آہستہ لقمے اٹھا رہا ہے اور اس کی نظریں ادھر ادھر کسی کو ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ منذر یزید کی اس کیفیت کو سمجھ نہ سکا۔ اس نے اس روش کو ناپسندیدگی پر محمول کیا۔ اور ڈرتے ڈرتے اپنے آقائے ولی نعمت سے کہا۔

بہت شرمندہ ہوں کہ شہزادہ والا مرتبت کے شایانِ شان دعوت کا اہتمام نہ کر سکا۔

یزید :۔ یہ کیا کہتے ہو منذر! تم نے تکلف کی حد کر دی۔ چند آدمیوں کے لئے تم نے اتنی ساری چیزیں پکوالیں کہ ان سے لذت اندوز ہونا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ کہاں تک کھائیں اور کیا کیا کھائیں۔

منذر :۔ یہ شہزادہ والا جاہ کی بندہ نوازی اور ذرہ افزائی ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ غلام دل ہی دل میں اپنی نارسائی پر شرمندہ ہو رہا ہے۔

یزید :۔ تم بھلیں شرمندہ کر رہے ہو۔ ایسا نہ کہو ہمیں تمہارے ہاں کے کھانے بہت پسند آئے (مسکرا کر) اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ بھی جب کبھی بلاؤ گے۔ ضرور آئیں گے۔

منذر :۔ کس منہ سے شکریہ کیجئے اس لطفِ خاص کا۔

یزید :- لیکن ہمیں تم سے ایک شکایت ضرور ہے۔

منذر :- (سہم کر) غلام سے کوئی شکایت ہے آپ کو؟

یزید :- ہاں! بہت بڑی شکایت۔

منذر :- تو غلام کو مطلع کیا جائے۔

یزید :- شکایت یہ ہے کہ دعوت ہر اعتبار سے مکمل ہے لیکن کچھ روکھی پھیکی سی ہے۔

منذر :- آپ جو ارشاد فرمائیں اس کی تعمیل کی جائے گی۔

یزید :- رقص و سرور اور نغمہ و مے کے بغیر محفل کیا؟ لیکن ہم جانتے ہیں ان چیزوں کا انتظام تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن تم خود بھی تو گا سکتے ہو۔ کیوں نہ اپنا گانا سنا کر ہمیں محظوظ کرو؟

منذر :- زندگی میں آج پہلی مرتبہ محسوس کر رہا ہوں کہ گانا نہ سیکھ کر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔

یزید :- واقعی تم گانا بالکل نہیں جانتے؟

منذر :- بالکل نہیں امیر المومنین!

یزید :- (مسکرا کر) تم ہمیں امیر المومنین کہتے ہو۔ لیکن ابھی والد محترم زندہ ہیں۔ اور جب تک وہ زندہ ہیں یہ لقب انہیں کو سزاوار ہے۔

منذر :- ہم غلاموں کے نزدیک تو آپ ہی امیر المومنین ہیں۔ اور دنیا بھی آج نہیں تو کل اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

یزید :- تم نے اس لقب سے مخاطب کر کے مبارک فال کا آغاز کیا ہے ہم تمہارے اس مبارک جذبہ کی قدر کرتے ہیں۔

منذر :- میری رائے تو یہ ہے کہ امیر المومنین معاویہ بوڑھے ہو چکے ہیں قویٰ جواب دیتے جا رہے ہیں۔ انہیں اب کسی گوشہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا چاہیئے اور کاروبارِ حکومت آپ کو سونپ دینا چاہیئے۔ وہ امنگ، وہ حوصلہ، وہ ولولہ وہ جذبہ اور جوشِ کار جو ایک نوجوان میں بجلی بن کر تڑپ سکتا ہے اس کی جھلک

ایک بوڑھے اور ازکار رفتہ آدمی میں نظر نہیں آسکتی۔

یزید :۔ (مسکراکر) ٹھیک کہتے ہو، لیکن بوڑھے آدمی زندگی اور اقتدار کو نوجوان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

منذر :۔ بجا ارشاد ہوا۔

یزید :۔ یہ تو سیاسی باتیں شروع ہوگئیں۔ ہم تمہارے ہاں اس لئے آئے ہیں کہ ذرا دلچسپی سے وقت گزاریں نہ اس لئے کہ پریشان کن باتوں میں یہ وقت عزیز رائیگاں کردیں" یہ کہہ کر یزید نے اپنے ایک مصاحب کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے فوراً ایک غلام کی طرف دیکھا وہ غلام بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر گیا۔ اور چند منٹ کے بعد مے و ساغر لے کر حاضر ہوگیا۔ یہ چیزیں دیکھ کر یزید کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اس نے ایک گھونٹ پینے کے بعد خوشی کے عالم میں اپنے ایک دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے شغل میں مشغول ہوگیا۔ دفعتاً اس ساتھی نے امرالقیس کا ایک عریاں اور نیم فحش قصیدہ ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ یزید کا یہ عالم تھا کہ سر دھن رہا تھا۔ ہر ہر شعر پر اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ امراءالقیس سے بڑا فصیح و بلیغ شاعر عربی زبان آج تک نہیں پیدا کر سکی۔ عہد جہالت میں وہ سوقِ عکاظ میں اپنے قصیدوں کی داد وقت کے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں سے لیا کرتا تھا۔ کعبہ پر اس کے چند دوسرے شعراء کے قصیدے لٹکا دیئے گئے۔ اس لئے کہ عربی زبان ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن اسلام نے نمودار ہو کر جہاں کعبہ کے بتوں کو سرنگوں ہونے پر مجبور کردیا وہاں شعر و ادب کے نام سے امراءالقیس اور اس کے ہم مشرب شعراء نے لذت پرستی کی جو روایات قائم کر دی تھیں انہیں بھی ختم کرکے رکھ دیا۔ اسلام سے پہلے امرءالقیس سب سے بڑا شاعر تھا۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اور عریانی اور فحاشی کے اعتبار سے بھی۔ اسلام نے ایک نئے ادب کی تخلیق

کی ۔ نئے اقدار پیدا کئے۔ نئی روایات قائم کیں۔ فصاحت و بلاغت کا نیا اسلوب پیدا کیا اور بتوں کی طرح سے عریاں ادب کا بھی خاتمہ کر دیا۔ مگر یزید کے دربار میں اس کی بزم شبینہ میں، اس کی مجلس احباب میں نہ قرآن کا چلن تھا نہ حدیث کا ذکر۔ اگر چرچا تھا تو امراء القیس جیسے شاعروں کے ہیجان انگیز اشعار اور شرم سے آنکھیں جھکا دینے والی تشبیب کا۔ یزید کا معنی جو اشعار گا رہا تھا وہ اپنے سوقیانہ اور متبذل الفاظ و مفہوم کے اعتبار سے اس قابل بھی نہ تھے کہ کسی شریف آدمی کے کان میں پڑتے نہ کہ ساتھ کے کمرے میں لیلیٰ اور رقیہ بھی یہ اشعار سننے پر اور دل ہی دل میں جلنے اور کڑھنے پر مجبور تھیں آخر لیلےٰ سے ضبط نہ ہو سکا اس نے کہا۔

دیکھتی ہو رقیہ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ وہ مسند جس پر بیٹھ کر روم و ایران کی قسمت کے فیصلے کئے جاتے تھے۔ مشرق و مغرب کے معاملات کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ عربوں کو فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے اقطاعے عالم میں جہانبانی اور فرمانروائی کے لئے فوج در فوج، موج در موج، اور کارواں در کارواں روانہ کیا جاتا تھا۔ جہاں قرآن کی روشنی میں احکام صادر ہوتے تھے۔ سنتِ نبوی کی روشنی میں راہ عمل متعین کی جاتی تھی آج اس مقدس مسند پر وہ شخص بیٹھا ہے جو شراب پیتا ہے۔ فواحش کا ارتکاب کرتا ہے۔ گندے اور ننگے اشعار سنتا ہے۔ جھومتا ہے اور سر دھنتا ہے نہ زمین پھٹتی ہے نہ آسمان ٹوٹتا ہے۔ خدا جانے ان لوگوں سے قدرت کب انتقام لے گی۔ اور کب یہ کیفر کردار کو پہنچیں گے ؎

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر!

رقیہ:۔ سچ کہتی ہو بہن! مجھے تو شرم آرہی ہے یہاں بیٹھتے ہوتے۔ لیکن کیا کروں بے بس ہوں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا؟

لیلےٰ :۔ ذرا سوچو تو رقیہ! یہ سب کچھ ہو رہا ہے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔

رقیہ :۔ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ بھلا عورتیں بھی کچھ کر سکتی ہیں۔

لیلےٰ :۔ یہ نہ کہو۔ جس قوم نے خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ اور اسماءؓ جیسی عورتیں پیدا کی ہوں۔ جو دنیا کی رونق اور دین کی زینت تھیں کیا وہ بانجھ ہو گئی ہے۔

رقیہ :۔ بتاؤ تمہارے اختیار میں کیا ہے۔ تم کیا کر سکتی ہو؟

لیلےٰ :۔ میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ لیکن افسوس میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

رقیہ :۔ (مسکرا کر) کتنے مزے کی بات کہی ہے، خدا کی بندی اصل سوال تو یہی ہے۔ جب ہمارے پاس اختیار نہیں تو ہم جلنے اور کڑھنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟ کچھ نہیں سوا اس کے کہ ؎

بہت سعی کیجئے تو مر رہیے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے۔

لیلےٰ :۔ نہیں یہ بزدلی ہے۔

رقیہ :۔ تو بہادری کیا ہے؟

لیلےٰ :۔ کچھ کرنا۔ کچھ کر کے دکھانا۔

رقیہ :۔ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ ان حرکتوں پر غصہ مجھے بھی ہے۔ لیکن تمہارے چہرے کی سرخی آنکھوں کی چمک اور بدن کی لرزش سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے تم بہت زیادہ متاثر ہو۔ خدا کے لئے اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔

لیلےٰ خاموش ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ بے بس محسوس کر رہی تھی۔ دفعتہً قہقہوں کا شور بلند ہوا اور معلوم ہوا کہ ولی عہد بہادر واپس جا رہے ہیں۔ منذر بھی ان کے ساتھ ساتھ گیا۔

باب ۱۱

باغی لڑکی

یزید کو رخصت کر کے جب منذر واپس آیا تو اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا۔ رقیہ اپنے گھر واپس جا چکی تھی۔ صالح کام کاج سے فارغ ہو کر تھکا ماندہ سو گیا تھا۔ لیلیٰ باپ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ انتظار کرتے کرتے بڑی دیر ہو گئی۔ کئی بار آنکھیں جھپک جھپک گئیں۔ لیکن اس نے خواب پر بیداری کو ترجیح دی۔ منذر نے اسے بیدار دیکھ کر بڑے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹی! اب تک جاگ رہی ہے!"

(جمائی لیتے ہوئے) "اب سو جاؤں گی۔ آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

شاید کچھ ضرورت ہو اور میرے سونے کی وجہ سے آپ تکلیف محسوس کریں۔

منذر :۔ نہیں بیٹی! ایسا نہیں ہو سکتا۔ زیادہ دیر تک میرا انتظار نہ کیا کر۔ میں ٹھہرا ایک سیلانی آدمی۔ کبھی جلدی آ گیا۔ کبھی دیر میں آیا۔ میرا انتظار کر کے تو اپنے آرام میں خلل ڈالتی ہے۔ یہ مجھے پسند نہیں۔ وقت پر آؤں یا دیر سے تو سو رہا کر۔

لیلیٰ :۔ لیکن ابا جان کروں کیا۔ جب تک آپ نہ آ جائیں نیند ہی نہیں آتی۔ دل اٹکا رہتا ہے آپ میں۔

منذر :۔ میں جانتا ہوں میری بچی مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔

لیلیٰ :۔ ہر بیٹی اپنے باپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہے لیکن ہر باپ اپنی بیٹی سے اتنی محبت نہیں کرتا جتنی آپ مجھ سے کرتے ہیں۔

منذر :۔ (قہقہہ لگاکر) ہماری بیٹی سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔ ہاں بیٹی! خوب یاد آیا۔ تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اب تو تجھے نیند آرہی ہوگی۔ صبح سہی۔

لیلےٰ :۔ نہیں کوئی ایسی نیند نہیں آرہی ہے۔ فرمایئے کیا کہہ رہے تھے آپ؟

منذر :۔ تو کھڑی کیوں ہے بیٹھ کیوں نہیں جاتی؟

لیلےٰ :۔ (مسند پر بیٹھتے ہوئے) لیجئے بیٹھ گئی اب فرمایئے۔

منذر :۔ کوئی خاص بات نہیں اور غور کرو تو ہے بھی ـــــ بات یہ ہے بیٹی! کہ تم اب ماشاءاللہ جوان ہوگئی ہو۔ تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے۔ تم ایک عرب کی بیٹی ہو اور ہماری بیٹیاں اپنی زندگی کے معاملات طے کرنے میں پورے طور پر آزاد ہوتی ہیں اور ہم آزادی کو پسند بھی کرتے ہیں۔

لیلےٰ :۔ (شرماتے ہوئے) یہ تو آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن میں نے آج تک اس کا تصور بھی نہیں کیا۔ کہ آپ کے قدموں سے جدا ہو جاؤں۔ آپ کی ذات میں ماں کی محبت اور باپ کی شفقت دونوں چیزیں جمع ہیں یہ نعمت اور کہاں سے پاسکوں گی؟

منذر :۔ لڑکی پرایا دھن ہوتی ہے۔ اسے دوسرے گھر جانا ہی پڑتا ہے۔

لیلےٰ :۔ میں تو نہیں جاؤں گی۔

منذر :۔ تو ہمیشہ کی ضدی ہے۔ لیکن اس معاملہ میں ضد نہیں چلے گی۔ میرے پاس کئی پیغام آچکے ہیں۔ اور ان سب کو رد کر چکا ہوں۔ کوئی بہادر ہے مگر بدصورت کوئی خوبصورت ہے لیکن مفلس، کوئی دولتمند ہے مگر بزدل۔ میں اپنی لیلےٰ کی مرضی اور پسند سے واقف ہوں۔

ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو میری بچی کو خوش رکھ سکتا۔ اس کے ناز اٹھا سکتا۔ اس کے اعزاز اور وقار میں اضافہ کر سکتا۔

لیکن اب خوش قسمتی سے ایک ایسا پیام آیا ہے جسے میں رد نہیں کر سکتا۔ اور مجھے امید ہے تو بھی اسے خوشی سے منظور کرے گی۔

لیلے :۔ (دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ) لیکن ابا جان! اس کا نام کیا ہے! وہ کون ہے؛

منذر :۔ اس کا نام ہے یزید ـــــ سن لیا تو نے؛

لیلے :۔ (بے ساختہ) یزید!

منذر :۔ ہاں بیٹی! تو چونک کیوں پڑی؛ کتنا مبارک ہے یہ نام، کتنا اچھا ہے یہ شخص، امیر المومنین کا لخت جگر۔ عالم اسلام کا ہونے والا بادشاہ، خوبصورت، طرح دار، بانکا، بہادر، شجاع، شاعر، نکتہ سنج، ادیب اور نغز گو۔

لیلے :۔ لیکن ابا جان! یہ تعریف نامکمل ہے اس کے بہت سے خصائل کا آپ نے ذکر ہی نہیں کیا۔

منذر :۔ میں نے کوئی بات نہیں چھپائی جو کچھ جانتا تھا سب بتا دیا۔ اگر تجھے کوئی نئی بات معلوم ہو تو سن لوں گا۔

لیلے :۔ (تعجب ہے آپ جس شخص کو اتنا عزیز رکھتے ہیں جسے اتنا معزز اور محترم سمجھتے ہیں۔ جس کے گن گا رہے ہیں۔ تعریف کر رہے ہیں۔ اس کے ان خصائل سے واقف نہیں ہیں جنہیں دنیا جانتی ہے۔

منذر :۔ مثلاً ـــــ!

لیلے :۔ مثلاً شراب پیتا ہے، گانا سنتا ہے، ناچ دیکھتا ہے۔ بندر پالتا ہے، کتوں کی پرورش کرتا ہے۔ شکار کو نکل جاتا ہے تو اپنے تیر سے نہ جانے کتنے بے زبان جانوروں کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ جو عیاش ہے، غاصب ہے اسلام اور اس کے احکام و ہدایات سے جسے کوئی سروکار نہیں۔

منذر :۔ یہ تم نے کیا کہا بیٹی!

لیلے :۔ میں نے غلط نہیں کہا ابا جان۔

منذر :۔ اگر تمہاری باتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ باتیں ایک مرد کا جوہر ہیں۔ شکار وہی کھیلتا ہے جس کا دل مضبوط اور توانا ہو۔ جو بہادر اور شجاع ہو۔ عیش و عشرت

کی زندگی وہ بسر کرتا ہے جو لکھ لٹ، سخی، فیاض اور دریا دل ہو۔ رہا شراب اور رقص کا الزام۔ تو اس عمر اور اس ماحول میں کوئی فرشتہ بھی اگر ہو تو اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔

لیلیٰ:۔ کیوں نہیں بچا سکتا؟ جو شخص دامن آلودہ کر سکتا ہے وہ بچا بھی سکتا ہے۔

منذر:۔ یہ کیسی بات چھیڑ دی تم نے بیٹی ؎

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد

لیلیٰ:۔ میں نہیں سمجھی ابا جان۔

منذر:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے۔ ابھی وہ نوجوان ہے زندگی میں کسی حد تک بے اعتدالی ہے۔ عمر پختہ ہو گی تو خود بخود سنور جائے گا۔ دنیا میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔

لیلیٰ:۔ گستاخی معاف، آپ کی یہ بات کچھ دل کو نہیں لگی۔

منذر:۔ یہ کیوں بیٹی؟ میں نے تو بہت صاف اور سیدھی سی بات کہی ہے جس میں کسی طرح کا ایچ پیچ نہیں۔

لیلیٰ:۔ اسی زمانے میں دوسرے لوگ بھی ہیں۔ جوان ہونے کے باوجود جن کی زندگی تقدس اور طہارت کی زندگی ہے۔ جو نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ بے کسوں کا سہارا بنتے ہیں۔ حق اور صداقت کا ساتھ دیتے ہیں۔ باطل اور فریب سے دور رہتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔ بچوں کی صحبت میں رہتے ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ جوا نہیں کھیلتے شکار نہیں کرتے کتوں اور بندروں سے دلچسپی نہیں لیتے۔ اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی خرچ کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ اور خدا کے نام پر خدا کے حاجت مند اور تباہ حال بندوں کو اپنی جیب کی کوڑی کوڑی پائی پائی بھی ہنسی خوشی دے دیتے ہیں۔

ابا جان! کیا یہ لوگ آدمی نہیں فرشتے ہیں؟ کسی اور طرح کی مخلوق ہیں؟ کیا ان کے سینے میں دل نہیں؟ کیا ان کا دل امنگوں آرزوؤں اور حسرتوں سے

خالی ہے !

منذر :۔ (تیوری چڑھاکر) تو کن لوگوں کا ذکر کر رہی ہے ؟ ــــ کہاں ہیں ایسے لوگ ؟

لیلےٰ :۔ حسینؑ ابن علیؓ ہی کو لے لیجئے۔ دنیا مانتی ہے۔ کہ ان کی زندگی بیداغ ہے، ان کا کردار، ان کی زندگی کی طرح روشن اور تابناک ہے۔ یزید کو جو لذتیں اور آسائشیں سیم وزر کے بل پر ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ اگر وہ چاہیں تو حسنِ عقیدت کے بل بوتے پر حاصل کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے آج تک ایسا نہیں کیا۔

منذر :۔ (سنبھل کر) بیٹی! یہ سچ ہے۔ کہاں وہ کہاں یزید۔ زمین آسمان کا فرق ہے دونوں میں ہمیں ایسے فرشتہ صفت لوگ کہاں مل سکتے ہیں ؛ اور میں نہیں چاہتا کہ تیری زندگی غارت کروں۔ میں تجھے ملکہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ دنیائے اسلام پر یزید حکومت کرے اور یزید پر تیری حکومت ہو۔ جب تک میری یہ آرزو پوری نہ ہو گی مجھے قرار نہ آئے گا۔

لیلےٰ :۔ لیکن ابا جان! آپ کی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی،

منذر :۔ (ذرا بلند آواز سے) کیا کہا۔ میری یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی ؟

لیلےٰ :۔ (ایک عزم کے ساتھ) قطعاً نہیں پوری ہو سکتی!

منذر :۔ آخر کیوں ؟ (خوشامدانہ لہجہ میں) کیوں بیٹی ؟

لیلےٰ :۔ میں یزید سے نفرت کرتی ہوں۔ میں اسے اپنا رفیق زندگی نہیں بنا سکتی۔ میں کسی قیمت پر اس کی شریک حیات نہیں بن سکتی۔

منذر :۔ (غصہ کو دباتے ہوئے) کیوں! آخر کس لیے ؟

لیلےٰ :۔ اس لئے کہ وہ ننگِ انسانیت ہے، ننگِ اسلام ہے۔ میں اپنے دل میں کسی ایسے شخص کی گنجائش نہیں پیدا کر سکتی جو انسانوں کو پامال کرتا ہو۔ انسانیت کو کچلتا ہو جو اسلام سے کسی طرح کا رابطہ نہ رکھتا ہو۔

منذر :۔ (برہمی کے ساتھ) اسلام، انسانیت۔ یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ میں ایسی باتیں نہیں سننا چاہتا۔

لیلےٰ:۔ خاموش ہو جاتی ہوں۔

منذر:۔ ہاں یہی بہتر ہے۔ لیکن میرے سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔

لیلےٰ:۔ وہ میں دے چکی۔

منذر:۔ صاف الفاظ میں کیوں نہیں کہتی؟

لیلےٰ:۔ مجھے یہ رشتہ نامنظور ہے۔

منذر:۔ تو اب میں حکم دیتا ہوں اور اپنے فیصلے سے مطلع کرتا ہوں کہ یزید کے ساتھ تمہاری شادی ہو گی۔ اور ضرور ہو گی۔ دنیا کی کوئی طاقت میرے فیصلے کو بدل نہیں سکتی۔

لیلےٰ:۔ میرا فیصلہ بھی اٹل ہے اور جب تک میں زندہ ہوں اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

منذر:۔ لیلےٰ! یہ نہ بھولو کہ میں تمہارا باپ ہوں اور باپ کی فرمانبرداری اولاد پر فرض ہے کیا تمہیں انکار ہے اس سے؟

لیلےٰ:۔ نہیں، کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا اور میں تو یہاں تک کہتی ہوں کہ اگر باپ کی اطاعت فرض نہ ہوتی تو میں از خود اسے اپنے اوپر فرض کر لیتی۔ ڈر کر نہیں محبت سے۔

منذر:۔ ایک طرف یہ خیالات ہیں اور دوسری طرف عمل۔ میں کس طرح ان باتوں کو سچ سمجھ لوں۔ کان باتیں سن رہے ہیں اور آنکھ عمل دیکھ رہی ہے۔

لیلےٰ:۔ ابا جان! آپ جو حکم دیں گے۔ بسر و چشم اس کی تعمیل کروں گی۔ بشرطیکہ وہ اسلام کے احکام و ہدایات سے نہ ٹکراتا ہو۔ ساری دنیا کے مقابلہ میں آپ کو ترجیح ہے اور آپ کے مقابلہ میں خدا کو ترجیح ہے۔ آپ کے لئے ساری دنیا کو چھوڑ سکتی ہوں اور خدا کے لئے آپ کو چھوڑ سکتی ہوں۔

منذر:۔ تمہاری یہ باتیں مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا اور اگر تم انکار پر اڑی رہیں تو مجبور ہو کر سختی اور تشدد سے کام لوں گا۔

لیلیٰ :۔ سختی اور تشدد کر کے دیکھ لیجئے۔ میرا انکار قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا۔

منذر :۔ دیکھ لوں گا ـــــ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ شادی کے لیئے مقرر ہو چکی ہے۔ میں یزید کو قول دے چکا ہوں۔ وہاں تمہاری۔ شادی کی تیاریاں ہو چکی ہیں اور کل سے ان تیاریوں کا آغاز اس گھر میں بھی ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر موقع دیتا ہوں۔ غور و فکر سے کام لو۔ نادانی کی باتیں نہ کرو میں تمہاری زندگی بنانا چاہتا ہوں۔ اور تم اسے بگاڑنا چاہتی ہو۔ میں تجربہ کار ـــ جہاندیدہ آدمی ہوں۔ اور تم الھڑ اور نادان چھوکری ہو۔ جو باتیں سالہا سال کے تجربہ کے بعد میں نے حاصل کی ہیں وہ تمہیں بھی حاصل ہوں گی لیکن سالہا سال کے تجربہ کے بعد۔

لیلیٰ :۔ میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے غور و فکر کا موقع دیا۔ میری بھی یہ التماس ہے کہ اپنے فیصلے پر ایک مرتبہ پھر غور کر لیجئے ایسا نہ ہو کہ بعد میں پشیمان ہونا پڑے۔

منذر :۔ میں نے آج تک کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جس پر مجھے ندامت ہوتی ہو۔

لیلیٰ :۔ لیکن یہ فیصلہ ہی ایسا ہے جس پر بعد میں آپ نادم ہوں گے۔

منذر :۔ غلط ـــ میں نے آج تک کوئی ایسی رائے قائم نہیں کی جو مجھے واپس لینی پڑی ہو۔

لیلیٰ :۔ لیکن اباجان! یہ اتنی غلط رائے ہے کہ اسے واپس لینے کے سوا کوئی اور چارہ کار ہی نہیں ہے۔

منذر :۔ ناممکن ـــ آج تک میری کوئی خواہش ایسی نہیں ہے جو بالآخر پوری نہ ہوئی ہو۔

لیلیٰ :۔ لیکن میں آپ سے عرض کرتی ہوں کہ یہ خواہش ہرگز پوری نہیں ہوسکتی۔

منذر :۔ کون ہے جو میرے عزائم کو شکست دے دے؟

لیلیٰ :۔ خدا ـــ کیا آپ خدا کی طاقت سے انکار کر سکتے ہیں؟ کیا آپ

امیرالمومنین حضرت علیؓ کا یہ قول بھول گئے کہ عرفت ربی بفسخ العزائم
میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا؟ —— مجھے یاد پڑتا
ہے کسی موقع پر میں نے آپ ہی کے منہ سے یہ زریں مقولہ سنا تھا۔

منذر:۔ خاموش! —— میں طرح دے رہا ہوں اور تم سر چڑھتی جا رہی ہو میرے صبر و ضبط کا زیادہ امتحان نہ لو۔

لیلےٰ:۔ صبر و ضبط کا مظاہرہ تو میں کر رہی ہوں نہ کہ آپ؟

منذر:۔ میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے واقعی صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے تو آخر وقت تک کرتی رہو جب تک یزید میرا داماد نہ بن جائے۔

لیلےٰ:۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اگر یزید نے اس حیثیت سے گھر میں قدم رکھنے کی کوشش کی تو میں اسے ہلاک کر دوں گی، مار ڈالوں گی۔

منذر:۔ (بے انتہا سراسیمہ ہو کر) تو اسے ہلاک کر دے گی۔ مار ڈالے گی؟ اس کی جان لے لے گی؟

لیلےٰ:۔ (عزم کے ساتھ) ہاں میں یہ سب کچھ کروں گی۔

منذر:۔ میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ میری سکون کی دنیا تو نے تہ و بالا کر دی۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ لیلیٰ تو اتنی نافرمان —— اتنی سنگدل اور اتنی بد باطن ہو گی۔ اس کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آہ

لیلےٰ:۔ اپنی عزت بچانے کے لیۓ انسان سب کچھ کرتا ہے۔ میں بھی اپنے ناموس پر ایک غاصب اور لٹیرے کی جان لے کر قربان ہو جاؤں گی۔

منذر:۔ اُف! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کس طرح یقین کر لوں۔

لیلےٰ:۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ سب کچھ ہو کر رہے گا۔

منذر:۔ کس طرح؟ کیا کرے گی تو؟

لیلےٰ :۔ میں اسے زہر دے کر ہلاک کر ڈالوں گی۔ میں اس کے سینہ میں خنجر اتار دوں گی۔ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا کروں گی۔ اپنے ارادہ سے میں نے اس لئے باخبر کر دیا ہے کہ بعد میں آپ یہ نہ کہہ سکیں۔ میں نے بتایا نہ تھا۔ اگر آپ کو یزید کی جان عزیز ہے تو اس خیال خام کو دل سے نکال دیجئے۔ ورنہ اس کی موت کی خبر سننے کے لئے تیار رہئے۔ میرا پہلا کام اس کی جان لینا ہوگا۔

منذر :۔ بد بخت ؛ ننگِ خاندان، کاش تیرے بجائے میں کسی کتے اور سؤر کا باپ ہوتا۔ تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب میں کیا کروں ؟ یزید سے کیا کہوں جا کر ؟ کس طرح اسے بتاؤں کہ میں ایک شیطان صفت لڑکی کا باپ ہوں ؟ کمبخت تو نے تو میری جان لینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

لیلےٰ :۔ خدا اس دن کے لئے مجھے اس دنیا میں زندہ نہ رکھے۔ میں آپ پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں۔ آپ کی جان نہیں لے سکتی۔

منذر :۔ ایک طرف محبت کا یہ ڈھونگ۔ دوسری طرف نافرمانی کا یہ عالم۔ عقل کام نہیں کرتی۔ کس بات کو سچ سمجھوں اور کسے جھوٹ ؟

لیلےٰ :۔ دونوں باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔

منذر :۔ سب کچھ صحیح ہے میں غلط ہوں۔ میرے خیالات غلط ہیں۔ میرے تاثرات غلط ہیں۔ میری ہر بات غلط ہے۔

لیلےٰ :۔ یہ تو میں نہیں کہتی ابا جان۔

منذر :۔ ابا جان۔ ابا جان، آج سے نہ میں تیرا باپ ہوں نہ تو میری لڑکی۔ آج سے میں نے تجھے عاق کیا۔

لیلےٰ :۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) یہ نہ کہئے ابا جان۔

منذر :۔ پھر کیا کہوں ؟ کیا تو اس قابل ہے کہ تجھے اولاد کہہ سکوں ؟

لیلےٰ :۔ مجھے اپنی نالائقی کا اعتراف ہے۔ میں ندامت کے ساتھ اپنی نافرمانی کا اعتراف

بھی کرتی ہوں۔ لیکن آباجان ! میں نے پہلے عرض کر دیا تھا۔ دنیا سے بڑھ کر آپ ہیں۔ اور آپ سے بڑھ کر خدا۔ آپ کے لئے ساری دنیا سے منہ موڑ لوں گی اور جب خدا کا سوال ہوگا تو آپ کو چھوڑ دوں گی۔

منذر :۔ میں پوچھتا ہوں کہ تجھ پر وحی نازل ہوئی ہے کہ یزید سے شادی نہ کرنا۔ تو بار بار خدا کا نام کیوں لیتی ہے۔ اپنے نفس کا نام کیوں نہیں لیتی۔ یہ کیوں نہیں کہہ دیتی کہ یزید کے علاوہ کوئی اور شخص ہے جو تیرے دل پر قبضہ کر چکا ہے ؛ مجھے اس کا نام بتا۔

لیلٰے :۔ ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔

منذر :۔ تو جھوٹی ہے۔ جھوٹ بولتی ہے۔

لیلٰے :۔ میں خدا کو اپنی گواہی میں پیش کرتی ہوں۔ وہ دلوں کے بھید جانتا ہے اور نیت کے کھوٹ سے واقف ہے۔

منذر :۔ دیکھا جائے گا۔ ہم بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔

باب ۱۲

لیلےٰ اور رقیہ

صبح کو جب لیلیٰ سو کر اٹھی تو طبیعت بے کیف تھی۔ رات کو باپ سے جو جو باتیں ہوئی تھیں ان کا ناخوشگوار اثرات تک دل و دماغ پر طاری تھا۔ معمول کے خلاف وہ کمرے سے باہر نکلی۔ باپ کے پاس نہیں گئی۔ صالح کو روزمرہ کے کاموں کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی۔ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ منذر اس کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن وہ بھی اپنی جگہ پر اکڑا ہوا تھا۔ نہ وہ خود آیا نہ اس نے کوئی بات کہلائی۔ صالح ان تمام باتوں سے بے خبر تھا۔ اس نے معمول کے مطابق لیلےٰ سے پوچھا آج گھر میں کیا چیز پکے گی۔ لیلےٰ نے بے رخی سے جواب دیا۔ میں نہیں جانتی۔ ابا جان سے پوچھو وہ ابا جان کی خدمت میں پہنچا۔ انہوں نے نہایت برہمی کے ساتھ فرمایا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ تم جانو اور تمہارا کام۔ دونوں جگہ سے ڈانٹ کھا کر وہ برآمدے میں آکر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ آج رنگِ محفل دگرگوں کیوں ہے؟ یہی لیلیٰ تھی۔ جو گھنٹوں اور پہروں مجھ سے گھل مل کر باتیں کرتی تھی۔ آج اتنی برہم ہے۔ کہ آنکھ ملا کر بات نہیں کرتی۔ یہی منذر جس نے کبھی پلٹ کر مجھے جواب نہیں دیا۔ آج اتنا روکھا سوکھا نظر آرہا تھا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میں غلام ہوں اور وہ آقا۔

صالح اسی خیال میں غلطاں و پیچاں بیٹھا تھا۔ کہ رقیہ آگئی۔ اس نے پوچھا "لیلیٰ کیا کر رہی ہے؟ صالح نے ان دونوں کا بدلہ اس بے چاری سے لے لیا۔

اور بہت ترش لہجہ میں کہا "ہم نہیں جانتے"

رقیہ نے صالح کے اندازِ گفتگو کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔ مسکراتی ہوئی لیلے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ لیلے اسے آتا دیکھ کر ہمیشہ وفورِ مسرت سے گل نو شگفتہ کی طرح کھل اٹھتی تھی۔ مگر آج اس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ ہونٹوں پر تبسم لائے بغیر اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ آؤ رقیہ بیٹھ جاؤ۔ رقیہ بیٹھ گئی۔ پھر دونوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔

رقیہ :- کیا بات ہے؟ آج گھر کا گھر آگ بھبوکا چڑھائے ہوئے ہے؟ منذر چچا کی طرف گئی تو انہوں نے بات بھی نہ پوچھی۔ صالح سے ملاقات ہوئی تو وہ کاٹنے کو دوڑا۔ تمہارے پاس آئی تو سرد مہری دیکھ رہی ہوں جس کا کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ اس وقت تم سے مل کر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ

ان تلوں میں تیل ہی نہ تھا گویا
ہم سے اور تم سے میل ہی نہ تھا گویا

آخر یہ کیا ماجرا ہے؟

لیلے :- دوسروں کے بارے میں نہ مجھے کچھ معلوم ہے نہ کچھ کہہ سکتی ہوں، رہا میری سرد مہری کا ذکر، تو صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر میری جگہ تم ہوتیں تو شاید خودکشی کر چکی ہوتیں۔

رقیہ :- (گھبرا کر) یہ کیا کہہ رہی ہو۔ آخر بات کیا ہوئی ؟

لیلے :- یہ نہ پوچھو۔ تمہیں سن کر دکھ ہوگا اور مجھ میں بیان کرنے کی طاقت بھی نہیں کیا تم میری صورت سے بھی اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے؟

رقیہ :- ہاں میں محسوس کرتی ہوں کہ تم پریشان ہو لیکن اگر مجھے بھی اپنا ہم راز نہ بناؤ گی تو کیا تمہارا حالِ دل سننے کے لئے آسمان سے حوریں اتریں گی؟

لیلے :- ابا جان میری دنیا اور دین برباد کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اور وہ مجھ سے روٹھے بیٹھے ہیں۔

رقیہ :- انہوں نے کیا کہا تھا۔ یہ بھی تو معلوم ہو؟

لیلیٰ :۔ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔

رقیہ :۔ (ہنس کر) تو کونسا غضب ہو گیا۔ شادی تو ہو گی۔ دلہن تو بننا پڑے گا آخر انکار کی سوجھی کیا تھی؟

لیلیٰ :۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں یزید سے شادی کر لوں؟

رقیہ :۔ (تعجب سے) میں نے تو کبھی یہ نہیں کہا۔ کیا چچا جان تمہارے لئے یزید کا پیغام لائے تھے؟

لیلیٰ :۔ ہاں ــــــ بڑے فخر سے۔

رقیہ :۔ تم نے انکار کر دیا؟

لیلیٰ :۔ تو کیا اقرار کر لیتی؟

رقیہ :۔ اسی بات پر چچا جان روٹھ گئے؟

لیلیٰ :۔ ہاں اسی بات پر۔

رقیہ :۔ لیکن لیلیٰ یہ تو بتاؤ تم نے انکار کیوں کیا؟ تم جانتی ہو مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ میں کوئی غلط رائے نہیں دے سکتی۔ میری رائے ہے یزید سے شادی کر لو۔ یہ شادی تمہاری کایا پلٹ دے گی۔ تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا دے گی۔ تم کچھ سے کچھ بن جاؤ گی۔ لیلیٰ کتنی خوش قسمت ہے کہ اتنی آسانی سے اسے مجنوں مل گیا۔

لیلیٰ :۔ شکریہ، اس نوازش کا۔ لیکن اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب ناممکن ہے۔ یہ میں نہیں کر سکتی۔

رقیہ :۔ سمجھ کی باتیں کرو۔ سوچو تو یزید کون شخص ہے۔ اس کا حال کتنا روشن ہے اور مستقبل کتنا تابناک؟

لیلیٰ :۔ یہ سب درست ہے۔ مگر میں کسی قیمت پر بھی اسے اپنا رفیق زندگی نہیں بنا سکتی۔ نہ وہ اچھا انسان ہے نہ سچا مسلمان، بھلا ایسے شخص کے ساتھ میری نبھ سکتی ہے؟

رقیہ :- یزید کے بارے میں تم نے جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اگر واقعی وہ بُرا ہوتا۔ منذر چچا اس کی تعریف کیوں کرتے ؟ وہ تم سے زیادہ مردم شناس ہیں۔ وہ زمانہ کا سرد وگرم دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کی رائے پر اعتماد کرو۔

لیلیٰ :- لیکن ان کی رائے کو قیام کب ہے ؟ آج کچھ کرتے ہیں کل کچھ۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کا شمار اصحاب علیؓ میں ہوتا تھا اور آج وہ امیر معاویہ کے دست راست اور یزید کے مداح اور قصیدہ خواں نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل وہ کسی اور کے گن گانے لگیں۔

رقیہ :- میں سمجھ گئی تمہارے اختلاف کی بنیاد کیا ہے ؟

لیلیٰ :- اگر واقعی سمجھ گئی ہو تو خاموش ہو جاؤ۔ چپ نہیں رہ سکتیں تو کوئی اور باتیں کرو۔

رقیہ :- دونوں باتیں ناممکن ہیں نہ چپ رہوں گی نہ گفتگو کا موضوع بدلوں گی۔ تم نے کبھی سوچا۔ تمہاری اس روش کا منذر چچا پر کیا اثر پڑے گا ؟

لیلیٰ :- وہ تو دیکھ رہی ہوں۔ تم نے بھی ابھی دیکھ لیا۔

رقیہ :- کیا اس کے لئے تیار ہو کہ یہ گھر ایک جہنم کدہ بن جائے ؟

لیلیٰ :- تمہیں بتاؤ کیا تدبیر ہے پھر ؟ کیا کیا جا سکتا ہے آخر ؟ ابا جان اپنی ضد پر قائم ہیں۔ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔

رقیہ :- ناسمجھی کی باتیں نہ کرو۔ دشمن اگر گڑ سے مر جائے تو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔

لیلیٰ :- میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ میرے پاس نہ گڑ ہے نہ زہر۔

رقیہ :- دونوں چیزیں ہیں تمہارے پاس لیکن تم نہیں جانتی کہ ان دونوں میں سے پہلے کون سی چیز استعمال کی جائے۔ یہ میں جانتی ہوں۔

لیلےٰ :- تم جو کچھ کر سکتی ہو کرو۔ باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو؟

رقیہ :- مجھے اجازت دو کہ منذر چچا کے پاس جاؤں اور ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کروں۔

لیلےٰ :- میں تمہیں منع نہیں کرتی۔ لیکن جانتی ہوں بات بنے گی نہیں۔

رقیہ :- بن جائے گی۔ کوشش تو کر لینے دو؟

لیلےٰ :- کیا کرو گی؟ کچھ مجھے بھی معلوم ہو؟

رقیہ :- میں ان کا غصہ ٹھنڈا کروں گی۔ تمہاری طرف سے معذرت کروں گی۔ معافی مانگوں گی۔ تم سے انہیں راضی کر لوں گی۔

لیلےٰ :- کس شرط پر، ان کی پہلی اور آخری شرط یہ ہو گی کہ میں یزید سے شادی کر لوں۔

رقیہ :- میری پہلی اور آخری شرط یہ ہو گی کہ اس معاملے میں جلدی نہ کی جائے۔

لیلےٰ :- یعنی یہ تقریب اب کے بجائے کچھ عرصہ کے بعد منائی جائے؟ —— نہیں رقیہ! تم مجھ سے ہر بات منوا سکتی ہو۔ لیکن یہ بات نہیں مانوں گی نہیں مانوں گی۔

رقیہ :- ایک چیز ہوتی ہے حکمتِ عملی۔ میں نے تمہارا مطلب سمجھ لیا۔ تمہارے مزاج سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ انشاء اللہ وہی ہو گا۔ جو تم چاہتی ہو۔ لیکن مجھے اپنی سی کر لینے دو۔ تم نہیں جانتیں یہ معاملہ کتنا نازک ہے یزید سے ٹکر لینا آسان نہیں۔ وہ اگر بگڑ گیا تو نہ تمہاری خیریت ہے نہ تمہارے باپ کی۔ مجھے اصل فکر چچا منذر کی نہیں یزید کی ہے وہ بڑا کینہ پرور اور ظالم ہے۔

لیلےٰ :- گویا تم اباجان کے واسطے سے یزید کو ہموار کرنا چاہتی ہو۔

رقیہ :- ممکن ہے کہ میری اسکیم یہی ہو لیکن ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی مجھے چچا منذر سے مل لینے دو —— لیلا! تمہیں ایک راز کی بات بتاتی

ہوں۔ غور سے سنو۔

لیلےٰ :۔ سن رہی ہوں۔ کہو۔

رقیہ :۔ میں خود تمہارے پاس نہیں آئی۔ بھیجی گئی ہوں۔

لیلےٰ :۔ کس نے بھیجا ہے تمہیں ؟

رقیہ :۔ منذر چچا نے ـــــ وہ آج صبح صبح میرے گھر گئے تھے۔ انہوں نے جاتے ہی اپنی پگڑی میرے پاؤں میں رکھ دی۔ رونے لگے۔ اور کہا۔ میری زندگی تیرے ہاتھ ہے۔ اگر لیلےٰ اپنی ضد پر اڑی رہی تو میں مار ڈالا جاؤں گا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ اس کا وقت تو آہی گیا ہے لیکن یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں۔ میرے بعد لیلےٰ کا حشر کیا ہو گا ؟ اگر یزید کو اس کی بھنک بھی مل گئی کہ وہ اس رشتہ کو ناپسند کرتی ہے تو قیامت آجائے گی۔ اسی رشتہ پر میری سربلندیاں منحصر ہیں۔ یہی رشتہ لیلےٰ کا مستقبل سنوار سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو بات بھی ہے وہ ہلاکت اور بربادی کی ہے۔ تم اس کے پاس جاؤ۔ اسے سمجھاؤ اگر وہ مان جائے تو خیر اور اگر نہ مانے تو میرے بوڑھے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ بتاؤ لیلےٰ ! میں فوراً تمہارے پاس نہ آتی تو کیا کرتی ؟ کیا میں اسے گوارا کر لوں کہ تمہارا گلا گھونٹ دیا جائے۔؟

لیلےٰ :۔ یہ دھمکی مجھ پر اثر نہیں کر سکتی۔

رقیہ :۔ بڑی بہادر ہو۔ لیکن میری بہن ! بہادری کا غلط استعمال نہ کرو۔ اپنے الفاظ واپس لو۔ اور مجھے کام کرنے کا موقع دو۔

لیلےٰ :۔ کیا کرو گی تم ؟

رقیہ :۔ اسے مجھ پر چھوڑ دو۔ میں انہیں شیشے میں اتار لوں گی۔ کچھ دنوں تک معاملہ گومگو میں رہے گا۔ پھر جیسا موقع ہوگا دیکھا جائے گا۔ اور مجھے یقین ہے

وہی ہوگا۔ جو تمہاری رائے ہے۔ لیکن خوش اسلوبی کے ساتھ۔ بتاؤ لیلیٰ مجھے ہے اجازت ؟

لیلےٰ:۔ میں نہیں جانتی۔ تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔

رقیہ چلی گئی۔

باب ۱۳

لیلےٰ چلی پردیس کو

لیلےٰ کے طرزِ عمل نے منذر کو عجیب خلجان میں مبتلا کر دیا تھا ــــــــ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ اس کے انکار نے سارا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ اس نے سوچا تھا۔ لیلےٰ کے واسطے سے عروج وارتقا کی منزلیں طے کرے گا۔ اتنا اونچا اڑے گا کہ دوست اور ساتھی حیرت سے دیکھتے رہ جائیں گے۔ لیکن اب پگڑی سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ کتنے فخر کے ساتھ اس نے یزید کا پیغام منظور کیا تھا اور کتنی بے بسی کے ساتھ اپنی امیدوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ یہی سوچ کر وہ رقیہ کے پاس گیا تھا۔ رقیہ اس کے ایک گہرے دوست کی بیٹی تھی۔ لیلیٰ کی سہیلی تھی۔ وہ منذر کا ادب واحترام باپ کی طرح کرتی تھی اس کی سعادت مندی سے منذر کو امید تھی کہ کسی نہ کسی طرح لیلیٰ کو شیشہ میں اتارے گی۔ بگڑا ہوا کام بن جائے گا۔ اس کے انتظار میں بیٹھا گھڑیاں گن رہا تھا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ کمبخت لیلیٰ کے پاس کیوں بیٹھی رہی؛ اب تک آئی کیوں نہیں۔ اسی اثناء میں کسی کی چاپ سنائی دی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو رقیہ سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بیتابی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

بہت دیر لگا دی تم نے۔ کتنی دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ کہو کیا خبر لائیں۔ کمبخت لیلےٰ رام ہوئی یا نہیں؛ کاش اس کی بجائے تم میری بیٹی ہوتیں۔

رقیہ :۔ (مسکرا کر) اگر ایسا ہوتا یعنی لیلےٰ کے بجائے میں آپ کی لڑکی ہوتی تو بھی آپ خوش نہ ہوتے۔ میرا جواب بھی وہی ہوتا جو لیلےٰ کا ہے میں بھی یزید سے نفرت کرتی ہوں۔

منذر :۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ خدا کے لئے یہ بتاؤ لیلےٰ نے کیا کہا۔ سوال یزید کے اچھے اور بُرے ہونے کا نہیں۔ میری زندگی اور موت کا ہے۔ میرے ناموس اور میرے وقار کا ہے۔ اگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر یہ معلوم ہوتا کہ لیلےٰ اس طرح کی باتیں کرے گی تو میں ہرگز یزید کا پیام قبول نہ کرتا لیکن اب تو غلطی ہو چکی۔ بڑے بوڑھوں سے اگر غلطی ہو جائے تو چھوٹوں کی سعادت مندی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اسے نبھائیں۔

رقیہ :۔ لیکن چچا جان! اگر آپ لیلیٰ کی شادی کسی بدصورت، گنوار، جاہل، مفلس، اور ناتراشیدہ آدمی سے کرنا چاہتے تو یقین کیجئے لیلیٰ چپ چاپ اس کی دلہن بن کر اس گھر سے رخصت ہو جاتی وہ اپنے نفس اور ذات کے لئے ہر طرح کا ایثار کر سکتی ہے لیکن عقیدہ اور مذہب کو نہیں بدل سکتی۔ اصل مشکل یہ ہے۔

منذر :۔ تم میری وکیل بن کر گئی تھیں یا لیلیٰ کی ترجمان بن کر آئی ہو؟

رقیہ :۔ (زیرِلب تبسم کے ساتھ) دونوں باتیں ہیں چچا جان! اس کے پاس آپ کی وکیل بن کر گئی تھی۔ آپ کے پاس اس کی ترجمان بن کر آئی ہوں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر سچے ہیں۔ یہ پیام قبول کر کے آپ جس مصیبت میں پھنس گئے ہیں اسے دیکھ کر مجھے آپ پر ترس آنے لگتا ہے۔ لیکن لیلیٰ کا حال زار دیکھ کر بھی آنسو روکے نہیں رکتے۔ وہ بھی بہت مجبور ہے۔

منذر :۔ بہر حال اب سوچنا یہ ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ میں نے اپنی سب سے قیمتی پونجی داؤ پر لگا دی ہے۔

رقیہ :۔ جتنا اسے سمجھا سکتی تھی سمجھایا لیکن ______

منذر :۔ وہ راہ راست پر نہیں آتی۔ شاید تمہارا یہی مطلب ہے؟

رقیہ :۔ بات تو یہی ہے لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ مہلت دیجئے۔

منذر :۔ ڈیڑھ مہینے کی مدت میرے پاس ہے۔ میں یزید کو قول دے چکا ہوں کہ ڈیڑھ مہینے کے اندر اپنے انتظامات مکمل کر لوں گا۔ بڑی مشکل سے وہ مانا ورنہ وہ تو اس پر اڑا ہوا تھا کہ آج ہی یہ تقریب انجام پا جائے۔

رقیہ :۔ چچا جان ہتھیلی پر سرسوں جمانا مجھے نہیں آتا۔ لیلیٰ کو بار بار سمجھانا پڑے گا۔ نشیب و فراز بتانا پڑیں گے۔ مصلحت اور اقتضائے وقت کا واسطہ دینا پڑے گا تب جا کر وہ راضی ہوگی۔ اس کام کے لئے ڈیڑھ ماہ کی مدت بہت کم ہے۔

منذر :۔ پھر کیا عمر نوح درکار ہے اسے راضی کرنے کے لئے؟

رقیہ :۔ جی نہیں۔ کم سے کم تین چار مہینے کی مدت چاہیئے۔ کہے دیتی ہوں جتنا زیادہ اس پر تشدد ہوگا اتنی ہی وہ اپنے انکار میں سخت ہوتی جائے گی۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی خواہش پوری ہو تو اس کے سامنے یزید کا نام بھی نہ لیجئے۔ اپنا طرزِ عمل بدل لیجئے۔ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہونے دیجئے۔ کہ آپ اس سے خفا ہیں وہ نادان اور ناسمجھ ہے آپ جہاندیدہ اور تجربہ کار ہیں وہی غلطی نہ کیجئے جو وہ کر رہی ہے۔ آگے آپ جانیں اور آپ کا کام۔

منذر :۔ سب کچھ کروں گا بشرطیکہ تم اسے راضی کر لو؟

رقیہ :۔ راضی کر لوں گی۔ میری بات پر اعتبار کیجئے۔ مجھے اپنی لیلےٰ پر بھروسہ ہے۔

منذر :۔ تم پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ لیکن لیلےٰ پر کیسے بھروسہ کروں؟

نہ بہ زاری ، نہ بہ زورے ، نہ بہ زری آید

رقیہ :۔ ایک بات اور بھی آپ سے کہنا چاہتی ہوں۔

منذر :۔ ضرور کہو۔ سوچنے اور تمہید اٹھانے کی ضرورت نہیں؟

رقیہ :۔ دو چار دن میں ابّا جان کوفہ جا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی آپ جانتے ہیں میری بہن سلمٰی کی شادی وہیں ہوئی ہے۔

منذر :۔ ہاں، خوب جانتا ہوں۔ لیکن تم لوگ وہاں کیوں جا رہے ہو ؟

رقیہ :۔ سلمٰی کی طبیعت خراب ہے۔ ماں کی محبت آپ جانتے ہیں کیا ہوتی ہے! اماں کو جب سے خبر ملی ہے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہیں۔

منذر :۔ سلمٰی بڑی پیاری لڑکی ہے۔ بہت نیک اور سعید، یہ خبر سن کر تو میں پریشان ہو گیا ہوں۔ تمہاری ماں کا جو عالم بھی ہو کم ہے ——— کب جا رہے ہو تم لوگ ؟

رقیہ :۔ تین چار روز میں ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

منذر :۔ میں سمجھ گیا۔ دو تین مہینے سے پہلے تمہاری واپسی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے تم نے اتنی لمبی مہلت مانگی ہے۔ لیکن رقیہ اگر تمہیں دیر لگ گئی تو کیا ہو گا۔ تمہارے سوا کون ہے جو لیلےٰ کو سمجھا سکے ؟ وہ کمبخت کسی اور سے بات بھی نہیں کرتی۔

رقیہ :۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ لیلےٰ میرے ساتھ جائے ؟

منذر :۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ ——— بالکل ناممکن !

رقیہ :۔ اگر نہیں ہو سکتا تو میں کوئی ذمہ داری بھی نہیں لے سکتی۔

منذر :۔ ارے یہ کیوں ؟ تم تو خفا ہو گئیں۔

رقیہ :۔ آپ نے دفعتاً لیلےٰ کے سامنے یزید کا ذکر کر کے اسے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ اس ماحول میں رہ کر اس کا صدمہ اور بڑھے گا اور اسی تناسب سے ضد بھی بڑھتی جائے گی۔ لیکن اگر وہ میرے ساتھ کوفہ چلی گئی تو ماحول بدل جائے گا۔ فضا بدل جائے گی۔ صدمہ کم ہو جائے گا یزید کا تصور جو اس وقت اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اس گھر میں یا وہ ہے یا آپ۔ صالح تو کسی شمار قطار میں نہیں۔ آپ اسے دیکھیں گے تو اس کی نافرمانی

یاد آجائے گی وہ آپ کو دیکھے گی تو پچھلی تلخیاں تازہ ہوجائیں گی۔ وہ بھی ایک گھٹن سی محسوس کرتی رہے گی۔ آپ بھی ایک چبھن سی محسوس کرتے رہیں گے۔ لیکن کوفہ میں نئے لوگ ہوں گے۔ نیا خاندان ہوگا۔ نئی آب وہوا ہوگی۔ نیا ماحول ہوگا۔ نئے حالات ہوں گے۔ اس کی طبیعت بہل جائے گی۔ اس کا خیال بٹ جائے گا۔ اس کے دل کا بوجھ اتر جائے گا وہ آزادانہ طور پر۔ گفتگو کر سکے گی۔ سوچ سکے گی۔ رائے قائم کر سکے گی۔ آپ ہی بتایئے ان دونوں صورتوں میں کون سی صورت حصول مقصد کے لئے زیادہ موزوں ومناسب ہے۔ یہاں رہنا یا وہاں رہنا۔

منذر:۔ بات تو معقول ہے لیکن مجھے غور کر لینے دو۔

رقیہ:۔ شوق سے غور کیجئے۔ لیکن جاتے جاتے پھر کہتی ہوں کہ اگر مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو لیلےٰ کی عارضی جدائی قبول کر لیجئے۔ اسے میرے ساتھ جانے دیجئے۔ وہاں میں اس سے ایسی بات بھی منوا سکتی ہوں جو بظاہر ناقابلِ قبول ہو اور یہاں کسی بات پر بھی اسے رضامند نہیں کیا جا سکتا۔

منذر:۔ تو میں کب منع کرتا ہوں۔ لے جاؤ۔

رقیہ:۔ یہ آپ کا بڑا مبارک فیصلہ ہے۔ اور مجھے امید ہے اس کا نتیجہ خوش آئند اور خوشگوار ہوگا۔

منذر:۔ خدا کرے۔ ایسا ہی ہو —— میری تو عقل ماری گئی۔ اس چھوکری نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ جب تک یہ راضی نہیں ہو جاتی میرے اضطراب اور تشویش میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

رقیہ: اس کا علاج تو میں نے سوچ لیا ہے چچا جان! آپ مجھے شاباش تو دیتے نہیں۔ کیسی دور کی کوڑی لائی ہوں —— بس اپنا دکھڑا روئے جا رہے ہیں۔

منذر:۔ تو اگر میری جگہ ہوتی تو تیرا بھی یہی حال ہوتا جو میرا ہے۔

رقیہ:۔ نہیں چچا جان! یہ نہ کہئے۔ میں اگر آپ کی جگہ ہوتی تو اس فیصلہ پر لیلےٰ کو پیار کرتی۔

انعام دیتی اور اس کے وجود پر فخر کرتی۔ مجھ سے آپ کا اترا ہوا چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ محض اس لیئے کہ اس بڑھاپے میں آپ کے قلب کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ ایک غلط کام کا میں نے بیڑہ اٹھایا ہے۔

منذر:۔ بیٹی! تم جو کچھ کہتی ہو سچ ہے۔ میں بحث نہیں کر سکتا۔ التجا کرتا ہوں اپنی بات پر قائم رہنا۔ میری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔

رقیہ:۔ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

وہ جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب

باب ۱۴

کوفہ

اور واقعی تیسرے روز رقیہ کا چھوٹا سا قافلہ دمشق سے کوفہ کی طرف چل پڑا۔ کوفہ بڑا آباد اور پررونق شہر تھا۔ لیکن دمشق کی سی سرسبزی شادابی رعنائی وزیبائی۔ گہما گہمی اور چہل پہل کہاں؟ کوفہ کی حدود میں جب یہ قافلہ داخل ہوا تو لیلےٰ نے رقیہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

بڑی تعریف کیا کرتی تھیں تم کوفہ کی۔ یہی ہے تمہارا کوفہ ——— کہاں ہمارا دمشق، کہاں یہ شہر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک آباد اور بارونق شہر سے اٹھ کر ایک ویرانہ میں آ گئے۔

رقیہ مسکرانے لگی۔ پھر اس نے لیلےٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،

"تم نے ابھی کوفہ دیکھا کہاں ہے۔ یہ در و دیوار، یہ گلیاں، یہ کوچے، یہ سڑکیں، یہ عمارتیں، یہ باغ یہ صحرا۔ یہ آبادی، یہ ویرانی ——— غرض طرح طرح کے جلوے چشم زدن میں جو یہاں دیکھ رہی ہو اس کا نام کوفہ نہیں۔

لیلےٰ :- پھر کیا ہے! ——— کیا کوفہ آگے آئے گا؟

رقیہ :- کسی شہر کی اصل چیز اس کے مظاہر نہیں ہوتے۔ وہاں کی آبادی ہوتی ہے۔

لیلےٰ :- میں سمجھ گئی۔ واقعی بڑے پتے کی بات کہی تم نے۔ شاید کوفہ کے آدمی اپنی شکل وصورت، وضع قطع، طور طریقے میں دمشق کے لوگوں سے جدا ہوتے ہوں گے، کیوں یہی نا؟

کیا فائدہ ؟

رقیہ :۔ وہ اختلاف یہ ہے کہ دمشق کے لوگ طبعاً امن پسند اور عافیت کوش ہیں۔ وہ ہنگامہ آرائی سے مجتنب رہتے ہیں۔

لیلےٰ :۔ اور کوفہ کے لوگ ؟

رقیہ :۔ اور کوفہ کے لوگ مردِ میدان ہیں۔ جیالے اور نڈر ہیں، آزاد اور بے باک ہیں نہ طوفان سے ڈرتے ہیں نہ قیامت کو خاطر میں لاتے ہیں۔ جس بات پر اڑ جاتے ہیں اسے کر کے رہتے ہیں۔ راستہ کی دشواریوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ بڑی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے حاکم وقت سے دبتے نہیں۔ لڑنے مرنے بلکہ کٹ مرنے کو تیار رہتے ہیں ـــــ کیا یہ کوئی معمولی بات ہے ؟ کیا یہ کوئی معمولی فرق ہے ؟

لیلےٰ :۔ یہ بات ہے تو پھر کوفہ کے لوگ بہت اچھے ہیں۔

رقیہ ہنسنے لگی۔ اسی اثناء میں سلمیٰ کا گھر آگیا۔ سلمیٰ بڑے چاؤ سے ملی۔ رقیہ اور لیلےٰ کو اس نے گلے لگا لیا۔ بہت بیمار ہوگئی تھی۔ اب رو بصحت تھی لیکن کمزور بہت تھی۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ لہٰذا پہلے تو آنسوؤں نے خیر مقدم کی رسم انجام دی۔ پھر باتیں شروع ہوئیں سلمیٰ نے محبت بھری نظروں سے لیلےٰ کو دیکھ کر کہا۔

" پورے چار سال کے بعد آج میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ تم تو بالکل بھول گئیں۔ میں جب وہاں سے چلی تھی تو تم ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اور اب دیکھتی ہوں تو ماشاءاللہ ایک قبول صورت اور قیامت خیز دوشیزہ ہو "

لیلےٰ نے شرما کر گردن جھکا لی۔ رقیہ نے جواب دیا۔

" صرف قبول صورت اور قیامت خیز نہیں، ہنگامہ خیز بھی "

سلمیٰ :۔ (مسکرا کر) کیا مطلب ؟ تم میری لیلےٰ پر الزام لگا رہی ہو حالانکہ نہ وہ بات کرنا جانتی ہے نہ لڑنا۔ لیکن تو ہمیشہ کی شریر ہے۔ مفت میں چھیڑ رہی ہے

رقیہ :۔ ہاں میرا مطلب یہی تھا۔
لیلےٰ :۔ لیکن میں تو کوئی فرق نہیں دیکھتی جیسے دمشق کے لوگ ہیں ویسے ہی یہاں کے نظر آتے ہیں سچ پوچھو تو دمشق کے لوگ کہیں زیادہ شاندار، وجیہہ اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں تو عجیب طرح کا اکھڑپن سا نظر آتا ہے۔
رقیہ :۔ ہاں۔ یہاں کے لوگوں کی یہی خاصیت ہے۔
لیلےٰ :۔ واہ بڑی اچھی خصوصیت ہے اگر یہ تعریف ہے تو پھر ہجو کیا ہوگی ؟
رقیہ :۔ تم نری بے وقوف ہو ـــــ خدا کی بندی، کوفہ کے لوگ دمشق کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔
لیلےٰ :۔ لیکن وہ اختلاف کیا ہے ؟ یہ بھی تو بتاؤ۔
رقیہ :۔ سب سے بڑا اختلاف طبیعت کا ہے۔ دوسرا بہت بڑا اختلاف فکر و خیال کا ہے۔ فکر و خیال کا اختلاف یہ ہے کہ یہاں کے لوگ امیر معاویہ سے گزشتہ ہیں۔ محب اہل بیعت ہیں۔ علی رضی مرتضےٰ کے جان نثاروں کی فوج اب تک یہاں موجود ہے۔
لیلےٰ :۔ لیکن وہ علی رضی پر سَب و شتم کو روک نہیں سکتی جو ہر مسجد میں ہوتا رہتا ہے۔
رقیہ :۔ اس سَب و شتم کو روکنے کے لئے سب سے پہلی قربانی یہیں کے ایک مردِ بزرگ اور مرد مومن حضرت حجر بن عدی نے دی تھی۔ جو صحابئ رسول تھے جن کی منزلت کے سامنے سب سر تسلیم خم کرتے تھے۔ دمشق میں تو ایک آواز بھی مخالفت میں بلند نہیں ہوئی۔
لیلےٰ :۔ اچھا مان لیا ـــــ یہ تو ہوا فکر و خیال کا اختلاف اور مزاج و طبیعت کا اختلاف کیا ہے جس کا تم ذکر کر رہی تھیں۔
رقیہ :۔ یہ اختلاف بھی بہت بڑا اور گہرا ہے۔
لیلےٰ :۔ وہی تو میں پوچھ رہی ہوں۔ کچھ کہو بھی تو۔ خالی خولی باتیں کرنے سے

عزیب کو۔

رقیہ :۔ نہیں آپا! میں غلط نہیں کہتی۔ یہ بڑی حضرت ہیں ـــــ ان کے کاٹے کا منتر نہیں۔

سلمیٰ :۔ تو آخر کیا کیا ہماری لیسلے نے؟ کیوں خواہ مخواہ کی بکواس کر رہی ہو؟ اس بے زبان لڑکی کے بارے میں؟

رقیہ :۔ آپ کے حسنِ ظن کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں۔

سلمیٰ :۔ اگر ہر ایک سے حسنِ ظن میں مبتلا ہو جاتی ہوں تو تیری بابت میری رائے خراب کیوں ہے؟

رقیہ :۔ مجھ سے تو آپ ہمیشہ جلتی ہیں۔

سلمیٰ :۔ (ہلکے سے پیٹھ پر دو ہتڑ مار کر) یہ لو میں تجھ سے جلتی ہوں۔ اچھا دیکھ۔ ابا جان سے کیسا نمک مرچ لگا کر تیری شکایت کرتی ہوں۔

لیسلے :۔ ہاں آپا، یہ انہی سے ٹھیک ہو گی۔ مجھے تو واقعی اس نے پریشان کر دیا ہے۔

رقیہ :۔ میں نے پریشان کر دیا ہے؟ ـــــ اپنے کو بھول گئیں؟ ـــ کہہ دوں ساری رام کہانی؟

لیسلے :۔ میری رام کہانی ہی کیا ہے جو کہو گی؟ یوں جھوٹ بولنے کو جو چاہو کہہ ڈالو۔ میں کوئی تمہاری زبان تو پکڑ نہیں سکتی ـــــ اختیار ہے تمہیں۔

رقیہ :۔ قسم لے لو جو ایک بات بھی جھوٹ کہوں؟

سلمیٰ :۔ تو آخر وہ بات کیا ہے جس کا بار بار اشاروں ہی اشاروں میں ذکر ہو رہا ہے؟

رقیہ :۔ (مصنوعی سنجیدگی طاری کر کے) کچھ نہیں۔ صرف ہمارے منذر چچا کی زندگی اجیرن کر دی ہے انہوں نے! ـــ خدا جانتا ہے خودکشی تک کرنے پر تیار ہو گئے تھے اور اس خوبصورت سی گڑیا کا گلا گھونٹنے کو بھی۔ وہ تو کہو میں یہاں بھگا لائی اسے تب جان بچی۔

سلمےٰ :۔ (خیریت سے) یہ کیا کہہ رہی ہے تو؛

رقیہ :۔ اب ضبط نہیں ہو سکتا۔ کہنا ہی پڑے گا سب کچھ!"

اور پھر رقیہ نے لیلیٰ کی ساری کہانی از اوّل تا آخر سنا دی۔

سلمیٰ بڑے غور اور توجہ سے داستان سنتی رہی۔ لیلیٰ بھی ہمہ تن گوش بنی اپنی داستان سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں مسکرا بھی دیتی۔ کبھی سنجیدہ بن جاتی۔ داستان جب ختم ہوگئی تو سلمےٰ نے لیلےٰ سے کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہے دو آدمی آتے دکھائی دیئے۔ انہیں آتا دیکھ کر سلمےٰ اور اس کے ساتھ رقیہ اور لیلیٰ کھڑی ہوگئیں۔ ان میں ایک ذرا پختہ عمر کا تھا یہ سلمیٰ کا شوہر اسلم تھا۔ دوسرا بالکل نوجوان تھا۔ یہ اس کا چھوٹا بھائی ربیع تھا۔

باب ۱۵

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ!

سلمیٰ کے گھر میں بے انتہا دلچسپ اور محبوب شخصیت ربیع کی تھی۔ وہ ابھی بالکل نوجوان تھا۔ مشکل سے ۲۳/۲۴ سال کی عمر ہوگی۔ نہایت خوب رُو اور خوش اندام۔ خوش وضع اور خوش اطوار، ہنس مکھ اور بذلہ سنج، یار باش اور مجلس طراز۔ جب وہ گھر آجاتا تو رونق اور گہما گہمی کی کیفیت سارے گھر پر طاری ہو جاتی ممکن نہ تھا کہ وہ آئے اور گھر کی فضا قہقہوں اور چہچہوں سے نہ گونجنے لگے۔ وہ کسی کی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ نہ اس کی بات سے کوئی رنجیدہ ہوتا تھا۔ روتوں کو ہنسانا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس کی گفتگو میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ جو سنتا تھا اسی کا ہو رہتا تھا۔ ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی۔ کہ وہ پاک دل پاک نظر، پاک گفتار اور پاک کردار تھا۔ نماز کا پابند۔ صلہ رحمی پر عامل، دکھیاروں کا مددگار۔ مظلوموں کا پاسبان دوستوں کا دوست۔ دشمنوں کا ہمدرد، اس کے دل میں کسی کے خلاف نفرت نہیں تھی۔ وہ سب کا بھلا چاہتا تھا۔ سب کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا چاہتا تھا۔

لیلےٰ جب گھر سے چلی تھی تو بہت افسردہ اور مضمحل تھی۔ منذر نے اس کے سامنے ایک ایسا مہیب مسئلہ کھڑا کر دیا تھا کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئی تھی — حالات اتنے دگرگوں ہو گئے تھے کہ اگر یہ کیفیت کچھ روز اور قائم رہتی تو شاید وُہ خودکشی کر لیتی۔ لیکن خضرِ راہ بن کر رقیہ اس کے سامنے پہنچی اور خوش خبری سنائی کہ چچاجان

نے تمہیں میرے ساتھ کوفہ جانے کی اجازت دے دی ہے" پہلے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ ایسی اَن ہونی بات ہو سکتی ہے۔ یہ بات کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ دفعتاً اور اچانک کوئی ایسی بات رونما ہو جاتی ہے۔ جو ہوتی تو آرزو کے مطابق ہے۔ لیکن بظاہر اس کے پورے ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب رقیہ نے اسے کوفہ کے لئے سامانِ سفر تیار کرنے کا مطالبہ کیا تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی لیکن اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے رقیہ سے کہا۔ "چھیڑ چھاڑ کے لیئے ایک میں ہی رہ گئی ہوں۔ ویسے ہی کون سے سکھ میں ہوں۔ جو تم جلانے کڑھانے کے لیئے آگئیں؟" رقیہ نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ہے۔ پھر تو یقین کرنا ہی پڑا اور وہ خوش خوش کوفہ جانے کے لیئے تیار ہو گئی۔

وہ بڑی خوشی سے کوفہ کی سمت بڑھ رہی تھی لیکن دل تھا۔ کہ ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ بار بار یہ خیال آتا تھا کہ دمشق واپس آنے کے بعد پھر وہی یزید کا سوال اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس وقت کیا ہوگا؟ اس وقت تو رقیہ مجھے اپنے ساتھ لے آئی لیکن کب تک وہ میرا سہارا بنی رہے گی؟ کوفہ میں سلمٰے اس سے بڑی محبت اور اپنایت کے ساتھ ملی تھی۔ اسلم کا برتاؤ بھی اس کے ساتھ وہی تھا جو بڑے بھائی کا چھوٹی بہن کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن اس خوش خلقی اور تپاک کے باوجود اس کے دل کی کلی مرجھائی رہتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ سوچ میں پڑجاتی۔ سوچنے لگتی اب کیا ہوگا!

اور جیسے ہی یہ خیال آتا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

لیکن ربیع سے جب ملاقات ہوئی۔ اس کی باتیں سننے کا۔ اس کی کیف آور اور نشاط آفریں مجلس میں بیٹھنے کا جب موقع ملا سب کچھ بھول گئی ہر پریشانی، ہر اندوہ سے خود بخود نجات مل گئی۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پر کبھی آسمان نہ تھا

وہ تمام کلفتوں کو یکسر فراموش کر چکی تھی۔ واقعی یوں محسوس کر رہی تھی جیسے نہ کوئی صدمہ تھا نہ غم، نہ پریشانی نہ فکر۔ ربیع کی باتیں ہی اسی طرح کی ہوتی تھیں۔

انسان کی فطرت کچھ ایسی واقعہ ہوئی ہے کہ جس کسی سے سہارا ملتا ہے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بڑھتا ہے۔ اس سے اپنایت سی محسوس کرنے لگتا ہے۔ جہاں غم ہلکا ہو وہاں اوبدا کے پہنچتا ہے۔ شراب اسی لئے پیتا ہے کہ غم دوراں بھول جائے۔ غم عشق فراموش کر دے۔ نشاط و مسرت اور کیف و سرور کی دنیا میں پہنچ جائے۔ لیلیٰ اگر ربیع کی طرف لپکتی تھی تو صرف اسی لئے کہ اس کا دل صاف تھا۔ اس کے خیالات پاک تھے اس کے انداز میں معصومیت تھی۔ وہ ربیع کی طرف اس طرح لپکتی تھی جیسے پیاسا پانی کی طرف، اس کے پاس پہنچ کر اس کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں سن کر وہ تھوڑی دیر کے لئے اس وقت تک کے لئے جب تک وہ نظروں کے سامنے رہتا یہ محسوس کرنے لگتی تھی۔ جیسے وہ کبھی مغموم اور افسردہ، دلگیر اور پریشان ہو ہی نہیں سکتی۔ اب تک وہ جو محسوس کر رہی تھی وہ غلط تھا بالکل غلط۔ اب جو کچھ محسوس کر رہی ہے۔ وہ صحیح ہے۔ وہی درست اور موزوں ہے۔
ربیع بھی لیلیٰ کی کیفیت محسوس کرتا تھا۔

بار بار اس نے اپنی بزمِ خلوت یعنی نہاں خانۂ قلب میں بیٹھ کر سوچا۔ اس لڑکی کی کیفیت کیا ہے؟ یہ کچھ بجھی بجھی سی گھٹی گھٹی سی کیوں نظر آتی ہے؟ جب بھی باہر سے آیا ہوں اور میں نے اچانک اسے دیکھا ہے تو ایسا پایا ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطے کھا رہی ہے۔ کچھ سوچ رہی ہے چہرے کی افسردگی، ماتھے کی شکن، اندازِ سنجیدگی۔ یہ سب چیزیں اس بات کی غمازی۔

کرتی ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ کوئی فکر ہے جو اسے گھلا رہی ہے کوئی اندیشہ ہے۔ جو اس کی جان لے رہا ہے۔ کوئی وحشت ہے جو اس پر طاری ہے کوئی خوف ہے جو اس کے دل و دماغ پر مسلط ہے۔ مجھے دیکھ کر یہ شگفتہ ہو جاتی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ میری باتوں سے لطف لیتی ہے خود آکر بیٹھ جاتی ہے۔ اور میری باتوں میں شریک ہو جاتی ہے۔ لیکن میں ہٹا اور اس چاند کو بادلوں نے ڈھک لیا آکر۔

کئی مرتبہ ربیع نے سوچا لیلے کے حالات کی کرید کرے سلطے سے پوچھے رقیہ سے دریافت کرے۔ خود لیلے سے ایک دن سوال کر ڈالے۔ کہ جناب آپ ویسے تو بڑی ہنس مکھ اور زندہ دل نظر آتی ہیں لیکن اس وقت تک جب تک ہماری مجلس رہتی ہے۔ باہر سے جب کبھی آیا ہوں میں نے آپ کا چہرہ اترا ہوا دیکھا ہے آخر اس کی کوئی وجہ۔ کوئی سبب، کوئی علت؟

لیکن یہ خیالات دل میں آتے تھے اور دل ہی میں نظمیں بنا کر چپ چاپ پڑ رہتے تھے۔ زبان کی سرحد تک آنے کی کبھی جرأت نہ کرتے تھے۔ بعض دفعہ ایسا ہوا کہ اس نے فیصلہ کر لیا آج سلطے سے باتیں اسی موضوع پر کروں گا لیکن اس فیصلہ پر کوشش کے باوجود عمل نہ کر سکا۔ نہ جانے کیوں ہمت نہ پڑی؛ سوچا اور سوچ کر رہ گیا۔ ہائے مجبوریاں محبت کی!

کبھی ربیع کے دل میں یہ خیال بھی آتا کہیں آتش فرقت میں تو نہیں جل رہی ہے؛ کسی سے محبت تو نہیں کرتی؟

کسی سے محبت کرنے کا خیال جیسے ہی اس کے دماغ کے پردہ سے ٹکراتا وہ بے قابو ہو جاتا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ اور وہ جلد از جلد اس خیال کو اپنے گوشۂ دل سے نکال باہر کر دیا۔

وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا کہ لیلے کسی سے محبت کر سکتی ہے یا اس کی شادی ہو چکی ہے وہ اپنے آپ کو غلط فہمی میں رکھنا چاہتا تھا— غلط فہمی

میں مبتلا رہنا اس سے کہیں بہتر تھا کہ حقائق کی دنیا میں پہنچ جاتا اور یہ معلوم کر لیتا کہ لیلیٰ کسی اور کی ہو چکی ہے۔ وہ میری نہیں ہو سکتی اس خیال کو میں اپنے دماغ تک آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ربیع بالکل غیر محسوس طور پر لیلےٰ سے محبت کرنے لگا تھا۔

باب ۱۶

دِل سے دِل تک

کوفہ آنے کے بعد سے لیلےٰ کی طبیعت بہت سنبھل گئی تھی۔ وہ اب ہنستی تھی، مسکراتی تھی۔ گھر کی دلچسپیوں میں حصہ لیتی تھی۔ رقیہ اور اس کی بہن سلمیٰ سے گھنٹوں اور پہروں مختلف عنوانات پر باتیں کیا کرتی تھی۔ اور جب ربیع پہنچ جاتا اور بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتا تب تو رنگِ محفل ہی بدل جاتا تھا۔ سب ہی پر نشاط و سرخوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ لیکن لیلےٰ کی حالت تو سب سے جداگانہ نظر آتی تھی۔ گویا ؎

جان تندر دینی بھول گئی اضطراب میں

ایک روز حسبِ معمول محفل جمی ہوئی تھی۔ سلمیٰ، رقیہ اور لیلےٰ ہنسی اور دل لگی کی باتیں کر رہی تھیں کہ یکایک اسلم آگیا۔ اسے دیکھ کر سلمےٰ اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس کے ساتھ چلی گئی۔ رقیہ بھی تھوڑی دیر بیٹھی پھر وہ بھی کسی کام سے اٹھ کر چلی گئی۔ کچھ دیر تک لیلےٰ خاموش بیٹھی رہی پھر اس کا جی اکتایا تو وہ بھی اٹھی اور اپنے کمرہ کی طرف جانے لگی۔ راستہ میں ربیع کا کمرہ پڑتا تھا۔ وہ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ ربیع اور لیلےٰ دونوں کا دل دھڑکنے لگا۔ لیلےٰ جاتے جاتے ٹھٹک گئی اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بیٹھے لیکن بیٹھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کیوں بیٹھے؟ ربیع کا بھی جی چاہ رہا تھا کچھ دیر اس سے باتیں کرے۔ لیکن کس تقریب سے؟ اس میں جراءت رندانہ اور ہمت مردانہ

کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اس نے بڑی اپنایت کے لہجے سے اسے بلایا۔
"کیا ذرا دیر یہاں نہ بیٹھو گی لیلےٰ؟"
وہ انکار نہ کر سکی۔ تذبذب کا اظہار نہ کر سکی۔ دل کی مراد پائی اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔
پھر دونوں میں باتیں شروع ہو گئیں۔
ربیع :۔ کسی ضروری کام سے تو نہیں جا رہی تھیں؟
لیلےٰ :۔ "جی نہیں۔ یونہی وہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی۔ سوچا جاؤں بڑے کمرے میں جا کر بیٹھوں۔
ربیع :۔ کام تو مجھے بھی کوئی خاص نہیں ہے۔ لیکن تمہیں دیکھ کر تم سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگا۔
لیلےٰ :۔ باتیں تو آپ کی ہوتی ہیں دلچسپ، میری باتوں میں کیا رکھا ہے؟
ربیع :۔ یہ بھی عجب حسن اتفاق ہے۔ تمہیں میری باتیں اچھی لگتی ہیں مجھے تمہاری گویا ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔
لیلےٰ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ لیکن پورے طور پر مسکرا بھی نہ سکی۔ ربیع نے اس کی کیفیت بھانپ لی وہ بھی دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا کیونکہ منہ سے ایسی بات نکل گئی جو نہ نکلنی چاہیئے تھی۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ جب ایک ایسی بات جو نہ کہنا چاہیئے تھی منہ سے نکل گئی تو پھر دل میں حسرت باقی کیوں رہ جائے؟ جو کچھ دل میں ہے وہ زبان پر کیوں نہ آ جائے؟
ربیع :۔ لیلےٰ! تم سے ایک بات کہنے کا بہت دنوں سے ارادہ کر رہا ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی، اجازت دو تو کہوں؟"
لیلےٰ :۔ (مسکرا کر) آپ کی بہادری اور دلیری کا تو بڑا شہرہ ہے۔ سارا گھر آپ کا

کلمہ پڑھتا ہے۔ لیکن آپ مجھ جیسی ایک کمزور اور ناتواں لڑکی کے سامنے کہتے جھجکتے ہیں؟ ـــــ خوب رہی یہ بھی۔

ربیع :- ہاں لیلےٰ! یہی بات ہے۔ واقعی ڈرتا ہوں ـــــ میں تلوار سے نہیں ڈرتا۔ تیر و تفنگ سے نہیں ڈرتا۔ دشمن کی فوج سے نہیں ڈرتا دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب اور خوفزدہ نہیں ہوتا لیکن تم سے ڈرتا ہوں۔

لیلےٰ :- یہ کیوں؟ ـــــ میں تو ہمیشہ آپ سے بہت تپاک اور خلوص سے ملتی ہوں۔ پھر مجھ سے ڈرنے کے کیا معنی؟

ربیع :- تمہاری انہیں باتوں نے تو میرے دل کو ڈھارس بندھائی ہے۔ اب میری ہمت بندھتی جاتی ہے۔ اور ڈر کم ہوتا جاتا ہے۔

لیلےٰ :- (ایک جان نواز تبسم کے ساتھ، ایک ادائے خاص سے اسے دیکھتے ہوئے) لیکن اب تک اتنی ہمت نہیں کہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ سکیں۔

ربیع :- تو پھر کہوں؟

لیلےٰ :- بار بار کیوں پوچھتے ہیں کہہ تو رہی ہوں کہیئے؟

ربیع :- پہلے ایک سوال کروں گا۔ پھر وہ بات کہوں گا۔

لیلےٰ :- سوال ہی کر ڈالئے؟

ربیع :- کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟

لیلےٰ :- (سر جھکا کر) نہیں۔

ربیع :- کیا تمہاری منگنی کہیں ہوئی ہے؟

لیلےٰ :- (اسی طرح سر جھکائے) ہوئی تھی لیکن میں نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

ربیع :- (خوش ہو کر) تم نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا؟

لیلیٰ :- جی!

ربیع :- کیا یہ بتاؤ گی۔ منگنی کہاں ہوئی تھی؟ میرا مطلب یہ ہے کس سے؟

لیلےٰ :- اسے کیا کیجئے گا پوچھ کر؟

ربیع :- لیکن جواب دینے میں حرج بھی کیا ہے؟

لیلےٰ :- یزید سے ـــــ یزید نے والد کو پیغام دیا تھا والد نے منظور کر لیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

ربیع :- (بیتابی کے ساتھ) لیلیٰ! تم کتنی اچھی ہو؟

لیلےٰ :- (مسکرا کر) یہ اگر اچھائی ہے تو میں نے اپنے ساتھ کی ہے آپ اس کی تعریف کیوں کر رہے ہیں؟

ربیع :- اس کی کئی وجہیں ہیں۔

لیلےٰ :- تو بتا دیجئے پھر۔

ربیع :- اس لیے کہ یزید ننگِ اسلام ہے۔ کسی مسلمان لڑکی کو اس کی رفیقۂ حیات بن کر اپنی زندگی برباد نہیں کرنی چاہیے۔ میری خوشی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا تم جیسی خوب رو، خوش اطوار اور مجموعۂ خوبی لڑکی ایسے شخص کے پلے باندھی جائے جو شرابی ہے، جواری ہے۔ جس میں کوئی خوبی نہیں۔ سوائے اس کے کہ ایک بڑے باپ کا نالائق بیٹا ہے۔

لیلےٰ :- (مسکرا کر) میرے، آپ کے خیالات بہت ملتے جلتے ہیں۔

ربیع :- کیا تمہارا خیال بھی یہی تھا؟

لیلےٰ :- جی بالکل یہی۔

ربیع :- اس انکشاف نے جتنا مجھے مسرور کیا ہے کہہ نہیں سکتا۔ دل یہ چاہتا ہے کہ اس شکرانہ میں اپنی جان قربان کر دوں۔

لیلےٰ :- آپ کی جان بہت قیمتی ہے ایسی معمولی باتوں پر اسے قربان نہیں ہونا چاہیئے ہاں یہ بتائیے۔ آپ مجھ سے پوچھنا کیا چاہتے تھے؟ مجھے اشتیاق

ہے اس کے سننے کا!

:۔ (مسکرا کر) رقیہ آرہی ہے۔ یہ آکر چلی جائے۔ تب کہوں گا۔ بڑی شریر لڑکی ہے یہ بھی ـــــ تم بیٹھی رہو۔ اگر اسے آتا دیکھ کر گئیں تو میرا تمہارا دونوں کا اپنی فقرے بازیوں سے ناطقہ تنگ کر دے گی۔

باب ۱۷

حرفِ محبّت!

رقیہ، نسیم بہار کی طرح آئی اور شمیم جانفزا کی طرح چلی گئی۔

اسے سلمٰی نے بلایا تھا۔ اس نے ان دونوں کو بیٹھے دیکھا۔ نگاہِ غلط انداز ڈالی اور مسکراتی ہوئی گزری چلی گئی۔ اس تبسم میں طنز نہیں تھا۔ ہمدردی تھی، دلاسا تھا، اپنایت تھی۔ لطف وکرم کی جلوہ نمائی تھی!

رقیہ کے جانے پر پھر دونوں "تنہارہ گئے۔ لیکن خاموش ——— دونوں میں سے کوئی بھی بات چیت کا سلسلہ چھیڑنے میں پہل کرنے کو تیار نہیں تھا — آخر ربیع نے ہمت کی۔

ربیع :۔ رقیہ چلی گئی۔ وہ ہم سے مخاطب نہیں ہوئی۔

لیلےٰ :۔ نہیں ——— یہ کہیئے اس نے ہمیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے ہمیں منہ نہیں لگایا۔ اس نے ہماری بات نہیں پوچھی۔

ربیع :۔ اچھا یوں سہی (مسکراکر) بڑی تیز اور طرار ہے لیکن اس وقت نہ جانے کیوں مروت کر گئی۔ لیکن اس کا ادھر سے گزرنا بالا بالا نہ جائے گا۔ ضرور کسی وقت کوئی گل کھلائے گی ——— خیر، تو میرا مطلب یہ تھا کہ ہم بدستور بات چیت کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں کیونکہ

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

لیلےٰ ہنسنے لگی۔ پھر گویا ہوئی۔

"آپ بڑا ظلم کر رہے ہیں غریب رقیہ پر۔ میرا جہاں تک اندازہ ہے وہ آپ کے بارے میں اچھی رائے رکھتی ہے ـــــــ جب بھی آپ کا ذکر آیا۔"

ربیع :- اچھا میرے پیچھے آپ حضرات کی محفل میں مجھ بدبخت کا ذکر بھی کبھی کبھی آتا رہتا ہے۔ سبحان اللہ!

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

توکیا ذکر ہوتا ہے میرا؟

لیلےٰ :- کوئی خاص بات نہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ آپ کی تعریفیں کیا کرتی ہے گن گایا کرتی ہے۔ اور آپ اس بے چاری کو اس طرح یاد کر رہے ہیں۔

ربیع :- بیچاری ـــــــ لیلےٰ! تم اسے نہیں جانتیں۔ تمہاری وہ صرف سہیلی ہے ہمسائی ہے۔ میری بنت عم ہے۔ میں جتنا اسے جانتا ہوں کوئی نہیں جانتا۔ ویسے وہ واقعی بڑی نیک اور محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ لیکن ہے بڑی شریر۔

لیلےٰ :- خیر شریر سہی۔ میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اگر وہ اس وقت ساتھ نہ دیتی اور مجھے اپنے ساتھ نہ لاتی تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔

ربیع :- یہ تو سچ ہے ـــــــ لیکن سمجھ میں نہیں آیا۔ تم نے امیرالمومنین سے اپنی نسبت کیوں نہیں قبول کی؟

لیلےٰ :- (چونک کر) امیرالمومنین؟ ـــــــ کیا مطلب ہے آپ کا؟

ربیع :- شاید تمہیں نہیں معلوم۔ امیر معاویہ کا انتقال ہوگیا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اب یزید تخت خلافت پر متمکن ہے۔ اب تو وہ جور و جبر سے بھی کام لے سکتا ہے۔

لیلےٰ :- (پریشان ہو کر) ہاں یزید سب کچھ کر سکتا ہے لیکن ـــ؟

ربیع :- لیکن کیا؟ ـــــــ بڑی طاقت کے سامنے چھوٹی طاقت نہیں ٹھہر سکتی۔

اس کے پاس سب کچھ ہے تمہارے پاس کچھ نہیں۔

لیلیٰ :- (استقامت کے ساتھ) جو چیز میرے پاس ہے وہ اس کے پاس نہیں۔

ربیع :- وہ کیا؟

لیلیٰ :- مر جانے کی ہمت! ـــــ وہ زندہ رہنے کے لئے مرتا ہے۔ میں مر کر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ بہت فرق ہے مجھ میں اور اس میں۔ وہ میری گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔

ربیع :- واقعی تم یہاں تک تیار ہو؟ میں یقین کر لوں؟

لیلیٰ :- آپ کو یقین دلانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے اور خوب جانتی ہوں کہ جو کچھ زبان سے نکل رہا ہے۔ وہ سچ ہے یا جھوٹ!

ربیع :- تم تو خفا ہو گئیں لیلیٰ!

لیلیٰ :- نہیں خفا نہیں ہوئی۔ لیکن تکلیف ضرور ہوئی۔ آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ حالانکہ میں نے آپ کے بارے میں غلط رائے کبھی نہیں قائم کی۔

ربیع :- لیلیٰ! میں نے آمدِ سخن میں یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔ اگر تم نے معاف نہ کیا تو مجھے صدمہ ہوگا۔

لیلیٰ :- (مسکرا کر) معاف کر دیا۔

ربیع :- (جذبات کے عالم میں) شکریہ۔

لیلیٰ :- آپ نے اتنی ساری باتیں کر ڈالیں۔ لیکن جو بات کہنے کے لئے مجھے روکا تھا وہ نہیں کہی تو پھر اب جاؤں۔

ربیع :- صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسے سننے کے بعد خواہ تم میری صورت دیکھنے کی روادار بھی نہ ہو۔ خواہ نفرت کرنے لگو خواہ مجھے دنیا کا ذلیل ترین انسان سمجھ لو۔

لیسلے :۔ تو بہ بھئی ۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو خراب اور گرا ہوا آدمی سمجھوں ۔ میرے دل میں آپ کی بہت منزلت ہے ۔ بہت وقعت ہے

ربیع :۔ تم نے میری زبان بندی کر دی ۔

لیسلے :۔ یہ کیوں ؟ میں نے تو کچھ نہیں کہا ۔

ربیع :۔ تم نے میرے بارے میں اچھی رائے قائم کر رکھی ہے ۔

لیسلے :۔ ہاں تو ——

ربیع :۔ اور اگر میری اس گفتگو کے بعد تم نے مجھے ایسا نہ سمجھا تو —— ؟ میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گا ۔

لیسلے :۔ اگر اتنے اندیشے آ رہے ہیں دل میں تو بہتر یہی ہے کہ خاموش رہیے نہ کہیے ، پھر کبھی دیکھا جائے گا ۔

ربیع :۔ یہ بھی ناممکن ہے ۔ اگر خاموش رہا تو میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی ۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا ۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا ۔ اب ضبط کرنا میرے بس سے باہر ہے ۔

لیسلے :۔ عجب مصیبت ہے نہ کہتے ہیں نہ خاموش رہتے ہیں ۔ آخر کب تک بیٹھی رہوں گی ؟ پھر رقیہ ادھر سے گزرے گی اور یقین کیجئے اب کے وہ کچھ کہے بغیر نہیں جائے گی ۔

ربیع :۔ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے سننے کے بعد میرے بارے میں غلط رائے تو نہیں قائم کر لوگی ؟

لیسلے :۔ (چڑ کر) اس کا انحصار تو بات پر ہے —— لیکن آپ شرطیں کیوں لگا رہے ہیں ۔ بہت وقت اسی حیص بیص میں ضائع ہو چکا ہے ۔ اب واقعی مجھے یہاں نہیں بیٹھنا چاہیئے ۔

ربیع :۔ ٹھیک ہے تم جا سکتی ہے لیکن میرا صرف ایک لفظ سن کر ۔ بہت معمولی سی بات ہے ——

لیلےٰ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ربیع نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اور قبل اس کے کہ لیلےٰ سنبھل سکے۔ اپنے آپ کو جواب دینے پر تیار کر سکے ربیع ایک جست میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

لیلےٰ تنہا کھڑی تھی ـــــ گم صم، خاموش ـــــ کچھ متحیر، کچھ مسرور، کچھ فکرمند!

باب ۱۸

سسکیاں

یہ اعتراف محبت بھی کتنا عجیب تھا۔ ربیع نے منہ سے ایک لفظ نکالا۔ آنکھیں چار نہ کر سکا۔ اور سامنے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ شاید محبت کرنے والوں کا دل واقعی کمزور ہوتا ہے۔ بہادر سے بہادر اور شجاع سے شجاع شخص بھی اپنے محبوب کے سامنے چوکڑی بھول جاتا ہے۔ سٹی گم ہو جاتی ہے۔ یہی ربیع جو تلوار کا دھنی مرد میدان تھا۔ جس کے خنجر نے نہ جانے کتنے سینے چھیدے تھے۔ اور جس کی تلوار نہ جانے کتنوں کا خون چاٹ چکی تھی۔ ایک نوخیز، نوعمر اور بے مایہ لڑکی کے سامنے اس طرح مجبور و معذور نظر آرہا تھا جیسے پہاڑ کے سامنے ذرۂ ناچیز!

اور خود لیلٰی کا کیا عالم تھا؟

اس نے ربیع کی بات سنی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے زور سے کہ دھڑکن کی آواز خود اس کے کانوں تک آرہی تھی۔ اس کے ہلکے گلابی گال سرخ ہو گئے۔ اس پر ایک ارتعاش کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ کھڑی نہ رہ سکی۔ سیدھی کمرے میں گئی اور بستر پر دراز ہو گئی جیسے کئی دنوں سے بیمار ہے۔ جیسے کوئی بڑی مشکل پیش آگئی ہے۔ جیسے کوئی ایسی مصیبت آن پڑی ہے جس کا کوئی چارہ نہیں جس کا کوئی مداوا نہیں اور واقعی تھی بھی یہی صورت۔

وہ سوچ رہی تھی۔ یہ میں نے کیا سنا!

کیا واقعی ربیع مجھ سے محبت کرتا ہے؟ اور وہ کرتا ہے تو کیا میں نہیں کرتی؟ میں تو اسے اسی دن سے چاہ رہی ہوں جب پہلے پہل اسے دیکھا تھا۔ اس کی دلآویز

باتیں سنی تھیں۔ اس کے جانفزا تبسم کا نظارہ کیا تھا اس کی شوخ اور شریر نظروں سے آنکھیں ملائی تھیں!

ہاں، ہم دونوں محبت کرتے ہیں۔ لیکن اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟ کیا وہ جو میری ایک ہم نام کا مجھ سے پہلے ہو چکا ہے؟

وہ بھی لیلی تھی میں بھی لیلیٰ ہوں!

وہ بھی بدقسمت تھی میں بھی بدقسمت ہوں!

وہ بھی اپنے عاشق سے محبت کرتی تھی مگر اس کی نہ ہو سکی۔ میں بھی اپنے عاشق سے محبت کرتی ہوں مگر اس کی نہیں ہو سکتی۔

وہ بھی غم آرزو لے کر اس دنیا سے ناکام و نامراد سدھاری، میری قسمت میں بھی یہی لکھا ہے!

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ربیع کی بن جاؤں؟ ابا جان قیامت برپا کر دیں گے۔ اور یزید تو ربیع کی جان لے لے گا۔

خود سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں لیکن ربیع پر آنچ نہ آنے دوں یہ نہیں ہو سکتا۔ خود مر جاؤں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس بے چارے کی جان میری وجہ سے جائے یہ کس دل سے گوارا کر لوں۔

پھر ——— ؟

اب کیا ہوگا؟ یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھے گی؟

کیا ربیع سے کہہ دوں تم خیالِ خام میں مبتلا ہو۔ اس سے محبت کر رہے ہو۔ جو تم سے بہت دور ہے۔ نہیں اگر ایسا کہا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں اس کا دل توڑ نہیں سکتی۔ یہ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔

پھر کیا کروں؟ ——— یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ اس کے سامنے سخت اور درشت بن جاؤں۔ اس سے کہہ دوں "میں تم سے محبت نہیں کرتی اور تم۔ مجھ سے محبت کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ خبردار جواب یہ لفظ لائے زبان پر!

ہاں یہ کہہ سکتی ہوں۔ یہ کر سکتی ہوں اور اس کے بعد پھر وہ واقعی یہ لفظ زبان تک نہ لا سکے گا۔ میرا سامنا بھی نہیں کر سکے گا شاید کچھ عرصہ بعد مجھے بھول بھی جائے ممکن ہے مجھ سے نفرت بھی کرنے لگے۔

لیکن کیا میں اسے بھول سکوں گی؟

کیا میں اس سے نفرت کر سکوں گی؟

کیا میرے منہ سے سخت اور درشت الفاظ اس کے لئے اس کے سامنے نکل سکیں گے —؟

خدا کی قسم مر جانا قبول ہے مگر یہ نہیں — پھر کیا ہوگا؟ یا الٰہی پھر کیا ہوگا؟

؛ اے خدا! تو ربیع کا دل میری طرف سے پھیر دے۔ وہ خود مجھ سے نفرت کرنے لگے۔

وہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ اور اپنے دل سے لڑ رہی تھی — اس پر عجیب طرح کی بے کلی کی کیفیت طاری تھی۔

اتنے میں رقیہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر لیلیٰ اٹھ بیٹھی۔ رقیہ نے اس کی ہیئت دیکھی تو حیران رہ گئی بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

یہ تمہاری کیا حالت نظر آ رہی ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؛ ابھی تو تم اچھی بھلی تھیں"

لیلےٰ:۔ کچھ نہیں رقیہ! سر میں درد ہو رہا ہے۔

رقیہ:۔ سر میں یا دل میں؟

لیلےٰ:۔ ہر وقت مذاق کرتی رہتی ہو۔ یہاں میری جان پر بنی ہوئی ہے۔

رقیہ:۔ لیکن کیوں؟ — کچھ معلوم بھی تو ہو؛

لیلےٰ:۔ طبیعت خراب ہے۔ دل گھبرا رہا ہے آنکھوں تلے اندھیرا آ رہا ہے۔ سر چکرا رہا ہے۔ بس یہ کیفیت ہے؟

رقیہ:۔ نہیں میں نہیں مانوں گی۔ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ ابھی تو تم ربیع سے باتیں

کر رہی تھیں۔ کہیں اس نے تو کوئی ایسی ویسی بات کہہ کر تمہارے نازک جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی؟ اگر ایسا ہے تو اس کی بات کا بُرا ماننا حماقت ہے۔ وہ زبان کا تیز اور دل کا صاف ہے۔ اس کی کسی بات کا بُرا نہیں ماننا چاہیئے۔

لیلےٰ:۔ نہیں، انہوں نے تو کچھ نہیں کہا۔

رقیہ:۔ نہ تم نے کچھ کہا، نہ ربیع نے کچھ کہا۔ نہ کوئی اور بات ہوئی۔ پھر یہ ماجرا کیا ہے؟ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟ آنکھیں چار کرتی ہوئی کیوں گھبراتی ہو؟ آواز بھرا کیوں رہی ہے؟۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے!

پھر رقیہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔ "کیا مجھے بھی اپنے دل کا حال نہیں بتاؤگی؟ مجھے رقیہ کو؟ کیا تم مجھ پر بھی اعتبار نہیں کرتیں۔ کیا تم مجھے بھی اپنا نہیں سمجھتیں؟ لیلیٰ ایسا نہ کرو میرا دل نہ توڑو۔ مجھے غیر نہ سمجھو—— مجھے میری نظروں میں ذلیل، سبک اور حقیر نہ کرو۔

یہ کہتے کہتے رقیہ کی آواز بھرّا گئی۔ گریہ گلوگیر ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے موتی کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے لیلےٰ کا بندِ ضبط بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اور اس نے رقیہ کے کاندھے پر سر رکھ دیا اور خود بھی سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

باب ۱۹

فکرِ فردا

رونے سے دل کا بوجھ ہلکا اور طبیعت مائل بہ سکون ہو جاتی ہے۔ لیلیٰ خوب جی بھر کے روئی اور وہ بوجھ سا جو اس کے قلبِ ناتوان پر ربیع کی باتوں اپنی محبت اور اس کے اظہارِ عشق کا محسوس ہو رہا تھا اتر گیا۔ رقیہ کو اس کی کیفیت محسوس کر لینے میں دیر نہیں لگی۔ دونوں کے دل ملے ہوئے تھے۔ بہت جلد گھل مل کر باتیں شروع کر دیں۔ عورت ویسے بھی راز کو راز نہیں رکھ پاتی۔ اور پھر لیلے جیسی الہڑ اور نادان چھوکری کی بھلا رقیہ کے سامنے کیا چل سکتی تھی؛ ایک ایک بات اگلنا پڑی۔ ایک ایک بات کا اعتراف کرنا پڑا۔ اسے اپنے ضبط پر بڑا ناز تھا لیکن رقیہ کے سامنے وہ اس طرح اپنے دلِ محزوں کی کیفیت اور ربیع کے قلبِ بے قرار کا حال بیان کر رہی تھی جیسے کوئی سعادت مند شاگرد باجبروت استاد کے سامنے آموختہ دہراتا ہے۔

رقیہ نے یہ ساری باتیں سن لیں۔ پہلے تو وہ کچھ سوچتی رہی پھر دریافت کیا۔

"آخر ربیع کو کیا جواب دوگی؛ بی بنّو۔"

لیلے:- کچھ نہیں۔ ان کے سامنے میری زبان نہیں کھل سکتی۔ ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ لیکن اعترافِ محبت۔ اور وہ بھی ان کے سامنے یہ میرے بس میں نہیں۔

رقیہ :۔ (مسکراکر) تو میں تمہاری وکیل بن جاؤں ؟ اس غریب کو یہ خوشخبری پہنچا دوں کہ تمہاری محبت سرکارِ حسن نے قبول فرمالی ۔

لیلیٰ :۔ پھر وہی مذاق ــــ کبھی ہمیں نہ چھیڑو ۔

رقیہ :۔ اس میں چھیڑنے نہ چھیڑنے کا کیا سوال ہے ؟ ربیع نے ایک بات کی ہے۔ تمہیں اس کا جواب دینا ہے ۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے تمہارا فیصلہ کیا ہے ؟ اگر محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہو تو اقرار کرو۔ نہیں دے سکتیں تو صاف صاف کہہ دو ۔ تم اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش ۔ بیچارہ کسی نتیجہ پر تو پہنچ جائے ۔

لیلیٰ :۔ یہ دیدہ دلیری مجھ سے نہیں ہو سکتی ۔ تم اپنے محبت کرنے والے سے بے دھڑک باتیں کرنا۔ میں تو نہیں کر سکتی ۔ مجھے اپنی کمزوری کا اعتراف ہے ۔

رقیہ :۔ محبت ہی کمزوری کا دوسرا نام ہے ۔ اس کا اعتراف بھی کر لو ۔

لیلیٰ :۔ وہ تو کر چکی ۔ واقعی میں ربیع سے محبت کرتی ہوں ۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ محبت اسے جتا بھی دوں ؟

رقیہ :۔ واہ ! اس میں بھی بڑا مزہ آتا ہے ۔ سنا نہیں تم نے وہ شعر ؎

اظہار رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا ، جان تو گیا

لیلیٰ :۔ بخشو، نہ میں ایسی ذلتیں سہنے کو تیار ہوں نہ اظہار عشق کرنے کو ۔

رقیہ :۔ پھر یہ گاڑی کیسے چلے گی ؟

لیلیٰ :۔ یہ میں نہیں جانتی ۔ خدا ہی بیڑا پار لگانے والا ہے ۔

رقیہ :۔ یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی ۔ بتاؤ یہ بیل منڈھے کیسے چڑھے گی ؟ چچا منذر کو اگر بھنک بھی مل گئی تو پھر ان کی چمکتی ہوئی تلوار ہوگی اور تمہاری گردن ۔

لیلےٰ :۔ ہاں یہی تو میں سوچتی ہوں۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی۔

رقیہ :۔ اور وہ شاید کچھ نرم بھی پڑ جائیں۔ آخر باپ ہیں۔ کہاں تک بیٹی کا پاس و لحاظ نہیں کریں گے۔ لیکن "امیرالمومنین" یزید صاحب تو سر پیٹ لیں گے کپڑے پھاڑ ڈالیں گے۔

لیلےٰ :۔ یزید کا نام نہ لو میرے سامنے۔

رقیہ :۔ پھر کس کا نام لوں؟ ربیع کا؟

لیلےٰ :۔ (ایک تاثر کے ساتھ) جی چاہتا ہے یہ نام ہر وقت سنتی رہوں۔ لیکن۔۔!"

رقیہ :۔ کہتے کہتے رک کیوں گئیں۔ لیکن کیا؟

لیلےٰ :۔ (آہ سرد بھر کر)

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں!

رقیہ :۔ (متاثر ہو کر) نہیں لیلےٰ مایوس نہ ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھو وہ سب کچھ کر سکتا ہے!

لیلےٰ :۔ اور کچھ نہیں چاہتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں۔ یزید کے پلے نہ باندھی جاؤں مجھے اس سے شدید نفرت ہے۔ میں کسی طرح اس سے مانوس نہیں ہو سکتی۔

رقیہ :۔ مجھے سب سے زیادہ فکر یہ ہے کہ دمشق واپس جا کر منذر چچا کو کیا جواب دوں گی؟ انہوں نے صرف اس لئے تمہیں میرے ساتھ یہاں آنے دیا تھا کہ ہموار کر لوں گی۔ راہ پر لے آؤں گی تمہیں، لیکن وہاں دمشق پہنچ کر اب ایک نیا گل یہ کھلے گا کہ نہ صرف تم کو ہموار کر سکی لیکن صاحبزادی ایک بلا بھی اپنے ساتھ لگا لائیں محبت کی۔ تم تو تم۔ مجھے اپنی خیریت نظر نہیں آتی۔

لیلےٰ :۔ نہیں رقیہ! اپنی وجہ سے تمہیں کسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہونے دوں گی خود جھیل لوں گی سب کچھ۔ تم پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔

رقیہ :۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔ بندی کسی سے نہیں ڈرتی۔ تمہاری دوست ہوں۔ کوئی وقت پڑا تو دیکھ لو گی۔ تمہارے لیئے اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی ہوں۔ لیکن دمشق روانہ ہونے سے پہلے ہم لوگوں کو ضرور یہ سوچ لینا چاہیئے کہ وہاں پہنچ کر حالات کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا؟

لیلےٰ :۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ تو پھر سوچو کچھ۔

رقیہ :۔ میرے ذہن میں تو یہ بات آتی ہے کہ ربیع سے ساری کہانی بیان کردی جائے۔ پھر اس سے مشورہ لیا جائے۔

لیلےٰ :۔ وہ کیا کر سکیں گے؟

رقیہ :۔ واہ! وہ نہیں کر سکیں گے تو اور کون کر سکے گا؟ آخر مرد آدمی ہیں۔ مرد ہی اس طرح کے طوفان کو جھیلتے ہیں۔

لیلےٰ :۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن میں انہیں بھی اپنی خاطر کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔

رقیہ :۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہے؟ نہ مجھے مصیبت میں ڈالنا چاہتی ہو نہ ربیع کو پھر آخر معاملہ سلجھے گا کس طرح؟ —— سچ کہتی ہوں مجھے جب اس کا خیال آجاتا ہے تو دل ہو لنے لگتا ہے۔ تمہارے نزدیک یہ معمولی سی بات ہے؟ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سلمےٰ ادھر سے گزری اس نے ان دونوں کو بیٹھے دیکھا تو جاتے جاتے رک گئی۔ پھر لیلےٰ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی :۔

"مجھے تو رقیہ پر رشک آنے لگا ہے! —— اس سے تو خوب باتیں کرتی ہو اور ہمیں کبھی جھوٹوں بھی منہ نہیں لگاتیں —— جب یہاں یہ حال ہے تو دمشق واپس جا کر کیوں یاد کرنے لگیں ہمیں؟"

رقیہ :۔ لیلےٰ مجھ سے زیادہ تر آپ ہی کی باتیں تو کیا کرتی ہے۔ بڑی اچھی ہیں سلمےٰ آپا، ایسی ہیں، ویسی ہیں۔ مجھے تو اس کی باتیں سن سن کر رشک آجاتا ہے

کبھی کبھی آپ پر۔

سلمٰی:۔ (ہنستے ہوئے) بڑی شریر ہے تو بھی۔ کیسا تڑ سے جواب دیا ہے لیکن بالکل جھوٹا ـــــ خیر یہ بی لیلٰے بھی کیا یاد کریں گی۔ ہم انہیں پھر مٹھائی کھانے کے لیئے ایک خوشخبری سنا دیتے ہیں۔ اگلے ہفتہ منذر چچا آ رہے ہیں یہاں ـــــ آج ہی اطلاع آئی ہے!"

سلمٰی یہ کہہ کر چلی گئی۔ لیکن رقیہ اور لیلٰے گم صم ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

باب ۲۰

غمِ محبّت

منذر کی آمد کے تصور نے لیلیٰ کو اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بظاہر خوش اور مسرور تھی۔ لیکن حقیقتاً اس کا دل فکروں، غموں اور اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دمشق سے کوفہ آتے وقت بھی اس کا دل پریشان تھا لیکن یہاں آکر خدا نے ایسی نعمت بخش دی کہ اپنے تمام فکروں کو بھول گئی۔ یہ تھا ربیع ایک خوش رو، خوش گفتار اور پاک نہاد نوجوان۔

ربیع کو دیکھ کر، ربیع سے باتیں کر کے، ربیع کے خیالات سن کر اس کا غمزدہ دل عجیب قسم کی توانائی کرنے لگتا تھا۔ اب تک وہ صرف یزید سے نفرت کرتی تھی۔ اب وہ ربیع کے سوا ہر اس مرد سے نفرت کرنے لگی تھی۔ جو اس کا طالب ہو سکتا تھا۔ جس سے اس کی شادی کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی منذر کے آنے کے معنی ہیں کوفہ سے رخصت، ربیع سے جدائی اور پھر غموں، مصیبتوں زحمتوں اور آفتوں سے بھری ہوئی دنیا کی طرف، مراجعت، جہاں نہ کوئی ہمدم ہوگا نہ کوئی راز دان، نہ ہمدرد ہوگا نہ غمگسار، نہ مونس ہوگا نہ دلدار، باپ کی جھڑکیاں ہوں گی۔ صالح کی غیر مفید ہمدردی ہوگی۔ رقیہ تو ابھی یہاں رہے گی لہٰذا وہ جو ایک چھوٹا سا سہارا تھا۔ وہ بھی چھٹ جائے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ ناؤ کس طرح پار لگے گی؛ یہ بیڑا ساحلِ مراد تک پہنچ بھی سکے گا یا نہیں؟

بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے ربیع کا مسکراتا ہوا چہرہ آجاتا تھا۔ اس تبسم میں کتنی شیرینی تھی، کتنی رعنائی تھی، کتنی جاذبیت تھی ـــــ ان آنکھوں میں

کیسا جادو تھا۔ کیسی کشش تھی۔ کیسی شوخی تھی۔ ان لبوں سے جو بول نکلتے ہیں وہ کیسے جان بخش ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی مچلتی ہے۔ زندگی کی امنگ تڑپتی ہے زندہ رہنے کی تمنا اور آرزو لبسی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ کوفہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ سب چیزیں بھی چھوٹ جائیں گی۔

میں یہاں کیوں آئی؟

کیوں نہ دمشق ہی میں سر پھوڑ کر مر گئی؟

کیوں نہ میں نے وہیں امیدوں، آرزوؤں اور حسرتوں کا گلا گھونٹ لیا۔ میں یہاں آئی۔

ایک نئی دنیا میں پہنچ گئی۔ ایسی دنیا میں جسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ جس کا تصور کیا تھا، نہ جس سے آشنا ہوئی تھی۔ اس دنیا سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس دنیا نے مجھے اپنا لیا۔ اور پھر کہیں کا نہ رکھا اور اب یہ دنیا نہیں یہ جنت مجھے چھوڑنا پڑ رہی ہے۔

یا اللہ! میرا کیا انجام ہوگا؟ کیا حشر ہوگا میرا! — یہاں سے رخصت ہو کر، ربیع سے جدا ہو کر کیا میں زندہ رہ سکوں گی۔ کیا یہ زندگی اتنی تنگدل ہے کہ مجھے اپنے دامن سے نکال پھینکے گی۔ نہ میرے کام آئے گی نہ میں اس کے دنیا اتنی بے درد ہے، زندگی اتنی بے مہر ہے اس کا اندازہ میں نے کبھی نہ کیا تھا۔

لیکن اب تک میری نظروں میں زندگی کی، دنیا کی وقعت ہی کیا تھی؟ میں دنیا کو بھی ہیچ سمجھتی تھی اور زندگی کو بھی۔ ان دونوں کی قدر تو ربیع نے میرے دل میں پیدا کی ہے۔ اب نہ میں دنیا کو چھوڑنا چاہتی ہوں نہ زندگی کو۔ آہ کسی کا باپ بھی اتنا سنگدل، اتنا ظالم، اتنا دنیا پرور نہ ہوگا جتنا میرا باپ۔ باپ اس لئے ہوتے ہیں کہ اولاد کا سکھ دیکھیں، اسے خوش رکھیں۔ اسے خوش دیکھ کر خود ان کے دل کی کلی کھل جائے اسے مغموم پائیں تو خود ان کے دل کا کنول مرجھا جائے لیکن ایک میرا باپ ہے جسے میرے سکھ کی، میری خوشی کی، میرے جذبات کی، میری زندگی کی ذرا بھی پروا

نہیں۔ خود اپنے آپ کو خوش رکھنا چاہتا ہے، صرف اپنی زندگی کے گلستان کو ہر کانٹے سے دور رکھنا چاہتا ہے، دوسروں کی حتیٰ کہ اپنی اولاد تک کی پروا نہیں۔

ربیع نے کیا کہا تھا اس دن —؟

اس نے کہا تھا

"میں تم سے محبت کرتا ہوں —!

اور یہ کہہ کر وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا — دیوانہ پاگل، اسے کیا معلوم میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں؛ میں کس طرح اسے جان و دل سے چاہتی ہوں؛ اگر وہ یہ جان لیتا۔ اگر اسے یہ معلوم ہوتا تو بھاگنے کی جرأت نہ کرتا۔ سامنے آتا اور کہتا۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں، تم مجھ سے محبت کرتی ہو — ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ آؤ۔ ایک ایسی دنیا میں رہیں کہ جہاں ہمارے سوا کوئی تیسرا نہ ہو جو ہماری جنت میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ وہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ ہوگی۔ وہاں کوئی بادشاہ نہیں ہوگا۔ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین نہیں ہوگا۔ بس ہم ہی ہم ہوں گے۔ ہم ہی اپنی رعایا ہوں گے ہم ہی اپنے فرماں روا۔ وہاں نہ یزید کا سکہ چلے گا نہ منذر کی بادشاہت ہوگی — آؤ لیلےٰ آؤ! دیر نہ کرو، اس دنیا کو، ان دنیا والوں کو، اس کوفہ کو، دمشق کو، سب کو چھوڑ دو۔ چلو وقت گزرا جا رہا ہے۔ ہمارا قافلہ آمادۂ سفر ہے۔ ہم دیارِ رسولؐ کی طرف جائیں گے اور وہاں امن و عافیت کی زندگی بسر کریں گے یہ وہ دیارِ رسولؐ ہے جہاں اب تک امن ہے، عافیت ہے۔ ایمان ہے، اسلام ہے، اخوت ہے، ہمدردی ہے۔

وہ سب کچھ کہتا اور میں سنتی رہتی، پھر وہ جواب کا تقاضا کرتا اور میں کہتی۔

"ہاں ربیع! تم سچ کہتے ہو۔ میں خود اس دنیا سے، ان دنیا والوں سے یہاں کی ریت سے، رسم و رواج سے، جبر و جور سے تنگ آ گئی ہوں۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ تمہاری رائے مناسب ہے۔ چلو میں تمہارے ساتھ ہوں اور پھر ہمارا مختصر سا قافلہ خدا کا نام لے کر، خدا کو گواہ کر کے، مدینۃ الرسولؐ کی طرف روانہ ہو جاتا۔

لیکن اس نے یہ کچھ نہیں کہا۔

محبت کا لفظ زبان سے نکالا اور بھاگ گیا۔ جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ جیسے اس سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہو۔ جیسے وہ آنکھیں چار کرتے ہوئے جھجکتا ہو! —— وہ بزدل ہے کم ہمّت ہے۔

لیکن عورت ہونے کے باوجود اس سے زیادہ حوصلہ مند ہوں —— میں اتنی ہمّت رکھتی ہوں کہ اس سے ملوں۔ اس سے باتیں کروں، اسے جھنجھوڑوں اور اس سے وہ باتیں کہلواؤں جو اسے کہنا چاہیئے تھیں۔ ابھی جاتی ہوں ربیع کے پاس!!

باب ۲۱

اقرار

لیلےٰ ایک عزم کے ساتھ مکان کے اس حصہ میں گئی جہاں ربیع کی نشست و برخاست رہتی تھی۔ وہ موجود تھا۔ لیلیٰ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا لیکن چہرے کا رنگ بتا رہا تھا۔ گھبرایا ہوا اور کھویا سا ہے۔ خود لیلےٰ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ بہت کچھ سوچ کر آئی تھی۔ لیکن یہاں پہنچی تو زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ بالکل چپ کھڑی ہو گئی۔ ربیع نے طلسم سکوت توڑا۔

ربیع:۔ آؤ لیلےٰ بیٹھو۔ اس وقت کچھ پریشان سی نظر آتی ہو کوئی خاص بات ہو تو کہو میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ تمہارے کام آ سکوں۔

وہ بیٹھ گئی ـــــ لیکن بدستور خاموش اور گم صم۔

ربیع:۔ تمہاری یہ کیفیت دیکھ کر میرا اضطراب بڑھ رہا ہے خدا کے لئے بتاؤ کیا بات ہے! میں نے تم سے کچھ کہا تھا شاید اسی پر برہم ہو۔ میرا مطلب تمہیں خفا کرنا نہیں تھا۔ بے ساختہ وہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے تھے لیکن اگر ان سے تکلیف پہنچی ہے تو معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں خواہ جان کیوں نہ چلی جائے لیکن اس طرح کے الفاظ اب میری زبان تک نہیں آئیں گے۔

لیلےٰ:۔ آپ تو خواہ مخواہ کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے نہ کسی بات کا برا مانا نہ

نہ مان سکتی ہوں۔ میں تو اس وقت صرف آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔
ربیع :۔ میرا شکریہ ادا کرنے ؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔
لیلےٰ :۔ آپ نے میری عزت افزائی کی۔ آپ نے میرے ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دیا۔ آپ نے مجھے خوشی دی۔ آپ نے میرا غم چھین لیا۔ آپ نے مجھے۔ ایک نعمت بخشی ـــــ پھر کیسے شکریہ ادا نہ کروں ؟
ربیع :۔ گویا تم نے میری محبت قبول کر لی ؟ لیلیٰ ! تم نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے
لیلےٰ :۔ بے شک ہم دونوں کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ لیکن خدا ہی بہتر جانتا ہے اس کا انجام کیا ہوگا ؟
ربیع :۔ (تیوری پر بل ڈال کر) ہم نے محبت کی ہے۔ کوئی جرم نہیں کیا۔ ہماری محبت پاک ہے اور اس کی پاکی پر فرشتے گواہ ہیں۔ ہمارا دل کھوٹ سے خالی ہے اور خدا دلوں کا بھید جانتا ہے۔ پھر انجام سے خائف کیوں ہو ؟ اندیشہ کیوں پیدا ہو رہا ہے۔ تمہارے قلب نازک ہیں ؟
لیلےٰ :۔ آپ کو شاید نہیں معلوم ـــــ آج یا کل میں والد آرہے ہیں۔
ربیع :۔ ہاں میں نے سنا ہے۔
لیلےٰ :۔ آپ شاید نہیں جانتے ان کے خیالات میرے مستقبل کے بارے میں کیا ہیں۔
ربیع :۔ وہ تم کہہ چکی ہو۔
لیلےٰ :۔ پھر بھی اندیشہ کی کوئی بات نہیں ؟
ربیع :۔ قطعاً نہیں۔
لیلےٰ :۔ میں آپ کا سا قلب توانا کہاں سے لاؤں ؟
ربیع :۔ کیوں ـــ کیا تم ایک عرب لڑکی نہیں ہو ؟
لیلےٰ :۔ ضرور ہوں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے ؟
ربیع :۔ ایک عرب لڑکی کبھی اور کسی حالت میں دبائی اور کچلی نہیں جا سکتی۔ اسلام کا

دیس اس کا وطن ہے۔ اور اسلام کے دیس میں اسلام کے احکام کی نافرمانی نہیں ہو سکتی۔

یسلے:۔ میں نہیں سمجھی آپ کا مطلب کیا ہے؛

ربیع :۔ اسلام نے لڑکی کو حق دیا ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کا راستہ مقرر کرے کوئی اس کی مرضی کے خلاف اسے پابند وفا نہیں کر سکتا۔ نکاح اور شادی کے معاملہ میں یکسر آزاد ہے۔ اور میں ایک دوشیزہ سے یہ موقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے اس حق سے فائدہ اٹھائے گی۔

یسلے:۔ کاش ایسا ہو سکتا۔

ربیع :۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہمت سے کام لو اور اپنے دل کی بات شیخ منذر سے کہہ دو۔

یسلے:۔ وہ میرے دل کی بات جانتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں میں یزید سے کسی طرح راضی نہیں ہو سکتی لیکن اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔

ربیع :۔ تم بھی اپنی ضد پر قائم رہو۔

یسلے:۔ وہ تو ہوں۔ لیکن معاملہ تنہا میرا اور میرے باپ کا نہیں ہے وہ یقیناً نئے خلیفہ خلیفۃ المسلمین کے حسب منشا اُر ہے ہوں گے۔ پھر کیا ہوگا؛

ربیع :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یہ ہو سکتا ہے لیکن اندیشہ کی کوئی بات نہیں میں خود ان سے بات چیت کروں گا اور مجھے یقین ہے۔ وہ میرے معروضات پر توجہ کریں گے۔

یسلے:۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔

ربیع :۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور دیکھو کیا ہوتا ہے؛

یسلے:۔ وہ آئیں گے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ رقیہ ابھی یہیں رہے گی میں وہاں تنہا ہوں گی۔ نہ کوئی مونس، نہ ہمدرد، نہ یار نہ غمگسار، نہ رازدان نہ مددگار، جب سوچتی ہوں۔ اس عالم بے کسی میں میرا کیب حشر ہوگا تو

کانپ جاتی ہوں؟
یہ کہتے کہتے لیلے کی خوبصورت اور سحر طراز آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اس نے اپنی کیفیت پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
" لیکن میں اپنے عزم پر قائم ہوں۔ اگر جور و جبر سے کام نکالنے کی کوشش کی گئی تو خاموش نہیں بیٹھی رہوں گی۔

ربیع :۔ (مسکرا کر) کیا کرو گی؟

لیلے :۔ وہی، جو ایک باغیرت اور خود دار لڑکی کو کرنا چاہیئے۔

ربیع :۔ ایک باغیرت اور خود دار لڑکی ایسے موقعوں پر کیا کر سکتی ہے؟ اسے کیا کرنا چاہیئے؟ میں نہیں جانتا۔ تم بتا سکتی ہو۔ اسی لئے پوچھ رہا ہوں۔

لیلے :۔ وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔

ربیع :۔ گویا تم خودکشی کر لوگی؟ جان دے دو گی اپنی؟

لیلے :۔ ہاں یہ سب کچھ کروں گی۔

ربیع :۔ تم یہ سب کچھ نہیں کر سکتیں۔ تم اب میری ہو چکی ہو۔ تمہاری حفاظت میرا فرض ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں تم پر کوئی جبر نہیں کر سکتا۔ تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

لیلے :۔ نہیں، اپنے لئے میں آپ کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ آپ مجھے بھول جایئے۔

ربیع :۔ اس مشورہ کا شکریہ۔ لیکن ایسا کرنے سے معذور ہوں۔

لیلے :۔ آپ نہیں جانتے۔ ابا جان بڑے غصہ ور ہیں۔

ربیع :۔ اطمینان رکھو۔ میں ان کے مقابلہ میں ذرا بھی غصہ کا اظہار نہیں کروں گا۔ ان کی کڑوی کسیلی باتیں سن لوں گا۔ لیکن اپنے منہ سے کوئی بات ایسی نہیں نکالوں گا۔ جو ان کی شان کے خلاف ہو جو تہذیب کی حدود سے باہر ہو۔

شاید وہ ابھی کچھ اور کہتا کہ رقیہ کو آتا دیکھ کر خاموش ہو لیا۔ رقیہ بالکل انجان بنی ہوئی آئی اور لیلےٰ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی جیسے کوئی بڑا ہی ضروری کام ہو۔

باب ۲۲

حیرت اور حسرت

بعض وقت انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ منصوبہ کچھ تیار کرتا ہے اور واقعہ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ ربیع نے لیلے سے جو بات چیت کی تھی اس کا ماحصل یہ تھا کہ منذر سے خود گفتگو کرے گا۔ اور اسے راہ راست پر لے آئے گا اگرچہ لیلیٰ اس کے دلائل سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ اپنے باپ کے مزاج اور طبیعت سے واقف تھی جانتی کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں، ربیع لاکھ خوبصورت، خوب سیرت، بہادر اور شجاع ہو لیکن یزید کی جگہ نہیں لے سکتا اس کا نعم البدل نہیں ثابت ہو سکتا۔ اس کے پاس نہ وہ دولت ہے جو یزید کے پاس ہے نہ وہ جاہ وحشم ہے قسمت جس کا مالک یزید کو بنا چکی ہے۔ منذر کو روپیہ چاہیئے۔ جاگیر چاہیئے۔ سرکاری حلقوں میں عزت و اقتدار چاہیئے۔ بھلا یہ چیزیں غریب ربیع اسے کہاں سے دے سکے گا! یہ چیزیں تو اسے صرف یزید ہی کے دربار سے مل سکتی ہیں لیکن یہ محسوس کرنے کے باوجود ربیع کی باتوں سے مطمئن ہو گئی تھی۔ آدمی جب بالکل مایوس ہو جاتا ہے تو امید کی ذراسی کرن بھی بالکل نئی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ یہی حال لیلے کا تھا۔ وہ اپنے باپ سے، اپنی قسمت سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ لہذا ربیع کے یہ چند بول اس کے لئے آبِ حیات ثابت ہوئے اور وہ مطمئن ہو گئی کہ واقعی ربیع منذر کو رام کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

لیکن کوفہ میں منذر کے وارد ہونے سے چند گھنٹے بیشتر ربیع کو کوفہ سے رخصت ہو جانا پڑا۔

واقعہ یہ ہوا کہ یزید کی خلافت نے اہلِ کوفہ میں غم و غصہ اور اضطراب و التہاب کی لہر دوڑا دی۔ کوفہ والے امیر معاویہ کی زندگی ہی میں اس بات سے واقف ہو گئے تھے کہ یزید ولی عہد بنایا گیا ہے۔ بلکہ مغیرہ بن شعبہ کی انگیخت پر ایک وفد بھی اہلِ کوفہ کا دمشق گیا تھا۔ کہ امیر معاویہ سے مطالبہ کرے کہ وہ یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیں۔ لیکن اب کئی ایسی باتیں جمع ہو گئی تھیں۔ جنہوں نے اہلِ کوفہ کو دل کی بات زبان تک اور زبان کی بات عمل تک لانے پر آمادہ کر دیا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی۔ کہ اب مغیرہ بن شعبہ کوفہ کے گورنر نہیں تھے۔ دوسرے امیر معاویہ کا انتقال ہو چکا تھا اور حکومت کی جو گرفت تھی وہ کسی قدر ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اور تیسری سب سے بڑی وجہ ـــــ یہ تھی کہ یزید کے لچھن اور کرتوت مشاہدہ کی صورت میں ان کی نظر کے سامنے آ رہے تھے ـــــ وہ انہیں مشتعل کرنے کے لئے کافی تھے وہ محسوس کر رہے کہ انہیں ایسے شخص کی خلافت اور امارت قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو کسی طرح اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتا جو نام کا مسلمان ہے لیکن اس کے کسی عمل میں اسلام نہیں جھلکتا۔ بلکہ الحاد و بے دینی، فسق و فجور اور بے راہ روی جلوہ نمائی نظر آتی ہے۔ پھر اس اضطراب و اشتعال میں کچھ ضمیر کی خلش بھی کام کر رہی تھی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کی جیتی ہوئی بازی اپنی نادانی سے ہرادی یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت امام حسنؓ کے ساتھ ایسا دل شکن برتاؤ کیا تھا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اب یہ چاہتے تھے کہ پچھلے اعمالِ بد کی تلافی کریں اور تلافی کی صورت یہ تھی کہ یزید کی جبری بیعت فسخ کر دیں اور کسی ایسے شخص کو امیر اور خلیفہ بنائیں جس کا کردار پاک اور بے داغ ہو۔ جس کی اسلامیت اور للہیت واضح اور غیر مشکوک ہو۔ جس کی ذات مرجعیت عام اور مرکزیت عوام کی مظہر ہو، جس پر عامی اور عالم، عام اور خاص، جاہل اور تعلیم یافتہ، دولت مند اور غریب ہر طبقہ کے لوگوں کو اعتماد کامل ہو۔ وہ ایسا شخص ہو جو مسلمانوں کو خدا کے راستے پر لے جا سکے، صراطِ مستقیم کی طرف۔ ان کی راہنمائی کرے۔ جو گناہ نہ کرتا ہو۔ مصاحبوں کے ہجوم میں نہ گھر رہتا ہو۔ بیت المال کو ذاتی جاگیر

نہ خیال کرتا ہو۔ خدا کے بندوں یعنی اپنی رعایا سے بے پروا اور غیر متعلق نہ ہو۔ ان کی بھوک سے تڑپ جاتا ہو ان کی پریشانی اس کی پریشانی بن جاتی ہو۔ ایسا شخص سارے عالمِ اسلام میں سبطِ رسولؐ اور فرزندِ بتولؓ امام حسین علیہ السلام کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا تھا۔ لہٰذا کوفہ کے لوگوں نے بار بار کے اجتماعات میں یہ بات طے کی کہ ایک وفد مدینہ منورہ بھیجا جائے۔ جو اہلِ کوفہ کے خیالات امامِ عالی مقام کی خدمت میں پیش کرے اور انہیں آمادہ کرے کہ گوشۂ عزلت ترک کریں۔ مدینہ سے کوفہ تشریف لائیں اور یہاں آ کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں تاکہ خدا کا حکم بلند ہو۔ اسلام کا بول بالا ہو۔ منکرات کی گرم بازاری ختم ہو جائے منہیات پر جو جرأت لوگوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائے۔ وہ اسلام کو سمجھیں اس کی تعلیمات پر عمل کریں اور اپنی زندگی اس نہج پر بسر کریں جو اسلام کا مقصد و منشا ہے اس وفد کا ایک رکن ربیع بھی تھا۔

ربیع اگرچہ ایک نوخیز نوجوان تھا۔ اس میں نہ ابھی پختہ کاری تھی نہ اصابت رائے، نہ اس کا شمار اہلِ حل و عقد اور اربابِ فکر و نظر میں ہوتا تھا۔ بایں ہمہ اس نوعمری میں اس نے اپنے اخلاص فی اللہ، شجاعت اور جذبۂ اسلامی کا ایسا سکہ دلوں پر بٹھا دیا تھا کہ تمام اہم معاملات میں اس سے رائے بھی لی جاتی تھی اور اسے معاملات و مسائل کے انصرام میں شریک بھی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بغیر کسی اختلاف اور تامل کے وہ اس وفد کا ممبر منتخب کر لیا گیا۔ وفد کو ہدایت کی گئی کہ وہ جلد از جلد مدینہ منورہ روانہ ہو جائے۔

ربیع کے لئے یہ بڑی نازک گھڑی تھی ایک طرف فرض تھا دوسری طرف عشق۔ ایک طرف وہ وعدے یاد آ رہے تھے جو اس نے لیلےٰ سے کئے تھے دوسری طرف فرض پکار رہا تھا کہ لیلےٰ سے بے پروا ہو کر مدینہ چلا جانا چاہئے۔ وہ لیلےٰ پر اپنی زندگی قربان کر سکتا تھا۔ لیکن جہاں اسلام، قوم اور ملک کا سوال درپیش ہو وہاں لیلےٰ کو قربان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کر سکتا تھا۔ دل کے ٹکڑے ہو جائیں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایوانِ محبت منہدم ہو جائے کوئی پرواہ نہیں، آرزوئیں پامال ہو جائیں، امیدیں منقطع ہو جائیں۔ حسرتیں کبھی پوری نہ ہوں سب کچھ گوارہ کیا جا سکتا ہے لیکن قوم و ملت اور دین و مذہب کا کوئی مطالبہ نظر انداز کر دیا جائے

ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

کچھ دیر تو ربیع ذہنی کش مکش میں مبتلا رہا لیکن بہت جلد اپنے تاثرات پر غالب آگیا وہ سیدھا لیلٰے کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا۔

"لیلٰے میں مدینہ جا رہا ہوں۔ وہاں سے دمشق آؤں گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس نازک مرحلہ پر مجھے کوفہ سے باہر جانے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی لیکن فرض کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے جذبات اور نیت کو سمجھتی ہو لہٰذا کوئی برا اثر نہ لوگی ——— خدا حافظ!"

یہ کہا، گھوڑے پر بیٹھا اور ہوا ہو گیا ——— لیلٰے جواب میں خدا حافظ بھی نہ کہہ سکی۔ حیرت اور حسرت سے ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

باب ۲۳

خوابؒ اور حقیقتؒ

لیلیٰ اسی طرح کھڑی تھی۔

گم صم، خاموش، بیخود ____!

اور اس کے کانوں میں ربیع کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"لیلیٰ تم مجھے غلط نہ سمجھنا۔ فرض مجھے پکار رہا ہے اور میں اس کی پکار رد نہیں کرسکتا میں تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔ تم میرے دل کی آرزو ہو، آنکھوں کی حسرت ہو۔ تمناؤں کی جان ہو۔ تمہارے لئے سب کچھ تج سکتا ہوں لیکن قوم سب سے بالا ہے دین قوم پر بھی ترجیح رکھتا ہے۔ تم کو قوم پر، قوم کو دین پر قربان کرسکتا ہوں۔ قربان کر دوں گا۔ لیلیٰ! اب میں جاتا ہوں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، نہیں تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔ تمہارا تصور میرے ساتھ ہے۔ وہ میری رفاقت کرے گا۔ میرا ساتھ دے گا۔ میرا سہارا بنے گا میں مایوس ہوں گا تو مجھے تسکین دے گا۔ میری ڈھارس بندھائے گا میری مایوسی کو آس سے میرے اضطراب کو سکون سے، میری پریشانی کو یکسوئی سے بدل دیگا ___ اور ___ لیلےٰ ایک روز میں دمشق آؤں گا، اپنا فرض پورا کر کے، اور پھر تم میری بن جاؤ گی۔ میں منذر سے تمہیں لے لوں گا۔ میں یزید کے ایوان سے تمہیں چھین لاؤں گا۔ تم میری بن چکی ہو۔ میرا تمہارا رشتہ مقدر ہو چکا ہے۔ یہ اب کبھی قطع نہیں ہو سکتا۔ زندگی کے آخری سانس تک نہیں!

لیلےٰ کھڑی تھی!

اور اس کے کانوں میں ربیع کی آواز گونج رہی تھی۔

ربیع جا چکا تھا۔ بہت دور جا چکا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سامنے کھڑا ہے اور روزمرہ کی طرح دل میں کھب جانے والے انداز کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے۔

وہ اسی حالت میں کھڑی تھی کہ رقیہ دوڑتی ہوئی آئی وہ ہانپ رہی تھی اس نے کہا۔

منذر چچا آ گئے۔

لیلے کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رقیہ کے پیچھے منذر کھڑا تھا۔ منذر کو دیکھ کر وہ سہم گئی۔ وہ شیریں خواب جوان دونوں کے آنے سے پہلے دیکھ رہی تھی ایک طلسم باطل کی طرح درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ منذر نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"میری بچی! تیری طبیعت کیسی ہے؛ تیرا چہرہ زرد کیوں ہو رہا ہے؛ میں نے تجھے اس لئے بھیجا تھا کہ تو پہلے سے زیادہ تندرست اور چونچال ہو جائے گی لیکن میں تو ایسا محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے تو بیمار ہے کیا ہوا ہے تجھے؟"

ایک سانس میں منذر نے اتنی ساری باتیں کر ڈالیں۔ لیلے نے بہت مدھم آواز میں جواب دیا۔

"ابا جان! میں تو بالکل اچھی ہوں۔

رقیہ بول پڑی۔

"یہاں آکر تو ان کا رنگ نکھر گیا تھا۔ بڑی چونچال ہو گئی تھیں۔ لیکن چند روز سے نہ جانے کیا ہو گیا ہے واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کئی دن کی مریض ہو۔"

اتنے میں رقیہ کی بہن اور بہنوئی بھی آ گئے اور باتوں کا رخ بدل گیا۔

باب ۲۴

نافرمان

جب سے منذر آیا تھا لیلٰے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ بالکل خاموش ہو گئی تھی حتیٰ کہ رقیہ سے بھی اس نے بات چیت تقریباً ختم کر دی۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہتی تھی نہ اپنی کہتی تھی نہ کسی دوسرے کی سنتی تھی۔ رقیہ بار بار اس کے پاس آتی تھی۔ اس سے باتیں کرتی تھی۔ اسے ٹٹولتی تھی کئی نئی باتیں چھیڑتی تھی۔ لیکن لیلٰے کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا۔ وہ ہر بات کو ہوں ہاں کر کے ٹال دیتی۔ آخر تھک ہار کر رقیہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

ایک روز لیلٰے پیکرِ یاس و حرماں بنی اپنے کمرہ میں خاموش اور تنہا بیٹھی تھی کہ منذر آگیا۔ اس نے راز دارانہ طور پر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی آس پاس ہے تو نہیں۔ پھر اطمینان سے مسند پر بیٹھ کر تکیہ کی ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! میں تو یہاں چند روز میں گھبرا گیا۔ عجیب شہر ہے عجب لوگ ہیں۔ تیرا جی یہاں کس طرح لگ گیا؟"

لیلٰے:۔ آپ باہر آتے جاتے ہیں۔ لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ دمشق اچھا ہے یا کوفہ؛ وہاں کے لوگ بہتر ہیں یا یہاں کے میں تو جس طرح دمشق میں گھر کے اندر رہتی تھی اور رقیہ کے گھر کے سوا کہیں آتی جاتی نہیں تھی اسی طرح یہاں رہتی ہوں۔ اس لئے میرا تو جی نہیں گھبرایا۔ بلکہ رقیہ کی وجہ سے لگا رہا۔

منذر:۔ ہاں ٹھیک ہے لیکن اپنا گھر پھر اپنا گھر ہے۔ اپنا وطن پھر اپنا وطن ہے۔

لیلےٰ :۔ ہوگا ــــــ مجھے تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔
منذر :۔ بہر حال میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگلی بدھ کو جو قافلہ دمشق روانہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ چلا جاؤں۔ بس سمجھ لو دو روز سفر کا سامان تیار کرنے میں لگتے ہیں۔
لیلےٰ :۔ تو کیا آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے ؟
منذر :۔ ہاں بیٹی! یہاں غیروں کے گھر میں کب تک رہو گی آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے مہمانی کی۔
لیلےٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش ہو گئی۔
منذر :۔ رقیہ کہہ رہی تھی تم بہت بدل گئی ہو!
لیلےٰ :۔ (سہم کر) نہیں ابا جان میں تو بالکل نہیں بدلی جیسی تھی ویسی ہی ہوں۔
منذر :۔ ہاں میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ رقیہ نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ تم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔
لیلےٰ :۔ آپ کس طرح کی تبدیلی کا ذکر کر رہے ہیں ؟
منذر :۔ خیالات کی تبدیلی ــــ کیا تم نے یزید کے بارے میں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کی ؟
لیلےٰ :۔ نہیں ابا جان! میری جو رائے اس وقت تھی وہی آج ہے اور وہی دس برس بعد رہے گی۔
منذر :۔ اسے نہ بھولو کہ تم اپنے باپ سے گفتگو کر رہی ہو۔ اسے بھی پیشِ نظر رکھو کہ ذکر کسی معمولی شخص کا نہیں۔ ایسے شخص کا ہو رہا ہے جو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین ہے نہ میں اس کی توہین گوارا کر سکتا ہوں نہ اپنی ؟
لیلےٰ :۔ میرا ہرگز یہ ارادہ بھی نہیں کہ کسی کی توہین کروں۔
منذر :۔ آدمی بلا ارادہ بھی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ دوسروں کی توہین ہوتی ہے۔
لیلےٰ :۔ لیکن سزا تو ارادہ اور نیت پر ملنی چاہیئے۔
منذر :۔ میں بحث کرنا نہیں چاہتا۔ بہر حال ہم بدھ کو یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں اور وہاں

پہنچنے کے بعد سب سے پہلا کام جو انجام پائے گا وہ تمہاری شادی ہے۔

لیلےٰ:۔ (ایک عزم کے ساتھ) ابّاجان آپ مجھے زہر کیوں نہیں دے دیتے؟ آپ میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے؟ آپ اپنی اس تلوار سے میری گردن کیوں نہیں کاٹ دیتے؟ آپ اس طرح کی باتیں کیوں کرتے ہیں جس سے میری روح اذیت محسوس کرتی ہے؟ جنہیں میں کسی طرح قبول نہیں کرسکتی جنہیں میں سننا بھی نہیں چاہتی۔ جنہیں ماننے کے بجائے مرجانا پسند کرتی ہوں۔" یہ کہتے کہتے وہ بچوّں کی طرح پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

منذر کچھ دیر تو اس کی یہ کیفیت خاموشی لیکن برہمی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ پھر غصہ کے عالم میں اٹھا اور باہر چلا گیا۔ باہر جاتے جاتے درشت لہجہ میں کہا نافرمانی کی حد ہوگئی۔ بخدا میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر تیرا رویہ نہ بدلا تو بے شک تجھے زہر دیدوں گا۔ تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ تیری جان لے لوں گا۔"

باب ۲۵

آتش فشاں

حالات تیزی سے پلٹا کھا رہے تھے،
لیلٰے، منذر کے ساتھ با چشمِ اشکبار دمشق جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔
ربیع اہلِ کوفہ کا پیامبر بن کر مدینہ منورہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں روانہ ہو چکا تھا۔
اور کوفہ اس وقت ایسا آتش فشاں پہاڑ بنا ہوا تھا جس سے ہر آن لاوا ابل سکتا تھا اور ایک قیامت برپا کر سکتا تھا۔
منذر کو جلدی تھی کہ جلد از جلد دمشق جائے۔ اور لیلٰے کو یزید کے حجلۂ عیش میں پہنچا دے لیکن جس قافلہ کے ساتھ وہ جانے والا تھا اس نے اپنی روانگی ملتوی کردی تھی۔
حالات بدل رہے تھے۔ بگڑ رہے تھے۔ نازک سے نازک تر صورت اختیار کرتے چلے جا رہے تھے۔
منذر دن بھر بیکاری کے عالم میں شہر کا چکر کاٹا کرتا تھا۔ اس گشت کا مقصد یہ بھی تھا کہ معلوم کرے کوئی قافلہ دمشق کی طرف جا رہا ہے یا نہیں ؛ سامان بندھا رکھا تھا۔ وہ ہر وقت روانہ ہو سکتا تھا لیکن کوئی قافلہ جاتا ہوا نہیں ملا۔ اس عرصہ میں وہ کوفہ کے باشندوں سے، ان کے خیالات سے، ان کے جذبہ اور میلان سے پورے طور پر واقف ہو گیا وہ جس جگہ سے گزرتا تھا جس مسجد میں جاتا تھا جس محفل میں پہنچتا تھا کان میں ایک ہی صدا پڑتی تھی۔

"یزید نااہل ہے"
"یزید نالائق ہے"
"یزید فاسق وفاجر ہے"

یہ سنتے سنتے اس کے کان پک گئے ہر وقت حفاظتِ خود اختیاری کے لئے تلوار اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ یہ باتیں سن کر جی چاہتا تلوار میان سے باہر نکالے اور اس قسم کی مہمل باتیں کرنے والوں کی گردن اڑا دے ــــ لیکن مصلحت سنج تھا۔ جانتا تھا اگر کوئی ایسی بات منہ سے نکالی جس سے یزید کی حمایت کا پہلو نکلتا ہو تو عزت وآبرو کی خیر ہے نہ جان کی۔ لہٰذا دل میں خواہ کتنا ہی برہم ہو زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا۔

ایک روز جلا بھنا یزید کی برائیاں سنتا، لوگوں کو بغاوت کی تیاریاں کرتا اموی حکومت کے خلاف عوام میں غم وغصہ اور نفرت وحقارت کی کارفرمائیاں دیکھتا گھر واپس آیا۔ رقیہ، لیلےٰ اور سلمیٰ بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں آتے ہی وہ بھی بیٹھ گیا اور بڑے جلے بھنے لہجہ میں کہا۔

منذر:۔ اتنا قابلِ نفرت شہر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

رقیہ:۔ (اٹھلاکر) واہ ایسا نہ کہئے اتنا اچھا تو شہر ہے یہ!

منذر:۔ کیا اچھائی ہے اس میں؟

رقیہ:۔ یہاں کے لوگ اچھے ہیں۔ یہاں کی آب وہوا اچھی ہے۔ یہاں کے مناظر اچھے ہیں۔ سچ کہتی ہوں چچا جان! مجھے تو یہ شہر بہت پسند ہے جانے کو جی ہی نہیں چاہتا۔

منذر:۔ تمہیں پسند ہوگا میں تو نفرت کرتا ہوں اس شہر سے جی چاہتا ہے اڑ کر دمشق پہنچ جاؤں۔

سلمیٰ:۔ ابھی آپ نے اس شہر کی سیر ہی کہاں کی ہے؟ ہم ابھی آپ کو نہیں جانے دیں گے۔ کم از کم ایک مہینہ اور رہنا پڑے گا آپ کو۔

منذر :۔ نہیں بیٹی، ایک پل بھر یہاں نہیں گزار سکتا۔ اگر ابھی کوئی قافلہ جا رہا ہو تو اسی وقت چلا جاؤں ۔
رقیہ :۔ لیکن چچا جان! یہاں سے اتنے برہم کیوں ہیں آپ؟
منذر :۔ یہاں کے سازشی، انقلاب پسند اور شورش انگیز لوگوں سے تنگ آ گیا ہوں ۔
سلمیٰ :۔ کیا برائی دیکھی آپ نے یہاں کے لوگوں میں؟
منذر :۔ یہ لوگ خلافت اسلامیہ سے بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔
رقیہ :۔ (طنز سے) خلافتِ اسلامیہ!
منذر :۔ (گھور کر) لڑکی تیرا کیا خیال ہے کیا تو اموی خلافت کو خلافت نہیں سمجھتی؟
: جی نہیں یہ خلافت نہیں حکومت ہے اور حکومت بھی قوم کے کسی منتخب فرد کی نہیں، ایک غاصب، جابر اور شاطر شخص کی لوگ اگر بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں تو اچھا کر رہے ہیں۔ میری دعا ہے۔ کل کی ہوتی آج ہی ہو جائے۔
منذر :۔ نہیں ہو سکتی بغاوت ۔
سلمیٰ :۔ لیکن ابھی تو آپ فرما رہے تھے کہ لوگ بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں!
منذر :۔ یہ اب بھی کہتا ہوں۔ لیکن بغاوت کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ ناکام ہوں گی۔
سلمیٰ :۔ "یہ آپ کا خیال ہے"
منذر :۔ اور تمہارا کیا خیال ہے؟"
سلمیٰ :۔ "میرا خیال تو یہ ہے کہ بغاوت ہو گی اور ضرور ہو گی۔ اور میرا خیال یہ بھی ہے کہ ہونی چاہیئے"
منذر :۔ جو بغاوت کرتا ہے اس کا سر بھی کاٹ دیا جاتا ہے"
رقیہ :۔ ایک آدھ آدمی ہو تو اس کا سر بھی کچل دیا جائے۔ لیکن ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کا سر کچلنے اور کاٹنے کے لئے جلاد کہاں سے آئیں گے؟

منذر :۔ حکومت ہر طرح کا انتظام رکھتی ہے ۔ اس کے پاس جلادوں کی کمی نہیں۔
رقیہ :۔ وہ خود جلاد ہے ۔ اس کے پاس جلادوں کی کیا کمی ہوگی !
سلمیٰ :۔ میں اسے باور نہیں کر سکتی کہ یزید کے سپاہی اپنے دینی اور قومی بھائیوں کا گلا کاٹنے پر آمادہ ہو جائیں گے ۔"
منذر :۔ ضرور ہوں گے ۔ اصل چیز نظم و انصرام اور امن وامان ہے جو لوگ امن و امان کو درہم برہم کرنا چاہیں ۔ خلفشار اور ابتری پیدا کرنے کی کوشش کریں وہ کسی رحم و رعایت کے مستحق نہیں ہیں ۔
رقیہ :۔ اور وہ لوگ جو لوگوں سے جبری بیعت لیں ۔ مذہب کے خلاف عمل کریں ۔ خدا کو بھول جائیں ۔ رسول کی ہدایت فراموش کر دیں ۔ کیا اس قابل ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے ؟
منذر :۔ ہاں ! امیر کی اطاعت واجب اور فرض ہے ۔
رقیہ :۔ میں نہیں مانتی ۔
منذر :۔ (غصّہ سے) تو اسلام کو ماننے سے انکار کرتی ہے ۔ بیوقوف لڑکی ! یہ اسلام کا حکم ہے ۔ اسلام کا فرمان ہے ۔ اگر کوئی نکٹا اور بد صورت حبشی بھی تمہارا حکمران ہو تو اس کی اطاعت کرو ۔"
رقیہ :۔ "بشرطیکہ اس کی اطاعت اسلام کے راستے میں حارج نہ ہوتی ہو ۔
منذر :۔ سب سمجھ گیا ۔ سلمیٰ کو گمراہ کرنے والی تو ہے ۔"
رقیہ :۔ (مسکراکر) نہیں چچا جان ! سلمیٰ نے مجھے راہِ ہدایت دکھائی ہے ۔ یہ اسی کا فیضِ صحبت ہے ۔ کہ میری آنکھیں کھلیں ۔ اور میں نے راہِ حقیقت دیکھ لی ۔"
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سلمیٰ کا شوہر آگیا ۔ اس نے منذر سے کہا ۔
چچا جان ! کل علی الصباح ایک قافلہ دمشق جا رہا ہے ۔
منذر خوش ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے کہا ۔

بیٹے ! بہت شکر گزار ہوں تمہارا . . . . چلو بیٹی لیسلے سامان درست کرو۔
ہم صبح چل رہے ہیں۔
لیسلے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اپنی کوٹھڑی کی طرف چلی گئی۔

باب ۲۶

سبطِ رسولؐ کے دربار میں

مدینۃ الرسول کی روحانی عظمت اور منزلت کے سامنے ہر مسلمان سرِ عقیدت خم کرتا تھا۔ اگرچہ اس تہائی صدی کی مدت میں اسلام کے پیرو بہت کچھ بدل گئے تھے۔ انہوں نے عجمی تکلفات کا اپنے آپ کو عادی بنالیا تھا۔ عجمیوں کے طور طریقے سیکھ لیے تھے۔ وہ عربیت وہ اسلامیت وہ للّٰہیت، جوان کا طرۂ امتیاز تھی۔ حرمین کے باہر ختم ہوتی نظر آرہی تھی۔ لیکن جہاں تک مدینہ منورہ کا تعلق تھا۔ آج بھی وہی اسلامیت اور للّٰہیت نظر آتی تھی جس کا جلوہ چشمِ تماشا نے صدرِ اوّل یعنی عہدِ رسالت اور دورِ خلفائے راشدین میں دیکھا تھا۔ اِس ارضِ مقدس کے رہنے والے دنیا سے مانوس نہیں تھے۔ جتنے رب العالمین سے۔ یہ غریب تھے۔ بے مایہ تھے تباہ حال اور آشفتہ روزگار تھے مالی اور اقتصادی اعتبار سے زبوں حال تھے لیکن اپنے حال میں مست، مسجدِ نبویؐ کے ماذنہ سے جب صدائے اللہ اکبر اور لا الٰہ بلند ہوتی۔ تو اَب بھی ان کے دل دہل جاتے اور آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ جیسے حضرت بلال حبشیؓ اسی جگہ پر سرکارِ دوعالمؐ کی موجودگی اور مواجہہ میں صدائے تکبیر بلند کر رہے اور سرورِ کائنات کے پیچھے سب لوگ صف باندھ کر نماز کے لئے کھڑے ہوا چاہتے ہیں۔

یزید کی ولیعہدی پر مدینہ کے لوگوں میں اتنا اضطراب نہیں تھا جتنا اس کی خلافت کی خبر سے برہم اور مضطرب نظر آتے تھے۔ اس کی ولی عہدی سے وہ اس لیئے نالاں تھے کہ اصولاً وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ولیعہدی موروثی ہو۔ اگر اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ بھی اپنے لائق، صالح اور اہل صاحبزادوں کو موروثی

طور پر امرِ خلافت سونپنا چاہتے تو یقیناً وہ اختلاف کرتے۔ اور اس اقدام کو پسند نہ کرتے ورنہ ویسے انہیں یزید سے کوئی کد نہ تھی اور کچھ بات بھی تھی کہ وہ یزید کے طور طریقوں کو جن کی شہرت عام تھی پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اب کہ وہ سریر آرائے خلافت ہوا اور اس کے بارے میں جو اندیشے تھے۔ وہ صحیح ثابت ہوئے اور اس کی رنگرلیوں مجلس طرازیوں اور عیاشیوں کی داستانیں عام ہوئیں تو قدرتاً ان میں برہمی پیدا ہوئی وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جس مسند پر فخرِ موجودات سرورِ کائنات رونق افروز تھے اور پھر آپ کے بعد جس کی زینت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و حیدرؓ سے ہوئی تھی۔ اس پر ایسا شخص متمکن ہو جس کے فسق و فجور کی خلقِ خدا گواہ ہو۔ جسے اسلام کی تعلیمات، اسلام کا فلسفہ اور اسلام کی بنائی ہوئی صراطِ مستقیم سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو یہ اسلام کی توہین تھی۔ واقعی اسلام کی توہین تھی اور اس توہین کو کوئی مسلمان بھی ہنسی خوشی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

یزید کے مسند آرائے خلافت ہونے کے بعد سے مدینہ کے مسلمان ہیجان و اضطرابِ قلبی کا اظہار کرتے تھے لیکن حضرت امام حسینؓ انہیں صبر و تحمل کی تلقین کرتے تھے۔ آپ کا موقف یہ تھا کہ حالات جب تک بالکل مایوس کن صورت نہ اختیار کر لیں اس وقت تک صبر و برداشت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تھا کہ آپ یزید کی بیعت کرنے میں احتیاط برت رہے تھے۔ مدینہ کا حاکم جو یزید کی طرف سے مامور تھا۔ بار بار بیعت پر اصرار کرتا تھا۔ لیکن آپ اس کے اصرار کو نظر انداز فرماتے رہے۔

اسی اثنا میں کوفہ کا وفد آگیا۔ جس کا ایک رکن ربیع بھی تھا۔ یہ وفد امام عالی مقام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے بسط و تفصیل سے عہدِ یزید کی کج آرائیاں اور گمراہیاں بیان کیں۔ یزیدی حکام و عمال کی زیادتیاں، سختیاں اور سفاکیاں بتائیں۔ اموی حکام و عمال کے کردار و سیرت کے گھناؤنے رُخ پیش کئے اور بعد ادب التماس کی کہ کوفہ تشریف لے چلئے۔ کوفہ آپ کا انتظار کر رہا ہے، کوفہ آپ کا استقبال

کرنے کے لیے بے چین ہے۔ کوفہ ان غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہے جو اس سے سرزد ہو چکی ہیں۔ کوفہ موجودہ غیر اسلامی غیر عادلانہ اور غیر صالح نظام حکومت کو برداشت نہیں کر سکتا وہ چاہتا ہے کہ اسلام کی حکومت ہو، اسلام کا سکہ چلے، اسلام کا بول بالا ہو ..... اگر یزید سریر آرائے خلافت رہا اور اس کے حکام و عمال بر سر اقتدار رہے تو اسلام، اسلام نہ رہے گا۔ کچھ اور ہو جائے گا۔ آپ اسلام کے پاسبان ہیں۔ اٹھیے، تشریف لے چلیے اور اسلام کے دفاع و بقا کے لئے میدان میں جلوہ فرما ہوئیے۔ وفد کے ارکان میں یوں تو سب نے بڑے جوش و خروش سے اپنے خیالات پیش کیے۔ لیکن ربیع کا جوش قابلِ دید تھا۔ وہ پیکرِ جذبات بنا ہوا تھا اس کا ایک ایک لفظ۔ ایک ایک بول جذبۂ دروں کی منہ بولتی تصویر تھی۔ اس نے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"امام عالی مقام! ہم میں سے ہر ایک خدا سے عہد کر چکا ہے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ہماری نماز، قربانی، زندگی اور موت سب خدا اور صرف خدا کے لئے ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ اسلام کے فداکار ہیں۔ لیکن اپنی آنکھوں سے شعائرِ اسلام کی پامالی دیکھ رہے ہیں۔ مسجدوں میں نماز بے وقت پڑھی جاتی ہے۔ خطبوں میں اکابر اسلام پر سب و شتم کی جاتی ہے۔ اعمال و افعال میں اسلام کی روح کہیں کہیں جھلکتی۔ یہ ہمارے حکمران ہیں۔ یہ اسلام کے ترجمان ہیں۔ یہ ملتِ اسلامیہ کے نمائندے ہیں۔

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اسلام نے ہمیں پکارا اور ہم لبیک کہتے ہوئے آستانۂ رسولؐ پر حاضر ہو گئے۔ ہم اس در پر آئے ہیں۔ تاکہ اپنے عہد کی تجدید کریں۔ اور پھر یہاں سے صاف دل اور پاک نیت کا توشہ لے کر کوفہ روانہ ہو جائیں۔ ہم آپ کے پاس راہنمائی کے طالب ہو کر آئے ہیں۔ ہم اس لئے آئے ہیں کہ بھٹکے ہوئے ہیں ہماری راہنمائی کیجئے۔ ہم گم کردہ راہ ہیں۔ ہمیں صراطِ مستقیم پر پہنچا دیجئے۔ ہم اپنے اعمالِ بد کے باعث ایک ایسی حکومت کے تابع بن گئے ہیں جو اگرچہ اسلامی ہے لیکن اس کی کارگزاریاں تمام تر غیر اسلامی ہیں۔ ہم ایک ایسے شخص کی بیعت پر

مجبور ہو گئے ہیں جسے نہ اسلام سے کوئی تعلق ہے نہ اسلام کے داعی علیہ السلام والسلام سے ..... اس زندگی پر ہمیں شرم آتی ہے۔ اس زندگی سے ہمیں نفرت ہو گئی ہے۔ اس زندگی سے ہم اکتا گئے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر زندہ رہیں گے تو مسلمان بن کر ورنہ اس زندگی سے اس کی رعنائیوں سے باز آئے۔ اس زندگی سے وہ موت کہیں اچھی ہے۔ جو خدا کے راستہ میں آئے ؎

جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

شاید ابھی ربیع کی تقریر جاری رہتی کہ اذانِ مغرب کی صدا بلند ہوئی اور اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ جناب امام اذان کے الفاظ آہستہ آہستہ دہرا رہے تھے۔

باب ۲۷

میں کسی فضیلت کا مدعی نہیں

امام عالی مقام نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ آج پہلی مرتبہ ربیع کو نماز میں لطف آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ساری عمر رکوع و سجود میں صرف ہو جائے۔ وہ ہمیشہ سے پابند صوم و صلوٰۃ تھا۔ نماز پڑھتا تھا ایک فرض سمجھ کر۔ لیکن وہ لذت جو آج حاصل ہوئی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل یکتا انوکھی اور کچھ عجیب سی تھی۔

نماز کے بعد حضرت اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ ربیع بار بار چہرہ مبارک کی طرف دیکھتا تھا اور جلال و جمال کے اس رُخ پر انوار کو دیکھ کر فرطِ عقیدت و محبت سے آنکھیں نیچی کر لیتا تھا۔ حضرت ابھی آکر بیٹھے ہی تھے کہ کچھ اور لوگ آ گئے۔ کوئی سوال کرتا۔ کوئی فتویٰ پوچھتا۔ کوئی اپنی پریشانیاں بیان کرتا۔ کوئی اپنی ذاتی اور خانگی مصیبتوں کا دکھڑا لے کر بیٹھ جاتا۔ آپ سب کی سنتے۔ سب کو تسلی دیتے۔ سب کی دلجوئی کرتے۔ بیماروں کے لئے دعا کرتے۔ پریشان حالوں کو صبر کی تلقین کرتے ربیع نے ایسا محسوس کیا کہ آپ جس سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس کا دل موہ لیتے ہیں۔ آپ جب تک خاموش رہتے ہیں۔ کہنے والا اپنی ہی کہتا رہتا ہے۔ لیکن جب فرماتے ہیں تو الفاظ اتنے شیریں اور باتیں اتنی دلنشین ہوتی ہیں۔ کہ پھر اسے کچھ کہنے کا یارا نہیں رہتا۔

تھوڑی دیر میں آنے والے لوگ رخصت ہو گئے۔ اب صرف ربیع اور اس کے رفقاء باقی رہ گئے۔

حضرت نے ربیع کو مخاطب کر کے فرمایا

"تمہارے جذبہ کی میں قدر کرتا ہوں۔ تمہاری پُرجوش باتیں سن کر میرے دل میں۔ تمہاری محبت پیدا ہوگئی۔ تم نوجوان ہو۔ لیکن نیکوکار اور صالح۔ تم میں دنیا کو دیکھنے۔ دنیا کو برتنے۔ دنیا سے لطف اندوز ہونے اور دنیا کی لذتوں میں اپنا حصہ تلاش کرنے کی اتنی امنگ نہیں ہے جتنی دنیا۔ لذات۔ دنیوی اور اپنی ذات تک کو خدا اور رسولؐ پر قربان کر دینے کی آرزو۔ اگر ہمارے نوجوانوں میں خاص کر ان لوگوں میں جو طلب دنیا کے لئے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں یہ جذبہ عام ہو جائے۔ تو پھر یہ ساری تاریکیاں اور گمراہیاں جو آج نظر آ رہی ہیں ابھی اور اسی وقت کافور ہو سکتی ہیں۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی اندازِ گلستان پیدا

لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم پر دنیا غالب آتی جا رہی ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔

یہ کہتے کہتے حضرت کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ ربیع اور دوسرے لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلکنے لگے۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر حضرت نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

"تم نے ابھی اموی حکومت اور یزید کی خلافت کے بارے میں بھی کچھ کہا تھا؟"

ربیع نے عرض کیا "یا حضرت! بے شک میں نے اس سلسلہ میں اپنے معروضات پیش کئے تھے۔"

حضرت نے ارشاد فرمایا "تم نے جو کچھ کہا اس کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہو چکی ہے۔ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے۔ اگر واقعی صحیح ہے تو پھر بیعت اور مفاہمت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ پھر ایک ہی چارۂ کار ہے۔ جہاد۔ جنگ.......

اس وقت تک جب تک کلمۃ اللہ بلند ہو جائے۔ جب تک باطل غائب و خاسر نہ ہو جائے۔ جب تک حق کا بول پورے طور پر بالا نہ ہو جائے۔ لیکن میرے عزیز! یہ بہت بڑا اور بالکل آخری اقدام ہے۔ اس اقدام کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔

یزید کی سیرت اور کردار کے بارے میں مشہور باتوں کی ایسی تصدیق جو یقین کے درجہ تک پہنچ جائے۔

دوم، اتمام حجت۔

ربیع "یا حضرت اتمام حجت سے کیا مراد ہے؟"

حضرت امام" بالفرض یزید فاسق و فاجر ثابت ہو جائے۔ تو بھی ہم اس کے خلاف اس وقت تک اقدام نہیں کرنا چاہتے۔ جب تک اتمام حجت نہ کر لیں۔ اسے راہِ راست پر لانے کی سعی نہ کر لیں۔ اگر وہ اپنی حرکات و افعال سے باز آجاتا ہے تائب ہو جاتا ہے۔ تو پھر ہمیں اس سے کوئی پرخاش نہیں۔ وہ شوق سے حکومت کرے۔"

ربیع :- کیا آپ اس کی بیعت کریں گے؟"

حضرت امام :- ہاں کیوں نہیں؟"

ربیع :- (جذبہ کے عالم میں) یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔

حضرت امام :- (ملاطفت کے ساتھ) کیوں؟ یہ بات تمہیں ناگوار گزری تم خفا کیوں ہو گئے؟"

ربیع :- سبطِ رسولؐ۔ جگر گوشہ بتولؑ اور فرزند حیدرِ کرار ابن معاویہ کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہوا تو زمین پھٹ جائے گی۔ آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ یہ آپ کی توہین ہے...... خاندانِ رسالت کی توہین ہے۔ عزت نبوی کی توہین ہے۔

حضرت امام :- (زیرِ لب تبسم کے ساتھ) نہیں یہ نہ کہو۔ اسلام میں میراث نہیں چلتی اسلام

صرف "تقویٰ" کا قائل ہے اگر میراث چلتی ہوتی تو سرورِ کائنات کسی کو اپنا جانشین بنا جاتے۔ اگر تقویٰ کے علاوہ کوئی اور چیز اہلیت کی بنیاد ہو سکتی تو بلاشبہ ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمانؓ و حیدرؓ کو مسند آرائے خلافت ہونے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن میرے عزیز! ایسا نہیں ہے۔ اگر یزید صاحبِ تقویٰ ہے۔ امت اسے پسند کرتی ہے تو سب سے پہلے جو شخص اس کی طرف دستِ بیعت بڑھائے گا وہ حسین ابن علیؓ ہوگا۔ میں اگر یزید کی بیعت میں تامل کر رہا ہوں اور اتمامِ حجت کے بعد اس سے لڑنے اس کے خلاف صف آرا ہونے اور اس سے جہاد کرنے پر تیار ہوں تو اس لئے نہیں کہ خلافت میرا موروثی حق تھا۔ جسے یزید نے دبالیا۔ اس لئے کہ میں مسلمان ہوں اور کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر سکتا جو اقدارِ اسلامی کا لحاظ نہ کرتا ہو۔ میری جدوجہد۔ میری سعی و کوشش۔ صرف ایک مسلمان کی حیثیت سے ہے نہ کہ سبطِ رسول کی حیثیت سے اگرچہ اس فخر پر میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ بنتِ رسولؐ اور برادرِ رسولؐ کا فرزند ہوں۔ رسولِ اکرمؐ کی گود میں کھیلا ہوں۔ زبانِ نبوت سے میرے اور میرے بھائی کے لئے سید اشباب اھل الجنت کی نوید صادر ہوئی ہے۔ لیکن کوئی مسلمان کسی فضیلت کا مدعی نہیں۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔ اور کچھ نہیں۔ تم اگر میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو اس لئے نہ دو کہ خاندانِ نبوی کا ایک فرد ہوں۔ صرف اس صورت میں دو اگر مجھے برسرِحق سمجھتے ہو۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔ واللہ علیٰ ما اقول شہید۔

حضرت کے دہن مبارک سے یہ الفاظ نکل رہے تھے اور حاضرین پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کَانَ عَلٰی رُؤُسِہِم الطیر۔

باب ۲۸

شرطِ جہاد

حضرت کی تقریر گویا ایک سحر تھی۔ جس نے سب کو مسحور کر رکھا تھا۔ اس تقریر نے دل کی آنکھیں کھول دیں۔ کتنے خیالات تھے جنہوں نے عقائد کی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ پادر ہوا ثابت ہوئے کتنے عقیدے تھے جو باطل تھے اور دل میں جاگزیں ہو چکے تھے وہ نقشِ باطل کی طرح محو ہو گئے۔ اب ایک بالکل نیا نقطۂ نظر سامنے آیا تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں یہ اسلام اور اس کے فلسفہ سے قریب تر تھا۔ ربیع نے پوچھا۔

"یا حضرت اگر اتمام حجت کے بعد بھی یزید راہِ راست پر نہ آیا۔ باطل پر اڑا رہا اور حق کو ٹھکراتا رہا تو کیا ہو گا؟"

آپ نے بے تامل فرمایا:۔

"پھر ہم بشرط استطاعت جہاد کریں گے۔"

ربیع کے کانوں میں پھر ایک نئی بات پڑی بشرطِ استطاعت"

کیا حق کے لئے لڑنے، حق کی راہ میں جان قربان کرنے اور حق کی خاطر گردن کٹا دینے کے لئے بھی استطاعت کی شرط ہے۔ ؟ پھر تو ایثار نہ رہا۔ کارو بار ہو گیا پھر اسے سودا کہیں گے قربانی نہیں کہہ سکتے۔ حق کے لئے جو کچھ کیا جائے وہ غیر مشروط ہونا چاہیئے۔ یہ حزم و احتیاط یہ حدود و شرائط تو ان لوگوں کے لئے ہیں جو حق کے راستے میں ناپ تول کر قدم رکھتے ہیں۔ لیکن جو مرتے ہی حق کے لئے ہیں انہیں ان نکتہ سنجیوں سے کیا کام۔ !

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ربیع کے دل میں یہی خیالات موجزن تھے۔ اور وہ خاموش تھا۔ لیکن اب ضبط کرنا اس کے اختیار سے باہر ہوگیا تھا۔ وہ بول پڑا۔

" یاحضرت! آپ کے فرمودات سر آنکھوں پر۔ لیکن راہِ خدا میں " شرطِ استطاعت" کے ساتھ گامزن ہونا۔ اس خادم کی سمجھ میں نہیں آیا۔"

حضرت امام نے تبسم فرمایا۔ اور شفقت آمیز نظروں سے ربیع کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔

" میرے عزیز یہ شرط بہت ضروری ہے بغیر اس کے میں ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

ربیع نے پھر عرض والتجا کے لہجہ میں کہا۔

" یا امام! میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیوں؟ ——— کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟

جناب امام نے فرمایا!

" ضرور ہیں۔ لیکن استطاعت لازمی ہے۔ ایک مسلمان کا خون بھی رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ مسلمان کا خون میری نظر میں حرم سے کم محترم نہیں ہے اگر اتمام حجت کے بعد عامتہ المسلمین میری ہمنوائی کریں گے۔ میرا ساتھ دیں گے تو نفیر جہاد بلند کروں گا۔ اور باطل کے مقابلے میں ڈٹ جاؤں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میرے لئے دو ہی راستے ہیں یا تن تنہا باطل سے ٹکراؤں اور اپنی جان جان آفرین کو سونپ دوں۔ یا اس ملک سے ہجرت کر جاؤں۔"

ربیع :—— اتمام حجت اور عامتہ المسلمین کی ہمنوائی کی صورت کیا ہوگی"——؟

امام حسینؑ ——" تم کوفہ سے آئے ہو۔ تمہارے اخلاص و صداقت پر مجھے اعتماد ہے۔ لیکن میرے پاس اس کا ثبوت ہونا چاہیئے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کی تائید اہل کوفہ کر رہے ہیں۔ اگر میں مطمئن ہوگیا تو ضرور اتمامِ حجت کے بعد کوفہ کا رُخ کروں گا۔ اس لئے کہ میں حرمین کو جنگ و جدال کا میدان بنانا نہیں چاہتا۔

یہی روش میرے والدِ ماجد کی بھی تھی۔ انہوں نے مدینہ چھوڑ کر کوفہ کو دارالخلافہ اسی مصلحت سے بنایا تھا۔"

ربیع :۔ "بجا ارشاد ہوا۔ یہ مصلحت بہت صحیح ہے۔ اور میں پورے طور پر اسے سمجھ گیا۔"

امام حسینؑ ـــــ "اب رہا! اتمامِ حجت کا معاملہ تو میں یزید سے ملنا نہیں چاہتا۔ اپنے کسی آدمی کو بھی اس کے پاس بھیجنا نہیں چاہتا۔

ربیع :۔ "یہ کیوں حضرت؟"

امام حسینؑ :۔ "اس سے اشتعال پیدا ہوگا۔ پھر وہ مسئلہ پر مسئلہ کی حیثیت سے نہیں۔ ذاتیات کی روشنی میں غور کرے گا۔ اور ویسا ہی جواب دے گا۔"

ربیع :۔ "پھر کیا ہونا چاہئے۔؟"

امام حسینؑ :۔ "اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا شخص جس کا دامن جانبداری سے ملوث نہ ہو یزید کے پاس جائے۔ اس سے ملے، اس سے گفتگو کرے۔ اس کے طور طریقے دیکھے۔ اگر وہ مطمئن ہو جائے کہ ہاں واقعی یزید کی زندگی خلافِ اسلام معمولات پر مشتمل ہے اور یزید کی حکومت غیر اسلامی دستور و آئین کی پابند ہے، تو نصیحت کرے، ملاطفت اور خیر سگالی کے ساتھ اس سے گفتگو کرے۔ اسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرے، اگر وہ مان لے تو سبحان اللہ، نہ مانے تو پھر اتمامِ حجت ہو جائے گی۔ پھر ہمارا اور اس کا راستہ جدا ہو جائے گا۔"

ربیع :۔ "لیکن وہاں کون جائے گا۔ اور اگر جائے گا بھی تو کون گفتگو کر سکے گا اس سے؟"

امام حسینؑ :۔ (ذرا تلخی کے ساتھ) کیوں؟ کیا وہ عرب قوم مر گئی ہے جس کے افراد برسرِ منبر خلیفہ راشد عمر فاروقؓ تک کو ٹوک دیا کرتے تھے؟ آج اس کا کوئی فرد یزید سے دو ٹوک بات نہیں کر سکتا۔ اگر یہی بات ہے تو ہمیں فاتحہ ہی پڑھ لینا چاہئے۔ اور یقین کر لینا چاہیئے۔ ہمارا دورِ حشمت ختم ہو گیا اور ہم انحطاط و زوال کی منزل تک پہنچ گئے۔

ربیع :۔ "یا امام ایسا نہیں ہے۔ عرب قوم زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔ اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ اس کے افراد کے سینہ میں وہی دل دھڑک رہا ہے جو خلفائے راشدین اور عہد رسالت میں دھڑکا کرتا تھا"

امام حسینؑ :۔ "کاش ایسا ہو"

ربیع :۔ "اگر اجازت ہو تو غلام اس خدمت کو بجالائے"

امام حسینؑ :۔ "یعنی تم جاؤ گے۔ یزید کے پاس؟"

ربیع :۔ "یا حضرت! میرا یہی ارادہ ہے۔ بے شک میں جھجک رہا تھا اس کے سامنے جاتے ہوئے۔ لیکن آپ کے ارشادات سن کر وہ جھجک جاتی رہی۔ اب میرے اندر وہی غیرت اور حمیّت کام کر رہی ہے جو ایک عرب کا، ایک مسلمان کا شعار ہونا چاہیئے۔ بیشک اس کے سامنے جاؤں گا اس کے احوال کی تحقیق کروں گا اور اس سے دو ٹوک گفتگو کروں گا"

امام حسینؑ :۔ "اگر یہ بات ہے تو بہ شوق جاؤ۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ ہم تمہارا انتظار کریں گے اور تمہارے تاثرات دلچسپی سے سنیں گے۔ وہاں سے سیدھے یہاں آؤ۔"

ربیع نے جواب میں کہا۔

"بہت خوب! انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا"

مجلس برخاست ہوگئی۔

باب ۲۹

ولید بن عتبہ حاکمِ مدینہ

بعض اوقات اتنے اچانک اور غیر متوقع طور پر حالات پلٹا کھاتے ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت امام عالی مقام اور ربیع میں اسلامِ حجت، شرطِ جہاد اور نصبِ خلافت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی وقت حاکمِ مدینہ ولید بن عتبہ بن ابو سفیان اور بہت بڑے فتنہ انگیز اور بد سرشت مروان بن الحکم میں ایک نہایت اہم اور پیچیدہ مسئلہ پر بات چیت ہو رہی تھی۔ ولید بہت پریشان نظر آ رہا تھا اور مروان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ولید نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میری عقل حیران ہے؟"

مروان بن الحکم :۔ آپ سے پہلے میں مدینہ کا حاکم رہ چکا ہوں میرے سامنے بھی بڑے طوفان آئے۔ ہنگامے ہوئے۔ شورشیں برپا ہوئیں۔ لیکن نہ میرے دل نے میرا ساتھ چھوڑا نہ دماغ نے۔"

ولید بن عتبہ :۔ جانتا ہوں ــــــ لیکن ولید، ولید ہے اور مروان، مروان۔

مروان بن الحکم :۔ آپ نے حسینؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ کو بلوایا ہے یا نہیں؟

ولید بن عتبہ :۔ کیسے نہ بلواتا؟ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ امیر المومنین یزید نے اپنے فرمان میں یہ الفاظ واضح تحریر فرمایا ہے۔ کہ حسینؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ سے فوراً بیعت لے لو۔ اور جب تک ان سے بیعت نہ لے لو۔ اپنے پاس سے جانے کی اجازت نہ دو۔"

مروان بن الحکم :۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر بیعت سے انکار کریں تو گرفتار کر لو۔"

ولید بن عقبہ :- ہاں، اس کا مطلب یہی ہے ۔

مروان بن الحکم :- تو میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ خواہ ساری دنیا بیعت کر لے مگر حسینؑ بیعت نہیں کریں گے ۔ لہٰذا گرفتاری کا ساز و سامان تیار رکھو ۔

ولید بن عقبہ :- خدا کرے اس کی نوبت نہ آئے ۔ میں ہرگز انہیں کوئی تکلیف اور زحمت دینا نہیں چاہتا ۔ ذرا سوچو تو وہ کون ہیں ؟

مروان بن الحکم :- حاکم وقت صرف ایک بات سوچتا ہے ۔ اس کا کام کس طرح بنے گا ! رحم ، مروت ، عقیدت ، نرمی ۔ یہ چیزیں ایک آدمی کی شرافت اور حاکم کی کمزوری اور ناکامی کی دلیل ہیں ۔

ولید بن عقبہ :- خدا تم سے پناہ میں رکھے ۔ کیسی باتیں کر رہے ہو آج ؟

مروان بن الحکم :- صاف اور دو ٹوک بات کہنا ۔ میری سرشت ہے ۔ جانتے ہو اگر میں حاکم ہوتا تو کیا کرتا ؟ معلوم ہے میں تمہیں کیا مشورہ دینا چاہتا ہوں ۔

ولید بن عقبہ :- بخدا نہیں ۔ لیکن جاننا چاہتا ہوں ۔ بتاؤ کیا کرتے ۔ کیا مشورہ ہے تمہارا ۔ ؟

مروان بن الحکم :- ان میں سے ہر ایک شخص کو جو بیعت سے .....

ولید بن عقبہ :- استغفر اللہ ۔ واقعی تم عجیب انسان ہو ۔ گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ امام حسینؑ آتے ہوئے نظر آئے ۔ ولید بن عتبہ انہیں دیکھ کر فرط عقیدت سے کھڑا ہو گیا ۔ مروان کو بھی بادلِ نخواستہ اس کا ساتھ دینا پڑا ۔ حضرت امام آکر بیٹھ گئے اور دریافت فرمایا ۔

" تم نے مجھے بلایا ، میں چلا آیا ۔ لیکن اتنی تاکید کے ساتھ تم نے کبھی ملنے کی خواہش نہیں کی تھی ۔ ضرور کوئی خاص بات ہے ۔

ولید بن عقبہ :- جی ہاں ۔ میں نے آپ کو ایک خاص مقصد کے تحت تکلیف دی ہے ۔

امام حسینؑ :- کہو ۔ وہ کیا مقصد ہے ؟

ولید بن عقبہ :- امیر المومنین یزید کا ایک فرمان آیا ہے ۔ اس میں حکم دیا گیا ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ سے عبداللہ بن عمرؓ سے اور آپ سے امیر المومنین کی خلافت پر بیعت لے لوں ۔

اس وقت تکلیف دینے کا یہی مقصد ہے۔"

امام حسینؑ :- کیا مدینہ کے لوگوں نے بیعت کر لی ہے ؟

ولید بن عقبہ :- جی اکثر نے نہیں کی۔

امام حسینؑ :- کیا تم چاہتے ہو۔ چپ چپاتے بیعت کر لوں ؟ بخدا یہ نہیں ہو سکتا۔

ولید بن عقبہ :- (پریشان ہو کر) پھر کیا صورت ہو گی بیعت کی ؟

امام حسینؑ :- معقول صورت یہ ہے کہ اہل مدینہ کو جمع کرو۔ یہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کرو۔ میں بھی اس مجمع میں موجود ہوں گا لہذا جو سب کی رائے ہو گی۔ وہی کیا جائے گا۔ کیا تمہیں اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے ؟

ولید بن عقبہ :- بہت معقول تجویز ہے ——— میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔

امام حسینؑ :- اچھا ! اب ہم جاتے ہیں ——— والسلام علی من اتبع الھدیٰ (اس پر سلامتی جو ہدایت قبول کرے)

حضرت امام اس گفتگو کے بعد تشریف لے گئے۔ مروان بن الحکم پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس نے حضرت امام کے تشریف لے جاتے ہی نہایت تلخ لہجہ میں کہا۔

"افسوس تم نے میرا کہنا نہ مانا اور حسینؑ کو چلا جانے دیا۔ اب جب تک تمہارے اور ان کے درمیان خونریزی نہ ہو تم ان پر قابو نہیں پا سکتے۔ بڑی سخت غلطی کی تم نے۔"

ولید بن عقبہ :- تمہارے خیال میں مجھے چاہیئے تھا کہ انہیں گرفتار کر لیتا ؟

مروان بن الحکم :- نہیں ——— میرا خیال ہے تمہیں چاہیئے تھا کہ حسینؑ کو قتل کر دیتے۔ اور یہ کام بہر حال کرنا پڑے گا خواہ آج خواہ کل ؟

ولید بن عقبہ :- کتنے افسوس کا مقام ہے کہ تم مجھے ترغیب دے رہے ہو کہ حسینؑ کو قتل کر دوں ؟

مروان بن الحکم :- میں ترغیب نہیں دیتا، اصرار کرتا ہوں۔ تاکید کرتا ہوں۔ زور دیتا ہوں۔ اس معاملہ میں پہلا اور آخری چارۂ کار یہی ہے۔

ولید بن عقبہ :- خدا کی قسم ! قیامت کے دن جس شخص سے خونِ حسینؑ کا مطالبہ کیا جائے گا۔ وہ بڑے گھاٹے میں رہے گا۔ میں ایسے خسارے کا سودا نہیں کر سکتا۔

مروان بن الحکم :۔ (زہر خند کے ساتھ) مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔۔ بہر حال اپنے اس کارنامہ پر دربار یزید سے صلہ اور انعام کا انتظار کرو۔

ولید بن عتبہ :۔ دیکھا جائے گا میری نیت نیک ہے۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے یہی کرنا چاہیئے تھا جو میں نے کیا اور میں سمجھتا ہوں۔ ایک دن آئے گا کہ تم میری رائے پر صاد کرو گے۔"

مروان بن الحکم :۔ نہیں وہ دن کبھی نہیں آئے گا..... آ ہی نہیں سکتا۔"

باب ۳۰

مدینہ چھوٹتا ہے

مروان، ولید کے اس رویہ سے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اسے یہ بات سخت ناپسند تھی کہ امام حسینؑ مدینہ کے دارالامارۃ میں آئے اور یزید سے بیعت کئے بغیر واپس چلے گئے۔ آخر وہ ضبط نہ کرسکا۔ دوسرے روز رات کو ولید کے پاس پہنچا اور رکھائی کے ساتھ کہا۔

"میں آپ سے کچھ صاف صاف باتیں کرنے آیا ہوں"

ولید بن عتبہ:۔ ضرور۔ میں ہمہ تن گوش ہوں"

مروان بن الحکم:۔ آپ کو معلوم ہے میں مدینہ کا حاکم رہ چکا ہوں۔ یہاں میں نے حکومت کی ہے۔ یہاں کے لوگوں سے واقفیت بہم پہنچائی ہے۔

ولید بن عتبہ:۔ ہاں اچھی طرح جانتا ہوں۔ کون شخص اس حقیقت سے ناواقف ہوگا۔

مروان بن الحکم:۔ آپ کو یہ بھی تسلیم ہے کہ آپ کے مقابلہ میں زیادہ جہاندیدہ اور تجربہ کار ہوں؟

عقبہ بن ولید:۔ ہاں اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں۔ بے شک آپ میرے مقابلہ میں کہیں زیادہ دور اندیش، مدبر اور معاملہ فہم ہیں۔

مروان بن الحکم:۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ سے لے کر اب تک میرے اثر و رسوخ، دبدبہ اور طنطنہ کی کیا کیفیت رہی ہے۔

ولید بن عتبہ:۔ ہاں یہ بھی جانتا اور مانتا ہوں۔ لیکن آپ کا مقصد ان باتوں سے کیا ہے۔؟

مروان بن الحکم :- پہلے ایک بات اور سن لیجئے۔ پھر پوچھئے آپ شاید اس سے بھی انکار نہ کر سکیں۔ کہ امیر المومنین یزید بھی اپنے والد محترم کی طرح مجھے بہت زیادہ مانتے اور میرا بے حد احترام کرتے ہیں۔

ولید بن عتبہ :- یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ بلکہ میرا تقرر بھی آپ کے مشورہ سے ہی ہے۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ منصب بلند !

مروان بن الحکم :- شکر ہے جو بات میں کہنے میں تامل کر رہا تھا۔ وہ خود آپ نے کہہ دی پھر شاید آپ اسے بھی محسوس کرتے ہوں کہ اگر مشورہ برعکس ہو۔ یعنی میں امیر المومنین یزید کو یہ رائے دوں کہ موجودہ حاکم کو برطرف کر کے ایک دوسرا عامل مقرر کریں تو حقیقتاً وہ اس مشورہ کو بھی تسلیم کر لیں گے ؟

ولید بن عتبہ :- پریشان ہو کر پہلو بدلتے ہوئے ہاں ! یہ بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ ایسا مشورہ کیوں دیں گے ؟ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو آپ کو ایسا مشورہ دینے پر اکساتی ہو۔

مروان بن الحکم :- جب تک حسین ابن علیؓ امیر المومنین کی خلافت پر بیعت نہیں کریں گے۔ ہمارے سر پر ایک تلوار لٹکتی رہے گی۔ ہمارے معاملات مشکوک اور مذبذب رہیں گے۔ مدینہ کا ایک شخص بھی بیعت نہیں کرے گا نہ مکہ میں بیعت ہو سکے گی۔ ہر وقت فتنہ سر اٹھا سکتا ہے۔ شورش ہو سکتی ہے۔ بغاوت ہو سکتی ہے اور اس کا ذمہ دار ہو گا ولید بن عتبہ ابن ابی سفیان۔

یہ باتیں سن کر ولید کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ بھیانک مستقبل کی تصویر نظروں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں" یہ تو آپ صحیح کہتے ہیں۔ جب تک حسینؓ بیعت نہ کر لیں۔ معاملات غیر یقینی رہیں گے۔ سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے۔

مروان بن الحکم :- وہی جو میں نے پہلے کہا تھا۔ حسینؓ کو بلاؤ۔ بیعت کا حکم دو بیعت کر لیں۔ تو آزاد ہیں۔ انکار کریں تو بے تامل ان کی گردن اڑا دو۔

ولید بن عقبہ :- کانپ کر۔ حسینؓ ابن علیؓ کی گردن اڑا دوں۔ سبطِ رسولؐ کو قتل کر دوں۔ یا دین کو بیچ کر دنیا خرید لوں ؟

مروان بن الحکم :- نہیں تم غلط سمجھے۔ دین و دنیا کا کوئی سوال نہیں۔ سوال زندگی کا ہے، ایک کی زندگی لو۔ اپنی زندگی بچا لو۔ ایک گردن کاٹو اپنی گردن سلامت لے جاؤ۔ اس دنیا کی یہی ریت ہے۔ ایک کی ہلاکت دوسرے کی زندگی کا سبب بنتی ہے۔

ولید بن عقبہ :- (کچھ سوچتے ہوئے) تو مجھے یہ کرنا پڑے گا ؟

مروان بن الحکم :- ضرور کرنا پڑے گا ..... اور اگر تم یہ کرتے ہوئے جھجکتے ہو تو سامنے سے ہٹ جاؤ۔ اسے آنے دو۔ جو تم سے مضبوط دل کا ہو۔ جو گردن کاٹ سکتا ہو۔ جو زندگی چھین سکتا ہو۔ جو تامل کے بجائے عزم اور حرعیت کا مالک ہو۔ جلد فیصلہ کرو۔ تمہیں کدھر جانا ہے۔

ولید بن عقبہ :- میں نے فیصلہ کر لیا۔

مروان بن الحکم :- یعنی ؟

ولید بن عقبہ :- میں نے فیصلہ کر لیا۔ جو آپ کہیں گے۔ وہی کروں گا۔ مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔ میں اپنی زندگی کی بھینٹ نہیں دے سکتا۔

مروان بن الحکم :- (ہنس کر) شاباش اب تم نے معقول بات کہی۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

میں بشارت دیتا ہوں۔ تم ترقی کرو گے۔ عروج حاصل کرو گے آگے بڑھو گے !

ولید بن عقبہ :- صبح پہلا کام یہی کروں گا کہ حسینؓ کو دارالامارۃ میں بلواؤں گا۔ ان کے سامنے وضاحت کے ساتھ یہ دونوں صورتیں رکھ دوں گا۔ یا امیرالمومنین یزید کی بیعت یا قتل ان دونوں صورتوں کے درمیان تیسری صورت نہیں جو اختیار کی جا سکے۔

مروان بن حکم :- بالکل ٹھیک۔ بہت بہتر۔

لیکن صبح ہونے سے پہلے امام حسینؓ کو مروان اور ولید کی گفتگو معلوم ہو گئی۔ نہ معلوم کس طرح سب سے پہلے اس کی بھنک عبداللہ بن زبیرؓ کے کانوں میں پڑی۔ اور ان سے

امام حسینؑ کو اطلاع ملی۔ لہٰذا طے پایا کہ ہنگامہ، شورش اور فتنہ و فساد سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ مدینہ کی اقامت فی الحال ترک کر دی جائے اور مکہ کی راہ لی جائے۔

امام عالی مقام نے اپنا مختصر سامانِ سفر درست کیا۔ اہل و عیال کو ساتھ لیا۔ مدینہ منورہ پر با چشمِ پرنم ایک الوداعی نظر ڈالی۔ مسجدِ نبویؐ میں دو رکعت نماز پڑھی۔ اور روضۂ رسولؐ کے سامنے آکر فاتحہ پڑھا۔ اور اس مدینہ سے رخصت ہو گئے جو ان کی روح کا مسکن تھا۔

آج وہ چھوٹ رہا تھا۔ نہیں۔ چھڑایا جا رہا تھا۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

باب ۳۱

حق اور باطل

اَب وہ دَور ختم ہو چکا تھا۔ جب یزید پس پردہ تھا۔ اور اس کی ولیعہدی کیلئے بیعت لی جا رہی تھی۔ اب وہ تختِ خلافت پر متمکن تھا۔ اور ایک کھلی کتاب کی طرح۔ اسے ہر شخص پڑھ سکتا تھا اور پڑھتا تھا۔ پہلے اس کے بارے میں افواہیں تھیں قیاس آرائیاں تھیں۔ اندیشہ ہائے دَور دراز تھے اب وہ امیر اور خلیفہ کی حیثیت سے منظر عام پر نمودار ہو چکا تھا۔ اب اس کی کوئی چیز پرائیویٹ نہیں تھی۔ ہر چیز پبلک کی ملکیت تھی۔ پہلے وہ اس کا پابند نہیں تھا۔ کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھے۔ اب امیر کی حیثیت سے وہ اس پر مجبور تھا کہ مسجد میں جائے اور نماز کی امامت کرے اس لئے کہ اسلام کا خلیفہ بیک وقت مسجد کا امام، میدانِ جنگ کا سپہ سالار اور ایوان عدالت کا قاضی القضاۃ ہوتا تھا۔ پہلے اگر وہ زرق برق لباس پہنتا تھا تو بہت کم لوگوں کی نظر پڑتی تھی۔ اَب وہ عالمِ اسلام کا مرجع اور مرکز تھا۔ اس کی خدمت میں اپنے معروضات پیش کرتا تھا۔ اس طرح اسے موقع ملتا تھا کہ اپنے امیر کو دیکھے، پہچانے، پرکھے، جانچے اور اندازہ لگائے کہ اسلام کے معیار پر کہاں تک پورا اترتا ہے؟ پہلے اگر وہ عیاشی کرتا تھا، رقص و سرود میں وقت صرف کرتا تھا۔ نغمہ اور موسیقی سے جی بہلاتا تھا۔ تو یہ اس کا ذاتی فعل تھا۔ اگرچہ قابلِ ملامت تھا۔ لیکن اب وہ سب کچھ کرتا تھا تو یہ فعل ایک شخص کا نہ تھا جس کا نام یزید تھا۔ ایک ایسے شخص کا تھا۔ جو جانشین رسولؐ تھا۔ جس کے حیطۂ اقتدار میں سارا جہانِ اسلام تھا۔ جس کی غلط روی اور گمراہی کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ امت کے ہر فرد پر پڑ سکتا تھا۔ پہلے اگر وہ کتوں

سے کھیلتا، بندروں سے شغل رکھتا منکرات اور منہیات کو خاطر میں نہ لاتا تھا، تو لازم نہ تھا کہ اس کا اثر افرادِ امت پر پڑے۔ لیکن اب جیسا راجہ ویسی پرجا۔ یہ بڑی نفسیاتی حقیقت ہے، پہلے اگر بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے لونڈیاں خریدتا تھا۔ ان کا ناچ دیکھتا تھا۔ گانا سنتا اور ان سے متمتع ہوتا تھا تو یہ ایک امیر زادہ کا فعل تھا۔ جس سے لوگوں کے قلوب میں نفرت و استکراہ کا جذبہ تو پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن ترغیب و تقلید کا جذبہ نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ لیکن اب صورتِ حال برعکس تھی۔ اگر امیر المومنین لہو و لعب میں اپنا وقت گرامی صرف کر سکتے ہیں تو دوسرے کیوں نہ کریں؟ اگر خلیفۃ المسلمین بیت المال کی رقم قوم اور ملت کے مصالح پر صرف کرنے کے بجائے بے دریغ ذاتی دلچسپیوں پر صرف کر سکتے ہیں۔ تو دوسرے امانت اور دیانت پر کیوں قائم رہیں؟ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و حیدرؓ کے زمانہ میں لوگ اگر خدا سے ڈرتے تھے۔ محارم سے مجتنب رہتے تھے۔ اگر اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں زندگی کے خاکے بناتے تھے۔ تو اس لئے کہ ان کا حاکم، امیر اور خلیفۂ راشد بھی یہی کرتا تھا۔ وہ بیت المال کا ایک حبہ بھی اپنی ذات پر صرف کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ اور کسی مرحلہ پر بھی نہ خویش پروری کا مرتکب ہوتا تھا نہ اسوۂ رسولؐ سے منحرف ہونے کی جرأت کرتا تھا۔ اب اگر قرآن زیبِ طاقِ نسیاں کر دیا ہے۔ سنتِ رسولؐ فراموش کر دی گئی ہے۔ بیت المال کو جاگیرِ خاص بنا لیا گیا ہے۔ . . . . اور محارم و معاصی کے حدود اٹھا دیئے گئے ہیں تو دوسرے کیسے دیکھ کر اپنی زندگی کا سانچہ بنائیں اور کیوں؟ کیا نماز انہیں پر فرض ہے روزے کے وہی پابند ہیں؟ زکوٰۃ انہیں کو دینی چاہیئے۔ دیانت و امانت کے احکام انہی کے لئے نازل کئے گئے ہیں؟ عصمت و عفاف کی جکڑ بندیاں انہیں کے لئے ہیں۔ قرآن پر عمل کرنے اور سنتِ رسولؐ پر چلنے کے لئے خدا نے انہی کو مامور کیا ہے! ان کا خلیفہ، ان کا امیر، ان کا حاکم ان سب، پابندیوں سے مستثنیٰ ہے۔ ان کا ہر گناہ ثواب ہے۔ اس کی ہر معصیت موجبِ اجر ہے؛ اس کی ہر شرلیت

صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتی ہے ؟ روایات کو جھٹلایا جاسکتا ہے لیکن کیا مشاہدات کو بھی جھٹلا دیا جائے گا ؟ سنی سنائی بات غلط ہو سکتی ہے لیکن کیا جو کچھ آنکھ دیکھتی ہے وہ بھی جھوٹ ہے ؟ کیا یزید کے اس طرزِ عمل کی روشنی میں حکومت اسلامیہ قائم رہ سکتی ہے ؟ قرآن کا نظام باقی رہ سکتا ہے ؟ خلافتِ راشدہ کا اسلوب کارفرما رہ سکتا ہے ؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا ایسے شخص کی اطاعت بہرحال کی جائے۔ خواہ اسلام مٹ جائے خواہ ملتِ اسلامیہ پارہ پارہ ہو جائے ؟ اور دینِ اسلام کا رنگ بدل جائے۔

یہ تھے وہ سوالات جو یزید کی رنگ رلیاں، عیاشیاں اور خلاف اسلام حرکتیں دیکھ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں اور فاش و برملا زبان پر بھی آرہے ہیں۔ اور چونکہ ذات پاکؐ کا نقشِ جمیل اور اسوۂ رسولؐ کا نمونۂ کامل حسینؓ ابن علیؓ کی صورت میں موجود تھا۔ لہٰذا بار بار نظریں وہیں جاکر جم جاتی تھیں ؛

اس سے قطع نظر کہ حسینؓ محمدؐ کے نواسے، فاطمہؓ کے لختِ جگر۔ علیؓ کے فرزندِ دلبند اور خاندانِ نبوت کے گل سرسبد تھے صرف ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کے زہد و تقویٰ پارسائی اور نیکی، شجاعت و شہامت، پاکی اور پاکیزگی، دیانت و امانت، صدق و صفا، عدل و قسط، خشیت فی اللہ اور حُب فی اللہ کا حریف سارے حجاز میں، سارے عالم اسلام میں۔ ساری دنیا میں اور کون ہو سکتا تھا ؛

یہی وجہ تھی کہ لوگ بار بار، انہی کی طرف لپکتے تھے۔ انہی کو اپنے درد کا درماں سمجھتے تھے۔ انہی کو ملتِ اسلام کا سہارا اور مرکز قرار دیتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ باطل کے راستے سے ہٹ جائے اور حق جلال و جمال کی پوری دلآویزی کے ساتھ نمودار ہو۔ تاریکی دور ہو اور نور چمکے، وہ نظامِ حکومت جسے اسلام سے بُعد ہے۔ ختم ہو جائے۔ اور وہ نظامِ حکومت قائم ہو، جو صرف کتاب و سنت پر مبنی ہو۔ یہ کام یزید نہ کر سکا۔ اور حسینؓ ابن علیؓ کے سوا کوئی اور ایسا نظر نہیں آتا تھا جو کر سکے۔

لوگ دُور دُور سے یہی التجا اور التماس لے کر آتے تھے اور کوفہ سے تو خطوط کا اور وفود کا ایک تار بندھ گیا تھا۔ ہر طرف سے ایک ہی مطالبہ ہو رہا تھا۔ اِس غیر اسلامی حکومت سے ہمیں نجات دلائیے اور اسلامی حکومت کا پرچم بلند کیجئے۔

باب ۳۲

جب میدانِ حشر میں سوال ہوگا!

حضرت امام حسینؑ مکہ میں تشریف رکھتے تھے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ بھی یزید کی بیعت سے بچنے کے لئے مکہ تشریف لے آئے تھے۔ دونوں میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ زیادہ تر جو مسائل زیرِ بحث آتے تھے۔ ان میں خلافت و امامت کا مسئلہ تھا۔ عبداللہ ابن زبیرؓ کسی قیمت پر یزید کی بیعت کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے ہمارے سامنے دو سوال ہیں، یا تو ہم قرآن و سنت کی حکومت چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر چاہتے ہیں تو پھر یزید کی بیعت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ہم بوئیں جَو اور کاٹیں گیہوں؟ یزید جب خلافِ اسلام راستے پر گامزن ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ قرآن و سنت کا نظام نافذ کرے۔ اور جب کہ ہم دیکھ بھی رہے ہیں کہ نہ قرآن پر عمل ہو رہا ہے، نہ سنت پر۔ جیتی جاگتی مکھی تو نہیں نگلی جا سکتی۔ البتہ اگر ہم نظامِ قرآن و سنت نہیں چاہتے تو بیشک پھر یزید کیا جس مذہب آزاد شخص کا جی چاہے۔ بیعت کر لی جا سکتی ہے۔ لیکن میرا ذاتی فیصلہ یہ ہے کہ میں تو اس غیر اسلامی حکومت کے سامنے سَر نہیں جھکاؤں گا خواہ جان جائے یا رہے۔

اور یہ سب کچھ کہہ کر وہ حضرت امام کے دستِ حق پرست پر بیعت کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن امام حسینؑ اب تک بیعت لینے پر متامل تھے وہ چاہتے تھے یزید سے خود دو بدو گفتگو کر لیں۔ اگر وہ راہ راست پر آجاتا ہے تو بہت بہتر ہے، پھر کسی جنگ و پیکار کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یزید سے ملاقات بغیر بیعت کے ممکن نہیں تھی۔ یہ لازمی تھا کہ وہ بیعت کر لیں ـــــــ

تب یزید یا دوسرے حاکم حجاز سے ملاقات کریں۔ اور بیعت کر لینے کے بعد ملاقات اور گفتگو کے کوئی معنی نہیں تھے جب ایک شخص کی بیعت کر لی۔ اسے اپنا امام اور خلیفہ مان لیا اسے اپنا اولی الامر بنا لیا تو اب اختلاف کا کیا سوال؟ اب تو صرف سمع و اطاعت کی ضرورت ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ سمع والطاعت احکام غیر الہٰی اور خلاف قرآن وسنت امور ہیں۔

یہ تھی کش مکش، جس میں حضرت امام حسینؑ مبتلا تھے وہ بار بار غور کرتے تھے، سوچتے تھے۔ حل تلاش کرتے تھے۔ لیکن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتے تھے۔

اسی کش مکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

دن اسی طرح گزر رہے تھے۔ راتیں اسی طرح کٹ رہی تھیں۔ ایک روز عشاء کی نماز پڑھ کر آپ واپس آ رہے تھے کہ ایک آدمی پیچھے پیچھے آتا نظر آیا۔ وہ ایک چادر میں ملفوف تھا۔ اور خاموشی سے آپ کا تعاقب کر رہا تھا۔ کیونکہ نمازِ عشاء کے بعد آپ کا فی وقت اوراد و وظائف میں صرف کرتے تھے۔ فضاء پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنا راستہ طے کر رہے تھے۔

آپ نے یہ محسوس فرمایا کہ کوئی شخص تعاقب کر رہا ہے۔ جب وہ قریب آیا تو اس نے اسلام وعلیکم کہا۔ آواز کچھ جانی پہچانی سی تھی۔ آپ نے فرمایا۔

"وعلیکم السلام:۔ تمہاری آواز کچھ مانوس نظر آتی ہے لیکن میں نے تمہیں پہچانا نہیں اس شخص نے منہ سے چادر ہٹائی اور کہا۔

"میں ہوں آپ کا خادم"۔

آپ نے تبسم کناں فرمایا:۔

"اوہ ربیع تم ——— ؟" پھر آپ نے ربیع سے معانقہ کیا اور اپنے ساتھ لے کر گھر تشریف لائے وہ منع ہی کرتا رہا۔ لیکن آپ نے فوراً اس کے لئے کھانے کا انتظام کیا۔ جب وہ فارغ ہوا تو باتیں شروع ہوئیں۔ آپ نے فرمایا تم تو آ گئے؟"

ربیع:۔ یا امامؑ! میں حاضر ہوگیا۔

امام حسینؑ :۔ دمشق کو کس حال میں چھوڑا ؟

ربیع :۔ اس حالت میں کہ وہاں ایک شخص حکمران ہے۔ جو اصولِ دین کا تمسخر کرتا ہے اقدارِ دین کا مضحکہ اڑاتا ہے جہاں صحابۂ رسولؐ موجود ہیں۔ لیکن مجبوراً اپنی آنکھوں سے اسلام کی بے حرمتی دیکھتے رہتے ہیں۔

امام حسینؑ :۔ مثلاً ؟

ربیع :۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا امام شراب پیتا ہے لہو ولعب میں مصروف رہتا ہے۔ نماز نہیں پڑھتا۔ روزے اس کے قصرِ فلک شکوہ میں داخل نہیں ہو سکتے بیت المال کا روپیہ مصالح امت کے، بجائے ذاتی عیش و تنعم پر صرف ہوتا ہے لونڈیاں خریدی جاتی ہیں تاکہ عیش کیا جائے۔ ایک ایک قصیدے پر بیت المال کی رقم سے شاعروں کا منہ موتیوں سے، زر و جواہر سے بھرا جاتا ہے تاکہ وہ اور زیادہ مبالغہ کے ساتھ مدح و تحسین کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اہل اللہ کی کوئی پرسش نہیں۔ قرآن کی دعوت دینے والوں کی صدا، صدا الصحرا بن گئی ہے۔ سنتِ رسولؐ کا بلاوا دینے والے منہ تکتے رہ جاتے ہیں مگر کوئی نہیں سنتا۔

یہ کہتے کہتے ربیع کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں دمشق سے آ رہا ہوں۔ راستے میں جہاں جہاں گیا۔ لوگوں کو مضطرب پایا وہ حیران ہیں کہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں ؟

کون شخص ان پر مسلط ہو گیا ہے۔ اس مصیبت سے کس طرح نکلیں ؟ کس طرح گلو خلاصی حاصل کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسلام اس لیے قبول کیا تھا کہ اپنے ہاتھوں اسلام کو غارت کر دیں ؟ سب کی نظریں آپ پر صرف آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ انہیں اس آفت سے نجات دلائیں۔ آپ ان کی صحیح راہنمائی فرمائیں۔ یا امام میں بھی اپنی طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف سے عرض کرتا ہوں کہ اب تامل بیکار ہے وقت گزرتا چلا جا رہا ہے۔ حالات ناساعد ہوتے

چلے جا رہے ہیں۔ بات بگڑتی جا رہی ہے۔ اگر آپ نے اب بھی توجہ نہ فرمائی تو خود غور کیجئے انجام کیا ہوگا اور میں نہایت صفائی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے میدانِ حشر میں آپ بچ نہیں سکیں گے۔ رسولؐ اللہ آپ سے دریافت فرمائیں گے اسلام پر حملہ ہو رہا تھا۔ دین ضائع ہو رہا تھا۔ ملتِ اسلامیہ تباہ ہو رہی تھی۔ تم موجود تھے۔ لوگ تمہیں بلا وے دے رہے تھے۔ بتاؤ تم نے کیا کیا؟ سوچ لیجئے آپ کیا جواب دیں گے؟ میری ذمہ داری تو ختم ہو گئی۔

باب ۳۴

یزید کا غصّہ

آج یزید بہت برہم تھا جب سے وہ تخت خلافت پر متمکن ہوا تھا اس کے شب و روز کی رعنائیوں میں خلل آگیا تھا۔ شاہزادگی کا زمانہ بے فکری کا زمانہ تھا۔ دن عید تھی، رات شب برات نہ کوئی غم نہ کوئی اندیشہ نہ کوئی وسوسہ۔ وہ تھا۔ اور رنگ رلیاں، سرمستیاں اور عیش پرستیاں۔ لیکن جب سے تختِ خلافت پر بیٹھا تھا پریشانیوں نے گھیر لیا تھا۔ ایک دن بھی سکون نہیں آیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ امام حسین علیہ السلام سے اپنی خلافت کی بیعت لے لے وہ اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ جب تک امام حسینؑ بیعت نہیں کر لیتے یہ تاج شہریاری کانٹوں کا تاج بنا رہے گا۔ اب نمک مرچ لگا کر مروان نے خاص طور پر مدینہ سے آکر یہ خبر گوش گزار کی تھی کہ تمہارا گورنر احمق ہے۔ بیوقوف ہے۔ بلکہ غدار بھی ہے۔ وہ تدبر سے کام لیتا تو عبداللہ ابن زبیرؓ اور امام حسینؑ مدینہ سے مکہ نہیں جا سکتے تھے۔ ان کا۔ بخیر و عافیت مکہ پہنچ جانا اور اسے مستقر بنا لینا ایک بہت بڑے خطرے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ باتیں سن کر یزید پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس نے کہا۔

تم سچ کہتے ہو واقعی یہ بہت بڑی غلطی ہوئی۔

مروان :- جی ہاں ! غلطی ہوئی اور اتنی بڑی کہ اب میرے خیال میں اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

یزید :- (تیوری چڑھا کر) کیوں نہیں ہو سکتی ؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مکہ کے زمین و آسمان مدینہ سے مختلف ہیں یا کیا وہاں میرا پرچم نہیں لہرا رہا ہے کیا وہاں کے لوگ اتنی

ہمّت وجرأت رکھتے ہیں کہ میرے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیں؛ اور اگر ایسا کریں تو کیا ان ہولناک نتائج سے بچ سکتے ہیں۔ جو لازمی طور پر باغیوں کو بھگتنا پڑا کرتے ہیں؛

مروان :۔ میرا خیال یہی ہے!

یزید :۔ یعنی وہ بغاوت کریں گے؟

مروان :۔ یقیناً بغاوت کریں گے۔

یزید :۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میری فوجیں بغاوت کو کچلنے کی طاقت نہیں رکھتیں؛

مروان :۔ رکھتی ہیں لیکن آپ ایک بہت بڑی حقیقت نظرانداز کر جاتے ہیں۔

یزید :۔ وہ کونسی حقیقت ہے جسے ہم نظرانداز کر رہے ہیں؛

مروان :۔ یہ کہ مکّہ کے لوگ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو چکے ہیں۔ جو آپ کے والد اور آپ کے خلاف ایک عرصہ سے ہو رہا ہے۔ اس لئے وہ مدینہ کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

یزید :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم کیا کہہ رہے ہو؛ آخر مدینہ اور مکّہ کے لوگوں میں کیا فرق ہے؟

مروان :۔ مدینہ کے لوگ عافیت پسند ہیں۔ ان پر عرصہ سے تشدد ہو رہا ہے۔ وہ سہمے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اکنافِ اسلام سے کٹے ہوئے ہیں۔ وہاں اب تک حسینؓ یا عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف سے کوئی تحریک نہیں اٹھائی گئی تھی۔ لیکن مکّہ عالمِ اسلام کا مرکز ہر سال بن جاتا ہے۔ حج کے موقعہ پر اطراف واکنافِ عالم کے مسلمان آتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں حالات وواقعات سے واقفیت بہم پہنچاتے ہیں جو رائے قائم کرتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اپنے مقام میں اسے پھیلا دیتے ہیں۔ مکّہ میں یہ لوگ مظلوم بن کر پہنچے ہیں۔ بڑی آسانی سے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرلیں گے۔

یزید :- (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں تم ٹھیک کہتے ہو..... پھر اب کیا کیا جائے؟ تمہاری رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

مروان :- وہی جو مدینہ کے گورنر کو کرنا چاہیئے تھا۔ اور اس نے اپنی ضرورت سے زیادہ عقلمندی کے باعث نہیں کیا۔

یزید :- یعنی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

مروان :- ابھی موقع ہے۔ ابھی سب کچھ ہو سکتا ہے۔

یزید :- تو بتاتے کیوں نہیں کیا کیا جائے؟ صاف صاف کہو، کیا مقصد ہے تمہارا۔؟

مروان :- مکہ سے ان دونوں کو گرفتار کروا یئے، دمشق بلوایئے اور یہاں انہیں حکم دیجئے کہ بیعت کر لیں۔ اگر تامل کریں تو گردن قلم کر دیجئے۔

یزید :- مجھے یہ آخری قدم اٹھانے میں تامل نہیں۔ لیکن چاہتا ہوں، اگر وہ بیعت کر لیں اور خون ریزی کی نوبت نہ آئے تو اچھا ہے۔

مروان :- میں یہ بھی جانتا ہوں، یہی چاہتا ہوں۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ عبداللہ ابن زبیرؓ اور حسین ابن علیؓ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ان پر ہاتھ ڈالا گیا تو بہت بڑے ہنگامہ کا امکان ہے۔ خون ریزی ہو گی اور یقیناً بہت زیادہ ہو گی۔

یزید :- ہاں یہی میں بھی کہنا چاہتا تھا۔

مروان :- لیکن اگر حکومت کرنا ہے، تو ان سب باتوں کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔

یزید :- کیا واقعی تمہارا خیال ہے کہ حسینؓ ابن علیؓ بغاوت پر آمادہ ہیں؟

مروان :- خیال! امیرالمومنین! میرا عقیدہ ہے۔ اور اگر آپ نہیں مانتے تو چند روز میں ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔

یزید :- آخر وہ بیعت کیوں نہیں کر لیتے؟

مروان :- کیوں کریں؟

یزید :- اس لئے کہ میری ولی عہدی تسلیم کی جا چکی ہے۔ میری خلافت پر لوگ بیعت کر

چکے ہیں۔

مروان :۔ لیکن حسینؓ ابن علیؓ کا شمار عام لوگوں میں تو نہیں ہے۔

یزید :۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟

مروان :۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ عوام کی نظر میں ان کا باپ آپ کے باپ سے ان کی ماںؓ آپ کی ماں سے۔ اُن کا نانا آپ کے نانا سے۔ اور وہ خود آپ سے بدرجہا افضل ہیں۔ اُن کا نانا دنیا کا سب سے افضل انسان نبی آخرالزمان، محبوبِ خدا داعیِ اسلام اور صاحب وحی تھا۔ ان کا باپ فاتح خیبر تھا۔ مرحب و عنتر جیسے پہلوانوں کا قاتل تھا۔ برادرِ رسولؐ تھا، جس کے اسلام، جس کے ایمان اور شجاعت و ہمت کا دنیا کلمہ پڑھتی ہے، ان کی ماں کا نطقِ رسالت سے سیدۃ النساء کا خطاب مل چکا ہے۔ اور وہ خود وہ ہیں جو دوشِ رسولؐ پر سوار ہو چکے ہیں۔ جو رسول اللہ کو بہت زیادہ محبوب تھے جنہیں زبانِ رسالتؐ جوانانِ جنت کا سردار ہونے کی بشارت دے چکی ہے..... کیا یہ خصوصیتیں آپ کے اندر ہیں؟... کہئے نہیں۔ آپ عوام کی نظر میں وہی مرجعیت، وہی محبوبیت۔ وہی مقام اور درجہ حاصل کر سکتے ہیں، جو انہیں حاصل ہے۔ جواب دیجئے ان کے زہد و تقویٰ کی شاہد ایک دنیا ہے۔ ان کی صالحیت کا مشاہدہ ہر مسلمان کرتا رہتا ہے؛ وہ صورتاً اور سیرتاً رسالتمآب سے مشابہ ہیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ عوام ان کی طرف عقیدت اور والہانہ محبت کے ساتھ نہ بڑھیں۔ اور آپ کا ساتھ دیں۔

یقیناً جب یہ سوال سامنے آئے گا تو وہ آپ کو کوئی اہمیت نہ دیں گے اور ان کے پسینہ پر اپنا خون بہا دیں گے۔

یزید نے کہا۔

"تو کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ میں حسین ابنِ علیؓ کے مقابلہ میں خلافت سے دستبردار ہو جاؤں؟"

مروان :۔ ہرگز نہیں۔

یزید :- لیکن تم نے تقریر تو اتنی بے ساختہ اور پُرجوش کی ہے کہ حسینؑ کا کوئی جانثار بھی نہیں کر سکتا۔

مروان :- یہ میں نے عوام کا نقطۂ نظر بتایا ہے۔ خود میرا جہاں تک تعلق ہے میں بار بار کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ اگر حکومت کرنی ہے تو حسینؑ کی گردن قلم کر دیجئے۔ ہر اس شخص کو ہلاک کر ڈالئے جو ان کا دوست ہو، ساتھی ہو، محب ہو اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو واقعی مناسب یہی ہے۔ کہ تختِ خلافت سے دستبردار ہو جائیے۔ حسینؓ کے حضور حاضر ہو جیئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیجئے۔

یزید :- (برہمی کے عالم میں) نہیں میں دست بردار نہیں ہو سکتا۔ میں مقابلہ کروں گا۔ میں ہر اس شخص کو قتل کر دوں گا جو میرے مقابلے میں آئے گا۔

مروان :- میرے آقا۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ صرف یہی۔ بس تو پھر اب اپنے قول کو عملی جامہ پہنائیے۔ یہ غلام زندگی کے آخری سانس تک آپ کے ساتھ ہے۔

باب ۳۴

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے

مروان کی باتوں نے یزید پر جادو کا سا اثر کیا۔ وہ اپنے دل سے کہہ رہا تھا۔ تخت یا تختہ۔ یا حسینؓ ابن علیؓ میری بیعت کرنے پر مجبور ہوں گے ورنہ میں تخت و تاج پر قربان ہو جاؤں گا۔ مانتا ہوں یہ بڑا ہولناک اور لرزہ خیز اقدام ہوگا۔ دنیا دہل جائے گی عالم اسلام زیر و زبر ہو جائے گا حجاز مقدس میں تہلکہ مچ جائے گا۔ زمین کانپ جائے گی آسمان ہل جائے گا۔ لیکن کوئی پرواہ نہیں۔ اگر میں ہوں تو سب کچھ ہے اور اگر میں نہیں تو پھر نہ مجھے دنیا کی پروا ہے نہ عالم اسلام کی۔ نہ حجاز مقدس کی۔ نہ زمین و آسمان کی۔ مجھے یہی کرنا ہے اور میں یہ کر کے رہوں گا۔ انجام خواہ کچھ ہو۔ جو ہمت سے کام نہیں لیتا اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جو زندہ رہنے کا حق حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لازم ہے کہ وہ جرأت رندانہ اور ہمتِ مردانہ سے کام لے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر ٹہلنے لگا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی چہرہ کا رنگ سُرخ۔ ایک عجیب اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس کے لب ہلے اور اس نے آہستہ آہستہ لیکن صاف اور واضح لب و لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

میں کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرا حریف زندہ رہے۔ اسے مرنا پڑے گا۔ قتل ہونا پڑے گا۔

یہ سلطنت۔ یہ عظیم مملکت مجھے اپنے پدر بزرگوار سے ورثہ میں ملی ہے۔ اس پر دوسرے کا پرچم نہیں لہرا سکتا۔ یہاں کسی کی حکومت نہیں چل سکتی۔ یہ میرا حق ہے۔ جو مجھے وراثت میں ملا ہے اور مجھ سے میری اولاد کو ملے گا۔ یزید اب اموی خاندان

کا کوئی معمولی فرد نہیں۔ امیرالمومنین ہے۔ خلیفۃ المسلمین ہے۔ ہر اس شخص کا جو اس مملکت میں رہتا ہے۔ مالک و آقا ہے۔

لیکن آہ!

میرے پاس کیا نہیں ہے؟ کون سی چیز ہے جو میرے دستِ تصرف سے باہر ہے۔

یہ تخت و تاج میرا ہے۔

یہ خزانہ جو سیم و زر سے معمور ہے میرا اور صرف میرا ہے۔

یہ ہر طرح کے ساز و سامان، جنگ سے آراستہ پیراستہ فوج میرے سوا اور کس کی ہے۔

یہ جاہ و جلال، یہ دبدبہ اور یہ طنطنہ، یہ شان و شکوہ، یہ وجاہت و قہرمانیت صرف میرے دم سے قائم ہے۔

لیکن۔

لیلیٰ ——— میں اسے اب تک نہیں اپنا سکا۔

اس کے بغیر میری زندگی تلخ ہے۔

چاند آسمان پر چمکتا ہے۔ تارے جھلملاتے ہیں بزمِ فلک پر کہکشاں کی محفل جمتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہار تازہ آگئی۔ لیکن جب یہ سوچتا ہوں کہ لیلیٰ مجھ سے دور ہے۔ مجھ سے متنفر ہے تو زندگی بے کیف معلوم ہونے لگتی ہے۔ کوئی لطف نہیں باقی رہ جاتا۔ جی چاہتا ہے ختم کر دوں اس زندگی کو۔

میں نے لیلیٰ کو حاصل کرنے کے لیے کیا نہیں کیا؟

اس کے باپ کو دولتِ دنیا سے مالا مال کر دیا۔

وعدہ کیا کہ جس روز وہ میرے حرم میں آجائے گی قصرِ شاہی پر صرف اسی کی حکومت ہوگی۔ قصرِ خلافت پر نہیں، یزید پر ——— یزید کے دل و دماغ پر، یزید کی سطوت و شوکت پر، ہر اس چیز پر جو میرے قبضہ اور تصرف میں ہے۔ لیکن وہ

نہیں مانتی۔
وہ اہلِ بیعت سے والہانہ عشق رکھتی ہے۔
اسے میری دولت نہیں خرید سکی۔ باپ کا جور و ظلم نہیں دبا سکا۔
میرے اختیار میں سب کچھ ہے چاہوں تو آج۔ ابھی اور اسی وقت وہ پابستہ دگرے۔ دست بدستے دگرے آسکتی ہے۔
لیکن نہیں اس طرح میں اس کا مالک نہیں بننا چاہتا۔ میں صرف اس کا جسم نہیں خریدنا چاہتا روح خریدنا چاہتا ہوں۔ دل خریدنا چاہتا ہوں۔ ضمیر خریدنا چاہتا ہوں۔
آج اس کا باپ آنے والا ہے۔ آخری جواب لائے گا۔ دیکھنا چاہیئے۔ کیا پیام لاتا ہے؟ کیا کہتا ہے کیا کرتا ہے ____ اگر وہ ناکام و نامراد آیا تو اس کی خیر نہیں۔ اس نے یزید کا رحم و کرم دیکھ لیا۔ بخشش و عطا کا نظارہ کر لیا۔ اب وہ یزید کے قہر و غضب کا مزہ چکھے گا۔
اتنے میں کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی۔ یزید خاموش ہوگیا۔ اور منتظر نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ زینب تھی۔ یزید کی خاص خادمہ جس پر وہ انتہائی اعتماد کرتا تھا جتنا خود اپنی ذات پر۔ اسے دیکھ کر طمانیت اور مسرت کے آثار پیدا ہوئے اس نے اشتیاق اور تپاک کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور کہا۔
آؤ زینب آؤ۔ ہم بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ کہو کیا خبر لائیں؟
زینب:۔ کیا عرض کروں؟ ____ کچھ کہتے نہیں بنتا؟
یزید:۔ جو بات ہے۔ صاف صاف کہہ دو۔ اب تاب انتظار نہیں باقی رہی۔ بتاؤ تم لیلے کے پاس گئی تھیں؟
زینب:۔ ہاں گئی تھی اسی کے پاس سے آرہی ہوں۔
یزید:۔ پھر تم نے اس سے کیا کہا۔ کیا اسے راضی کر لیا؟
زینب:۔ میں نے اس سے وہی کہا۔ جس کی آپ نے ہدایت کی تھی اور اس نے وہی کہا جو میں پہلے سے بتا چکی تھی۔

یزید:- یعنی وہ اپنے انکار پر ہٹ دھرمی پر، نافرمانی اور سرکشی پر قائم ہے۔

زینب:- ہاں کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہوں، میرے آقا۔ میں نے کوئی دقیقہ نہیں فروگزاشت کیا۔ اسے ڈرایا، دھمکایا، پیار سے کام لیا، ترغیب دی، ایک نئی اور خوشگوار اور شاندار زندگی کا نقشہ دکھایا، لالچ دیا۔ ہیرے جواہرات کے جگمگاتے ہوئے زیور ڈھیر کر دیئے۔ چمکتے ہوئے اور دمکتے ہوئے موتیوں کے ہار پیش کر دیئے۔ نئی امیدیں اور نئی آرزوئیں اس کے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کوئی جتن نہیں چھوڑا۔ لیکن وہ اپنی ضد پر قائم ہے۔

یزید:- کیا تم نے یہ نہیں بتایا کہ انکار کی صورت میں اس کے بوڑھے باپ کا کیا حشر ہوگا؟

زینب:- وہ اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے ــــــ شاید آپ سے زیادہ!

یزید:- تم نے یہ بھی بتایا کہ انکار پر قائم رہنے کی صورت میں خود اس کا کیا انجام ہوگا؟

زینب:- کہہ دیا تھا میرے سرکار ــــــ وہ اپنے انجام سے بے پرواہ ہے۔ میری ساری باتیں سن کر مسکرا دی اور کہنے لگی۔ تم مجھے موت سے ڈراتی ہو؟ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ تم مجھے فقر و فاقہ کی دھمکی دے رہی ہو۔ میں فقر و فاقہ کی زندگی کو ہزار بار اس امارت کی زندگی پر ترجیح دیتی ہوں۔ تم مجھے یزید کے ظلم و ستم سے ڈرا رہی ہو۔ لیکن جو زندگی سے ہاتھ دھو چکا ہو وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔

یزید:- (بہت زیادہ پیچ و تاب کھا کر) ہوں ــــــ! کیا تم نے اسے بتایا تھا کہ ربیع کا کیا حشر ہوگا میرے ہاتھوں؟۔

زینب:- بتایا تھا میرے آقا ــــــ! وہ کہنے لگی۔ میں ربیع کے جسم سے اس کی صورت سے محبت نہیں کرتی۔ اس کے خیالاتِ بلند سے، اس کے کردار رفیع سے، اس کی شاندار سیرت سے، اس کی باوقار شخصیت سے محبت کرتی ہوں۔ یزید ربیع کو مٹا سکتا ہے۔ فنا کر سکتا ہے لیکن اس کی سیرت کو۔ اس کی شخصیت کو۔ اس کے کردار کو، اس کے خیالات کو فنا نہیں کر سکتا۔

یزید:- تم اس کے باپ سے، اس پیر فرتوت سے ملی تھیں؟

زینب :- جی ہاں - اس کے پاس بھی گئی تھی ۔

یزید :- وہ کیا کہتا ہے ؟

زینب :- وہ کیا کہئے گا ؟ اپنی قسمت کو رو رہا ہے غریب !

یزید :- وہ اپنی جان کو روئے گا ۔

زینب :- لیکن میرے آقا ! اس کی کیا خطا ہے ؟

یزید :- اس کی سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ وہ لیلے کا باپ ہے ۔ ! اس نے آج آنے کا اور آخری جواب دینے کا وعدہ کیا تھا ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں ۔

زینب :- وہ آئے گا ۔ شاید آتا ہی ہوگا ۔

باب ۳۵

عجیب شرط

فضا پر یزید کی دہشت قائم تھی۔ وہ غصہ سے بے قابو ہو رہا تھا۔ فکر و اضطراب نے اس کے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ اب تک وہ منذر پر انعامات کی بارش کر رہا تھا۔ اسے مورد لطف و کرم بنائے ہوئے تھا۔ اس پر نوازشوں کی بھرمار کر رہا تھا۔ لیکن اب اس کا دل کھٹا ہو چکا تھا۔ وہ جتنا لیلٰے سے مایوس ہوتا جاتا تھا۔ اتنا منذر سے بیزار ہوتا جاتا تھا۔ یہ بات اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ منذر خود ہی ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے ورنہ اگر وہ چاہتا تو کب کی لیلٰے حجلۂ عروسی میں پہنچ چکی ہوتی۔ اور وہ دادِ عیش و کامرانی دے رہا ہوتا۔

منذر کو بھی یزید کے غصہ کا علم ہو گیا تھا۔ خود اس کی حالت یزید سے بھی زیادہ زار و زبوں تھی۔ یزید کو تو صرف یہ غم تھا کہ لیلٰے نہ مل سکی۔ اور منذر کو یہ صدمہ تھا کہ لیلٰے نے بغاوت کر کے اس سے ہر وہ چیز چھین لی جس کی وہ لَو لگائے بیٹھا تھا۔ کیا کیا امیدیں اس رشتہ سے قائم کر لی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو تخت و خلافت کا مختار اور عامۃ المسلمین کا آقا اور مالک سمجھنے لگا تھا۔ لیکن اس ضدی چھوکری نے اس کا طلسم خانۂ آرزو شکستہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک بدترین دشمن بھی اپنے کسی دشمن کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کر سکتا جو لیلٰے نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ منذر نے لیلٰے کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے خوشامد کی۔ منت کی۔ التجائیں کیں۔ سبز باغ دکھائے۔ باپ کے حقوق کا واسطہ دیا۔ محبتِ پدری یاد دلائی۔ قہر و غضب سے کام لیا۔ سختی اور تشدد کا مظاہرہ کیا۔ نفرت اور حقارت کا برتاؤ کیا۔ فقر و فاقہ کی مار دی۔ جان لے لینے

کی دھمکی دی۔ ہر جتن کر ڈالا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ مایوس ہو گیا۔ مایوس ہو کر خفا ہو گیا۔ خفا ہو کر انتقام لینے پر اتر آیا۔ اور اب یہ سوچ رہا تھا کہ میرا حشر کیا ہوگا؟ میں شہر میں کس طرح لوگوں کو اپنا منہ دکھاؤں گا؟ لوگ مجھے طعنے دیں گے کہ یہ وہ شخص ہے جو کل تک اکڑتا پھرتا تھا۔ یزید کے دربار میں۔ سب سے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اور آج یہ دھتکارا جا چکا ہے۔ اب اس کی کوئی قیمت نہیں ــــ اب یہ اقتدار سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔ مجھ پر فقرے چست کریں گے۔ مجھے حقیر و ذلیل سمجھیں گے۔

خود یزید جو کل تک میرے ادب و احترام میں پیش پیش تھا۔ اب کس کس نظر سے مجھے دیکھے گا اپنے دیئے ہوئے انعامات چھین لے گا۔ ممکن ہے میرے ذاتی مال و جائیداد پر بھی قبضہ کر لے۔ بھلا کون روک سکتا ہے اسے؟

پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ بڑھاپا، یہ ضعف و نقاہت اور جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی۔ جیل کے مظالم کاش میں اس نالائق لڑکی کا باپ نہ ہوتا۔ کاش میں نے اس کی ذات سے امیدیں وابستہ نہ کی ہوتیں۔ کاش میرا دل ہوس دنیا سے خالی ہوتا۔

یہی باتیں سوچتا وہ اس کوٹھڑی میں پہنچا۔ جہاں ایک مدت سے لیلٰے قید و بند کی زندگی گزار رہی تھی۔ کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف زینب تھی جو یزید کی اجازت سے کبھی کبھی آجاتی تھی۔ اور اس کی جلی کٹی باتیں سن کر واپس چلی جاتی تھی۔ اور اب اس نے بھی مایوس اور دل برداشتہ ہو کر آنا جانا بند کر دیا تھا۔ منذر آج یہ فیصلہ کر کے گیا تھا کہ اپنے بوڑھے اور کمزور ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔ اور پھر یزید کے پاس جا کر صاف صاف کہہ دے گا۔

" باغی میدان جنگ ہی میں نہیں ختم کئے جاتے۔ گھر کے اندر بھی ان کے جسم و جان کا رشتہ قطع کیا جاتا ہے۔ یہ لیلٰے میری لڑکی تھی لیکن باغی اور سرکش تھی۔ میں نے حق وفا ادا کر دیا ہے۔ اس کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹا اور اپنے آقا کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

لیکن لیلیٰ کے حجرہ میں پہنچ کر اس کی کیفیت کچھ اور ہو گئی۔

آج ایک مدت کے بعد اس نے لیلےٰ کو دیکھا تھا اور اس مختصر سی مدت میں وہ کتنی بدل گئی تھی۔

اس کی آب وتاب ختم ہو چکی تھی۔ اس کی تازگی اور رعنائی جواب دے چکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں۔ اس کا چہرہ فرطِ ضعف ونقاہت سے زرد ہو گیا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

لیلےٰ کا یہ حال دیکھ کر منذر کا سخت دل موم ہو گیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اس کے پاؤں ڈگمگانے لگے اور بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔

وہ آہستہ آہستہ لیلیٰ کے قریب آیا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"لیلے! میں ہوں، منذر تیرا باپ!"

لیلے:۔ (باچشم پرنم) ہاں میں جانتی ہوں۔ آپ میرے باپ ہیں۔ لیکن ــــ کاش میں آپ کی بیٹی نہ ہوتی۔

منذر:۔ یہی خیال میرے دل میں بھی کئی دفعہ مچل چکا ہے کاش میں تیرا باپ نہ ہوتا۔ تُو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

لیلے:۔ یہی شکایت مجھے آپ سے بھی ہے۔ آپ نے دین کا دامن پکڑا اور اسے چھوڑ دیا۔ میں نے دین کی رسی تھامی اور زندگی کے آخری سانس تک اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔ آپ کا شمار محبان علیؓ میں تھا۔ لیکن ہوس دنیا نے آپ کو یزید کا پرستار بنا دیا۔ میرے دل میں اسلام کی، رسولؐ کی، رسولؐ کے بھائیؓ کی اور سبطِ رسولؐ کی محبت آپ ہی نے پیدا کی تھی۔ انسان جو کچھ سیکھتا ہے ماں کی گود سے سیکھتا ہے۔ میری ماں کا میرے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔

آپ ہی نے مجھے پالا پوسا۔ بڑا کیا ـــــ پروان چڑھایا۔ میں نے آپ ہی کو ماں پایا آپ ہی کو باپ پایا۔ جو کچھ آپ نے سکھایا سیکھ لیا۔ جو آپ نے پڑھایا پڑھ لیا۔ جو آپ نے بتایا وہ مان لیا۔ لیکن کچھ نقش ایسے ہوتے ہیں کہ اگر قائم ہو جائیں تو پھر کبھی نہیں مٹتے۔ آپ انہیں نقوش کو مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں جو میری زندگی بن چکے ہیں۔ جو کبھی بھی کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔"

منذر :۔ تجھے باتیں بنانا بہت آگئی ہیں۔

لیلے :۔ نہیں ابا جان! اس تنہائی میں رہتے رہتے تو میں باتیں کرنا بھول گئی ہوں۔

منذر :۔ تو مجھ سے بحث کرتی ہے۔ حجت کرتی ہے۔ میری نافرمانی کرتی ہے اور پھر دیندار بنتی ہے۔ کیا تو نہیں جانتی کہ باپ کا رتبہ اسلام کی نظر میں کیا ہے؟

لیلے :۔ خوب جانتی ہوں۔

منذر :۔ جانتی ہوتی تو تیرا یہ رویّہ نہ ہوتا۔

لیلے :۔ نہیں ابّا جان! آپ مجھے اور اسلام کے حکم کو غلط سمجھ رہے ہیں۔

منذر :۔ اب تُو اس قابل بھی ہو گئی ہے کہ میری غلطیاں نکالے۔

لیلے :۔ غلطی آدمی سے ہو ہی سکتی ہے ـــــ میں آپ کی غلطی نہیں نکالتی۔ سیدھی سی بات کہتی ہوں۔

منذر :۔ یہ کہ میری نافرمانی جائز ہے بلکہ عین ثواب ہے۔

لیلے :۔ نہیں۔ ماں باپ کی فرمانبرداری کارِ ثواب ہے فرض عین ہے۔ خدا رسولؐ کی خوشنودی کا سبب ہے۔

منذر :۔ یہ مانتے ہوئے بھی یہ لچھن؟

لیلے :۔ میں آپ کے ایک اشارہ پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں لیکن ایمان نہیں قربان کر سکتی۔ آپ جو حکم دیں اس کی تعمیل کروں گی لیکن خدا کے دشمنوں سے اگر ناطہ جوڑ لیں تو آپ کا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتی۔

منذر :۔ تیرے نزدیک یزید خدا کا دشمن ہے؟

لیلٰے :- میرے ہی نزدیک نہیں آپ کے نزدیک بھی۔ ذرا خالی الذہن ہوکر سوچئے کیا وہ مسندِ خلافت کا مستحق ہے؟

منذر :- مستحق نہ ہوتا تو اس رتبہ پر فائز کیسے ہوتا؟

لیلٰے :- یہ کوئی دلیل نہ ہوئی۔ آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ کہ وہ حرص و ہوا کا بندہ ہے شرابی ہے۔ رنگ رلیوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے اسلام سے۔ اس کی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں۔

منذر :- اس عمر میں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پھر آگے چل کر ٹھیک ہوجاتے ہیں۔

لیلٰے :- میری اتنی ہمت نہیں کہ آپ کو جھوٹا کہوں۔ لیکن سچ بتایئے۔ کیا رسول اللہ کا جانشین ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ یزید ہے؟ کیا اسلام نے شراب پینے سے منع نہیں کیا ہے؟ کیا اسلام نے بیت المال کو عامۃ المسلمین کی امانت نہیں قرار دیا ہے؟ کیا اسلام ظلم کو پسند کرتا ہے؟ کیا آپ کے نئے امیر المومنین ان حرکتوں کا ارتکاب نہیں کرتے؟ ان سے یہ باتیں چھڑایئے۔ پھر مجھے حکم دیجئے۔ میں اس کی تعمیل کروں گی۔

منذر :- (خوش ہوکر) پھر تو میرا حکم مان لے گی؟

لیلٰے :- ضرور مان لوں گی ——— !

منذر :- پھر تو ربیع کا خیال دل سے نکال دے گی۔

لیلٰے :- ربیع کو میں ایک اچھا انسان سمجھتی ہوں اور سمجھتی رہوں گی۔ لیکن آپ کو یہ شکایت نہ رہے گی کہ میں باغی ہوں۔ سرکش ہوں۔ نافرمان ہوں۔

منذر :- (بہت زیادہ خوش ہوکر) بس یہی بہت ہے۔ اتنا کافی ہے۔ میں ابھی یزید کے پاس جاتا ہوں۔

باب ۳۶

منذر، یزید کے سامنے

منذر اٹھا اس نے شفقت اور محبت کے ساتھ لیلٰے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

میں نے تیرے دل کو پڑھ لیا۔ مجھے ندامت ہے کہ میں نے تجھ پر سختی کی ہے۔ بہر حال میں یزید کے پاس جاتا ہوں اور اس سے صاف صاف گفتگو کر لیتا ہوں۔ اگر اس نے شرائط قبول کر لیں تو خیر۔ اگر نہ کیں تو پھر وعدہ کرتا ہوں۔ خواہ کچھ ہو جائے لیکن تجھے تیرے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ تیری مدد کروں گا۔

اور لیلٰے سوچنے لگی۔

اب کیا ہو گا؟ اب آسمان کون سا نیا رنگ بدلے گا؟

منذر یزید کے پاس پہنچا۔ وہ جلا بھنا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر تیوریاں چڑھ گئیں اور غصہ کے ساتھ کہا۔

۔ آؤ منذر! ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

منذر :۔ میں حاضر ہوں میرے آقا!

یزید :۔ تملق، خوشامد اور چاپلوسی کی باتیں تمہارے علاوہ دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ اور کرتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے وہ تم سے زیادہ اس فن کے ماہر ہیں۔ آج ہم تم سے صاف صاف باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

منذر :۔ ارشاد ـــــ اپنے آقا کی ہر بات کا جواب یہ غلام دے گا۔

یزید :۔ بات ایک ہی ہے ـــــ تم لیلٰے سے ہار گئے۔ اس کی سرکشی پر غالب

نہ آسکے۔ وہ اپنی ضد پر ابھی تک اڑی ہوئی ہے۔

منذر:۔ میرے آقا ـــــ بڑی حد تک آپ کا فرمان بجا ہے۔

یزید:۔ (تیوری پر بل ڈال کر) گویا ہماری ان باتوں میں کسی حد تک غلطی یا غلط فہمی بھی ہے؟

منذر:۔ غلام کا یہی خیال ہے۔

یزید:۔ تم کہتے کیوں نہیں؟ وہ کون سی بات ہے جو ہم غلط سمجھتے ہیں؟

منذر:۔ لیلےٰ کی سرکشی صرف ایک شرط پر مبنی ہے۔ وہ پوری ہو جائے۔ تو اس کی سرکشی ختم ہو جائے گی ـــــ وہ راہِ راست پر آجائے گی۔ اسے آپ کی رفیقۂ حیات بننے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔

یزید:۔ (خوش ہو کر) یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟

منذر:۔ غلام بالکل صحیح عرض کر رہا ہے۔

یزید:۔ پھر تم نے اب تک وہ شرط کیوں نہ بتائی؟

منذر:۔ اس لیے کہ اب تک اتنی صفائی سے اس سے بات چیت ہی نہ ہو سکی تھی۔ میں ایک سخت گیر باپ کی حیثیت سے اسے مجبور کرنا چاہتا تھا۔ وہ میری ہر سختی اور تشدد کا مقابلہ کرتی رہی۔ آج میں نے ایک انسان کی حیثیت سے اس کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی اور وہ چیز پالی جو مجھے نہیں مل رہی تھی۔

یزید:۔ وہ شرط ہم سننا چاہتے ہیں اور سننے سے پہلے اسے مان لینے کا وعدہ کرتے ہیں۔

منذر:۔ اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں ـــــ لیکن ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک آپ وہ شرط سن نہ لیں اسے قبول کرنے کا وعدہ نہ کریں۔

یزید:۔ (چونک کر) کیا وہ ہم سے آسمان کے تارے مانگتی ہے؟ ہم وہ بھی توڑ کر اس کے دامن میں ڈال دیں گے؟ کیا وہ ہم سے حکومت اور اقتدار چاہتی ہے؟

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اصلی حکمران وہ اور صرف وہ ہوگی۔ ہم فقط برائے نام حاکم اور امیر ہوں گے۔ کیا وہ دولت اور ثروت کی متمنی ہے ؟ اگر یہ بات ہے تو بیت المال کی کنجیاں اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کے قدموں میں ڈال دو۔ اگر اسے زیورات کی، موتیوں کی، ہیروں کی، جواہرات کی آرزو ہے ؛ تو اسے خوشخبری سنا دو کہ ہفت اقلیم کا ہر قیمتی زیور، روم و عجم سے خریدا جائے گا۔ اور اس کے قدموں پر نچھاور کر دیا جائے گا۔ اس کی ہر خواہش پوری ہوگی اس کی کوئی شرط ایسی نہیں جو مسترد کر دی جائے۔ کیا ہمارے یہ الفاظ کافی نہیں ؟

منذر :۔ غلام کا جہاں تک تعلق ہے وہ بالکل مطمئن ہے۔

یزید :۔ اور لیلے ــــــ ؟ آخر وہ کیا چاہتی ہے ؟

منذر :۔ صرف ایک بات ۔

یزید :۔ تو کہو ۔ ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے ۔

منذر :۔ وہ صرف ایسے شخص کی رفیقۂ حیات بن سکتی ہے جو صرف زبان سے نہیں عمل سے مسلمان ہو ۔

یزید :۔ یعنی اسے ہمارے اسلام میں شبہ ہے ــــــ ؟ وہ مفتیٔ دین کی حیثیت سے ہمارا احتساب کرنا چاہتی ہے ؟

منذر :۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر شراب کو ہاتھ نہ لگائے ۔ غیر شرعی طور پر عورتوں سے راہ و رسم نہ رکھے ۔ بیت المال سے صرف اتنی ہی رقم لے جتنی دوسرے خلفائے راشدین لیتے تھے ۔ سادگی اور قناعت کی زندگی بسر کرے ۔ خانہ جنگی نہ کرے مسلمانوں کا سر نہ کاٹے ۔ اپنی تلوار بے نیام کرے اور اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرے ۔ منہیات اور محرمات سے اجتناب کرے ۔

یزید :۔ (برہم ہوکر) تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ ایک شہنشاہ کی نہیں، ایک راہب اور دنیا بیزار شخص کی رفیقۂ حیات بننا چاہتی ہے ؟ ــــــ وہ شاید بھول گئی کہ وہ کس کے سامنے اپنی شرائط پیش کر رہی ہے ؟

منذر :- اسی لئے میں نے عرض کیا تھا کہ سننے سے پہلے قبول کر لینے کا وعدہ نہ فرمایئے۔

یزید :- تمہاری رائے صائب تھی۔ ہم ان شرائط کو قبول نہیں کر سکتے۔

منذر :- یہی لیلیٰ کا خیال بھی تھا اور میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔

یزید :- اس کے معنی یہ ہوئے کہ لیلےٰ اپنی ضد اور سرکشی پر قائم ہے۔

منذر :- میں اب کچھ نہیں عرض کر سکتا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے عرض کر دیا۔

یزید :- کل لیلےٰ کو ہمارے پاس لاؤ۔ ہم اس سے خود گفتگو کریں گے۔ اور پھر کوئی آخری فیصلہ تمہارے اور اس کے بارے میں کریں گے۔

باب ۳۷

تشویش انگیز حالات

منذر کے جاتے ہی یزید ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ ایک قاصد ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔ اس کا اضطراب دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے تو یزید گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ کہاں سے آ رہے ہو؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

قاصد نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے عرض کیا۔

"کوفہ سے آ رہا ہوں اور وہاں کے چند اموی امراء کا ایک خاص پیام لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

یزید نے چونک کر پوچھا۔

"کیا وہاں حسینؓ ابن علیؓ پہنچ گئے؟"

وہ بولا ــــ "جی نہیں ــــ لیکن بہت جلد پہنچنے والے ہیں۔"

یزید نے کہا۔

"کوئی مضائقہ نہیں ــــ ہم ان کا بہت شاندار خیر مقدم کریں گے۔ اچھا ہے یہ قضیہ ایک مرتبہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے۔ جو لڑنا چاہتا ہے لڑے۔ جو مقابلہ کرنا چاہتا ہے میدان میں آ جائے۔ جس کی جو حسرت ہو پوری کر لے۔ ہاں، اور کوفہ کے باشندوں کا کیا حال ہے؟"

قاصد نے عرض کیا۔

"کوفہ والوں کے دل حسینؓ ابن علیؓ کے ساتھ ہیں اور تلواریں ہمارے ساتھ۔"

یزید نے کہا۔

"مجھے دل نہیں چاہئے تلوار چاہیئے۔"

قاصد بولا "لیکن تلوار کو حاصل کرنے کے لئے یا دل چاہیئے یا تلوار۔"

یزید :- ہمارے پاس تلوار ہے ــــ کیا کوفہ کے لوگ سرکشی پر آمادہ نظر آتے ہیں!

قاصد :- بہت زیادہ۔

یزید :- تو حسینؑ سے پہلے کوفہ کی خبر لینی چاہیئے۔

قاصد :- کوفہ کے اموی سرداروں نے بھی یہی عرض کیا ہے۔

یزید نے کہا۔

"لاؤ وہ معروضہ کہاں ہے؟"

قاصد نے فوراً ایک خریطہ نکالا اور اعیانِ کوفہ کا معروضہ پیش کر دیا۔ جس میں لکھا تھا :-

کوفہ کے حالات بہت زیادہ نازک ہو چکے ہیں۔ یہاں کے لوگ امیر المومنین کے نام سے اور اموی حکومت کے قیام سے بیزار ہیں۔ مسجدوں میں، ــ چوراہوں میں، گلیوں میں، گھروں میں ہر جگہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ یزید غاصب ہے۔ اس کی خلافت نہیں قبول کی جاسکتی۔ خلافت حسینؑ ابن علیؑ کا حق بنتی ہے انہیں ملنی چاہیئے۔ چنانچہ حسینؑ کو بلانے کے لئے متعدد وفود مکہ جا چکے ہیں۔ ہر روز سینکڑوں خطوط بھیجے جاتے ہیں۔ اور ان میں عجز و انکسار کے ساتھ استدعا کی جاتی ہے کہ کوفہ تشریف لایئے ہم آپ کا آخر وقت تک ساتھ دیں گے اور اس ناجائز حکومت کا خاتمہ کر کے دم لیں گے۔ یہ حکومت غیر اسلامی ہے۔ اس حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا گناہ اور معصیت ہے ہماری تلواریں بے نیام ہونے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ ہمارے قلوب اموی حکومت کے حکام و اعمال سے نالاں ہو چکے ہیں۔ ہم نے علیؓ کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ ہم نادم ہیں۔ اس کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس لئے ہم اصرار کے ساتھ آپ سے اے سبطِ رسولؐ یہ التجا کرتے ہیں

کہ یہاں تشریف لائیے اور ہماری جاں نثاری ملاحظہ کیجیے۔ صرف ایک اشارہ کی دیر ہے۔ پھر آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم اموی عمال کو قتل کر دیں گے۔ اموی گورنر کو گرفتار کریں گے اموی دارالامارۃ پر قبضہ کر لیں گے۔ اموی حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوفہ والوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ وہ حکومت کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں۔ روڑے اٹکاتے ہیں۔ حکام و عمال کی توہین کرتے ہیں۔ گورنر کو خاطر میں نہیں لاتے کوفہ کا گورنر نعمان بن بشیر بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ کیونکہ وہ محبانِ اہل بیت کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ جلد ہی ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ ہولناک، خونریز اور لرزہ خیز طوفان۔ ایسا طوفان، جو ایک انقلاب کا داعی ہوگا۔ جس کے جلو میں تباہی، بربادی ہوگی۔

یہ حالات اس غرض سے امیر المومنین کے گوش گزار کر دیے گئے ہیں کہ وہ غور و فکر کے بعد کوئی راہ عمل متعین کریں۔ اگر حکومت نے اس شورش پر توجہ نہ کی اور سرکشوں کی عبرت انگیز طور پر سرکوبی نہ کی تو اندیشہ ہے کہ یہ ہنگامہ آرائیاں اور طوفان خیزیاں صرف کوفہ ہی تک محدود نہ رہیں گی۔ پھیلیں گی، بڑھیں گی اور ان کی لپیٹ میں نہ صرف کوفہ اور بصرہ بلکہ حجاز، شام، یمن اور عالم اسلام کا تمام علاقہ آجائے گا۔ پھر ہمارے بنائے کچھ نہ بن سکے گی۔ ہمیں اپنی شکست اور تباہی سے دوچار ہونا پڑے۔[1]

یزید نے یہ خط باآوازِ بلند پڑھا اور پھر غصہ اور جھنجلاہٹ کے عالم میں آخری الفاظ دوہرائے۔

"ہمیں شکست اور تباہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

---

[1] تاریخ اسلام

اور اس کے بعد بہت زیادہ برہمی کے عالم میں کہا۔

نعمان بن بشیر اس قابل نہیں کہ اپنے منصب پر برقرار رہ سکے۔ یہ کم ہمت ہے، بزدل ہے، کوفہ کی شورشوں کو یہ نہیں دبا سکتا۔ مجھیں کوئی دوسرا انتظام کرنا پڑے گا۔

یزید نے قاصد کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم ابھی تک کھڑے ہوئے ہو؟"

قاصد نے کہا۔

"یا امیر المومنین! غلام جواب کا منتظر ہے۔"

یزید بولا۔

"جواب ——— ! (طنز کے ساتھ) ہاں جواب ملے گا۔ لیکن ابھی نہیں۔"

قاصد پھر بھی کھڑا رہا۔ یزید نے اسے تیز نظروں سے گھورا اور بلند آواز سے کہا۔

"جاؤ، نکل جاؤ ——— جاؤ۔"

قاصد کا پتہ پانی ہوگیا۔ وہ بید لرزاں کی طرح کانپنے لگا۔ ——— اس نے بے بسی کے ساتھ اپنے آقا اور امیر المومنین کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے ہوئے ٹوک دم بھاگ گیا جیسے شیر کے سامنے سے بکری بھاگتی ہے۔

قاصد کے جانے کے بعد یزید ٹہلنے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ——— اضطراب اور تشویش کی کیفیت طاری تھی۔ اب تک وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی حکومت ——— بے فکری کے ساتھ گزر جائے گی۔ آج اسے محسوس ہوا کہ راستہ پُرامن نہیں ہے، ——— رکاوٹیں ہیں ——— بندشیں ہیں اور ان رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔ ان بندشوں کو توڑنا ہے۔ دفعتہً اس کے چہرے پر مسرت و انبساط کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس نے دستک دی اور دستک کی آواز سنتے ہی ایک حبشی غلام سامنے آکر دست بستہ اور مودب کھڑا ہو گیا۔

یزید نے اس سے کہا۔

"ابن سرجون کو حاضر کرو۔"

ابن سرجون ایک عیسائی سردار تھا۔ لیکن یزید اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ کوئی اہم معاملہ بغیر اس کی صلاح و مشورہ کے انجام نہیں پاتا تھا اس کی تمام ذہنی مشکلیں وہ چٹکی بجاتے میں حل کر دیا کرتا تھا۔

یزید ابن سرجون کے انتظار میں ٹہل رہا تھا کہ حبشی غلام اسے لے کر حاضر ہوا۔ یزید نے مہر و محبت کی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔

"ہم بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں"

ابنِ سرجون نے عرض کیا۔

"غلام کو جیسے ہی اطلاع ملی وہ فوراً حاضر ہو گیا"

یزید نے کہا۔

ایک بہت اہم معاملہ میں تم سے مشورہ کرنا ہے آؤ اس کمرہ میں چلیں ——— دیوار ہم گوش دارد"

ابن سرجون مسکرانے لگا۔ اور یزید اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرہ میں لے گیا۔

باب ۳۸

ابنِ سرجون رُومی

امیر معاویہ ہی کے عہدِ حکومت سے غیر مسلموں یعنی عیسائیوں کا عروج وفروغ شروع ہو چکا تھا۔ یزید کے دورِ حکومت میں مسلم حکومت پر یہ غیر مسلم استیلا اور زیادہ بڑھ گیا۔

بات یہ تھی کہ یزید کو مسلمانوں کی طرف سے برابر اندیشہ رہتا تھا کہ نہ جانے کب دغا دے جائیں۔ وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ مسلمان بہر حال مسلمان ہیں۔ چند غداروں اور مطلب پرستوں کے سوا زیادہ تر تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جو دل سے اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے البتہ تلوار کے زور سے سر اطاعت خم کرنے پر مجبور ہیں۔ لہٰذا ان کی اطاعت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جب بھی موقع پائیں گے حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔

اس دشواری کا حل اس نے یہ تلاش کیا کہ کلیدی عہدوں پر بالعموم ایسے لوگوں کا تقرر کیا جائے جو مسلمان نہ ہوں تاکہ کبھی اور کسی وقت بھی "اسلام" اور "حبِ اہل بیت" اور اسلامی شوریٰ" کے مسئلہ پر دردِ سر کے موجب نہ بنیں اور یکسوئی کے ساتھ کام چلتا رہے۔

یوں تو حکومت کے تمام بڑے بڑے دفاتر پر عیسائیوں اور غیر مسلموں کا قبضہ تھا۔ لیکن یزید پر اور قصرِ خلافت پر اور حکومت کے امورِ مہمہ پر جو شخصیت چھائی ہوئی تھی وہ ابنِ سرجون رومی کی تھی۔

ابنِ سرجون ایک عیسائی تھا۔ بے انتہا متعصب، اسلام سے بیزار، داعیِ اسلام کا مخالف، مسلمانوں کا دشمن، وہ محکوم قوم کا فرد تھا۔ لیکن عنانِ حکومت اس کے

ہاتھ میں تھی۔ گورنروں اور بڑے بڑے حکام و اعمال کا تقرر اور تنزل اسی کے ہاتھ میں تھا۔ عملی طور وہ سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا۔ جو چاہتا تھا کرتا تھا کسی کی مجال نہیں تھی کہ معترض ہو سکے یزید اس پر حد درجہ اعتماد کرتا تھا کبھی اس کے مشورے کو رد نہیں کرتا تھا۔

یہ تھا ابنِ سرجون جسے اس وقت یزید نے صلاح و مشورہ کے لئے بلایا تھا۔

ابنِ سرجون نے یزید سے کہا۔

آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی خاص معاملہ درپیش ہے؛

"ہاں —— بہت اہم بات ہے"

یہ کہہ کر کوفہ کے اعیان بنو امیہ کا وہ مکتوب اس کے سامنے بڑھا دیا اور کہا۔

"پڑھ لو اسے۔ پھر بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے"

ابن سرجون نے بڑی توجہ اور غور کے ساتھ خط پڑھا اور پھر یزید کی طرف بڑھا دیا۔

یزید:۔ پڑھ لیا تم نے اس مکتوب کو؛

ابن سرجون:۔ جی ہاں، ایک ایک حرف پڑھ لیا۔

یزید:۔ پھر تمہاری رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے؛

ابن سرجون:۔ سب سے پہلے تو ان لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جنہوں نے از راہِ وفاداری اتنے بڑے خطرے سے بروقت متنبہ کر کے نہ صرف آپ کی بلکہ خاندانِ بنو امیہ کی گراں بہا خدمت انجام دی۔

یزید:۔ وہ تو میں کر لوں گا بلکہ انعام بھی دوں گا۔ لیکن سوال انعام و اکرام اور شکر و سپاس کا نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؛

ابنِ سرجون:۔ میری رائے یہ ہے کہ کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو فوراً معزول کر دیا جائے وہ اس منصب کی ذرا بھی اہلیت نہیں رکھتا۔

یزید:۔ تمہاری رائے یقیناً صائب ہے۔ میں اس سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اس کا جانشین کسے بنایا جائے؛

ابن سرجون :- خود امیر المومنین کی رائے اس بارے میں کیا ہے !

یزید :- ہمارے ذہن میں کئی نام ہیں۔ لیکن کسی پر طبیعت نہیں جمتی۔

ابن سرجون :- یہ کیوں امیر المومنین !

یزید :- کوئی بہادر اور شجاع ہے لیکن فکر و تدبر سے محروم ہے۔ کوئی فکر و تدبر کا حامل ہے۔ لیکن شجاعت اور بہادری سے اس کا کیسہ خالی ہے۔ کوئی ضرورت سے زیادہ رحمدل ہے کوئی ضرورت سے زیادہ سنگدل کوئی فضول خرچ اور خائن ہے کوئی کنبہ پرور اور دوست نواز ـــــ غرض جس پر نگاہ جاتی ہے کوئی نہ کوئی خامی ضرور نظر آتی ہے۔

ابن سرجون :- (ہنس کر) تو پھر غلام کو وہاں بھیج دیجیے۔

یزید :- تجویز بڑی معقول ہے۔ لیکن تمہاری جدائی ہم ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ تمہیں اپنی نظروں سے مستقل طور پر دور کر کے ایک دُور دراز مقام پر بھیج دیں۔

ابن سرجون :- (مسکرا کر) میں نے تو یونہی برسبیل گفتگو عرض کیا تھا۔ ورنہ میں تو اپنے آقا کے قدموں کو چھوڑ کر جنت جانے پر بھی تیار نہیں۔ پھر میں ایک عیسائی ہوں۔ مسلمانوں کا سردار کیونکر بن سکتا ہوں !

یزید :- تم مسلمانوں کے سردار نہیں بن سکتے لیکن کیا مسلمانوں کے سردار کے سردار نہیں ہو !

یہ کہہ کر یزید ہنسنے لگا۔

ابن سرجون :- ذرہ نوازی ہے آقائے نامدار کی۔

یزید :- تم نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کوفہ کی گورنری کسے دی جائے۔

ابن سرجون :- میں نے اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ میری رائے میں اس منصب کے لئے ابن زیاد سے زیادہ موزوں اور مناسب شخص کوئی نہیں ہو سکتا۔

یزید :- (منہ بنا کر) ابن زیاد ـــــ !

ابنِ سرجون :۔ کیا ابن زیاد کو امیر المومنین پسند نہیں فرماتے ؟

یزید :۔ بالکل نہیں ـــــــ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اس منصب کی وہ اہلیت نہیں رکھتا۔

ابنِ سرجون :۔ وہ امیر المومنین کا وفادار ہے ـــــــ جاں نثار ہے۔ بہادر ہے۔ خطیب ہے۔ منتظم ہے، تدبر ہے۔ کون سی خوبی ہے جو اس میں نہیں ؟

یزید :۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ابنِ زیاد ہے۔

ابنِ سرجون :۔ (مسکرا کر) بجا ارشاد ہوا۔ اس نقص سے تو واقعی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یزید :۔ کیا اب بھی تم اس کے نام پر اصرار کرو گے ؟

ابن سرجون :۔ غلام اب بھی اپنی رائے پر قائم ہے۔

یزید :۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بہر حال کوفہ کا گورنر بنے گا۔

ابن سرجون :۔ مجھے اطلاع ملی ہے وہ کل بصرہ سے دمشق پہنچ رہا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ ایک مرتبہ امیر المومنین کے مواجہہ میں اس سے گفتگو کر لی جائے۔

یزید :۔ یہ بھی سہی۔

باب ۳۹

ابنِ زیاد

ابنِ سرجون کی نظر میں کوفہ کی گورنری کے لئے ابنِ زیاد سے زیادہ موزوں اور مناسب کوئی شخص نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ شخص خود غرضی، جاہ پرستی، بد باطنی اور خیانت نفس میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ وہ حصولِ جاہ و منزلت کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے ہر چیز کو داؤں پر چڑھا سکتا ہے۔

دینِ او آئینِ او سوداگری ست

وہ محسوس کر رہا تھا مدینہ کے گورنر نے بھی حسین ؑ ابن علیؓ پر تشدد کے سلسلہ میں نرمی برتی، اس لئے کہ وہ بہر حال مسلمان تھا۔ اور کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آلِ رسول ؐ کی جناب میں گستاخی کے ساتھ پیش آئے۔ کوفہ کا گورنر نعمان بن بشیر بھی نرمی سے کام لے رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہاں ہنگامہ آرائیاں ہو رہی ہیں۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ طوفان کی آمد ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کرتا۔ کر ہی نہیں سکتا ——— یہ کام ابن زیاد اور صرف ابنِ زیاد سے ہی ہو سکتا ہے۔

خود ابن زیادہ بھی ان حالات سے بخوبی واقف تھا۔ وہ یزید کی فطرت اور ابن سرجون کی سرشت سے خوب واقف تھا ——— ہر معاملہ میں ابن سرجون کے اشارۂ چشم کی تعمیل کرتا تھا۔

بصرہ سے جب واپس آیا تو سیدھا ابن سرجون کی خدمت میں حاضر ہوا کچھ رسمی سی باتیں کرنے کے بعد ابنِ سرجون نے اس سے کہا

"چلو ہمیں امیر المومنین یزید کی خدمت میں حاضر ہونا ہے" وہ آمادہ ہو گیا لیکن چلتے

چلتے پوچھا۔
"خیر تو ہے؟ ــــــ کوئی خاص بات تو نہیں؟"

ابنِ سرجون :۔ بڑی خاص بات ہے۔

ابنِ زیاد :۔ تو پہلے فرما دیجئے؛

ابنِ سرجون :۔ نہیں وہ باتیں امیرالمؤمنین کے سامنے ہوں گی۔ وہیں تمہیں ہر سوال کا جواب دینا پڑے گا۔

ابنِ زیاد :۔ سوال ــــــ کیا آج میرا امتحان ہوگا؟

ابنِ سرجون :۔ ہاں ــــــ میری دعا ہے کہ خدا تجھے کامیاب کرے۔

ابنِ زیاد :۔ آپ نے میرے دل میں تشویش اور اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی آخر یہ امتحان کس قسم کا ہے؟

ابنِ سرجون :۔ تمہاری وفاداری کا۔

ابنِ زیاد :۔ کیا امیرالمؤمنین کو میری وفاداری پر شبہ ہے؟

ابنِ سرجون :۔ نہیں ــــــ اسی لئے تو وہ امتحان لینا چاہتے ہیں ــــــ تیار ہو تم؟

ابنِ زیادہ :۔ (ایک عزم کے ساتھ) تیار ہوں۔

ابنِ سرجون :۔ خوب سوچ لو۔

ابنِ زیاد :۔ اچھی طرح سوچ چکا ہوں۔

ابنِ سرجون :۔ پھر غور کر لو۔

ابنِ زیاد :۔ کر چکا ــــــ اگر حکم ہو تو گردن کاٹ کر امیرالمؤمنین کے قدموں پر رکھ دوں۔

ابنِ سرجون :۔ ممکن ہے اس کا وقت بھی آجائے لیکن اس وقت تو ایک دوسرا ہی امتحان درپیش ہے۔

ابنِ زیاد :۔ تو فرمائیے میں سننا چاہتا ہوں۔

ابنِ سرجون :۔ تم امیرالمؤمنین کی وفاداری اور جاں نثاری میں کہاں تک جا سکتے ہو۔ میرا

مطلب ہے کس حد تک ؟

ابنِ زیاد :۔ جہاں تک کوئی نہیں جا سکتا۔

ابنِ سرجون :۔ اگر تمہیں کام پر مامور کیا جائے کہ امیر المومنین کے مخالفوں اور دشمنوں کو ختم کر دو۔ کچل ڈالو۔ پامال کر دو۔ قتل کر ڈالو۔ تو کیا کرو گے ؟

ابنِ زیاد :۔ سب کو قتل کر دوں گا ـــــ اسی طرح جیسے پکی ہوئی فصل کاٹی جاتی ہے۔

ابنِ سرجون :۔ اور اگر ان مخالفین میں کوئی ایسا شخص ہو جس سے تمہیں تعلق خاطر ہو تو کیا کرو گے ؟

ابنِ زیاد :۔ ایسا کوئی شخص نہیں ہے جس سے امیر المومنین سے زیادہ تعلق خاطر رکھتا ہوں ـــــ اب فرمایئے۔

ابنِ سرجون :۔ فرض کرو وہ تمہارا بھائی ہو ؟

ابنِ زیاد :۔ اس کی بھی گردن قلم کر دوں گا۔

ابنِ سرجون :۔ اور اگر وہ تمہارا محبِ صادق ہو ؟

ابنِ زیاد :۔ وہ کبھی میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا۔

ابنِ سرجون :۔ اگر وہ تمہارا محبوب ہو ؟ تم اسے محترم سمجھتے ہو تو ؟ ـــــ کیا پھر بھی اپنے فیصلہ پر قائم رہو گے ؟

ابنِ زیاد :۔ ضرور قائم رہوں گا۔ وہ بھی قتل ہو گا۔

ابنِ سرجون :۔ اچھا یہ بتاؤ ـــــ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ؟

ابنِ زیاد :۔ آپ میرے محترم ہیں، بزرگ ہیں، محسن ہیں۔ میری یہ ترقی، میرا یہ عروج میری یہ کامرانی آپ کی نوازشوں کے سوا اور کس کا طفیل ہے۔

ابنِ سرجون :۔ تو سنو، اگر وہ شخص میں ہوں تو ؟

ابنِ زیاد :۔ (گھبرا کر) آپ ؟ ـــــ یعنی آپ امیر المومنین کے مخالف، دشمن،

ابنِ سرجون :۔ ہاں ـــــ کیوں گھبرا کیوں گئے ؟ ـــــ کیا یہ بات ناممکن ہے ؟

ابنِ زیاد :- نہیں ، ناممکن تو نہیں۔

ابنِ سرجون :- ——— تو جواب دو۔ میرے ساتھ تمہارا کیا سلوک ہو گا ؟

ابنِ زیاد :- (تلوار میان سے نکال کر) چند لمحوں میں یہ تلوار آپ کی گردن بھی قلم کر دے گی۔

ابنِ سرجون :- (پیچھے ہٹ کر) مجھے بھی قتل کر دو گے ؟

ابنِ زیاد :- ضرور قتل کر دوں گا۔ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ ذرا بھی تامل نہیں ہو گا۔ مجھے۔

ابنِ زیاد :- یہ بتاؤ۔ اگر وہ حسینؑ ابن علیؓ ہوں تو ؟

ابنِ زیاد :- میں انہیں بھی قتل کر دوں گا۔

ابنِ سرجون :- کیا پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ رہے ہو ؟

ابنِ زیاد :- جی ہاں ——— کیا آپ کو شبہ ہے میرے قول کی صداقت میں۔

ابنِ سرجون :- مجھے تو بالکل نہیں ہے۔

ابنِ زیاد :- پھر کیا امیر المومنین کو شبہ ہے ؟

ابنِ سرجون :- ہاں کچھ کچھ

ابنِ زیاد :- تعجب ہے۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔

ابن سرجون :- یہ کیوں ——— ؟ اس میں بدقسمتی کی کیا بات ہے ؟

ابن زیادہ نے کہا۔

"امیر المومنین نے یہ بات فراموش کر دی کہ میرا باپ زیاد علیؓ کا دستِ راست تھا۔ لیکن اس نے علیؓ کو چھوڑ دیا اور معاویہ کا جاں نثار بن گیا۔ اور اس نے جو خدمات انجام دیں انہیں معاویہ نے شکر گزاری کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھا۔ میں اسی باپ کا لختِ جگر ہوں کیا میں حسینؑ کے مقابلہ میں امیر المومنین کا ساتھ نہیں دوں گا ؟

ابن سرجون نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ پردہ کو جنبش ہوئی اور یزید مسکراتا ہوا برآمد ہوا۔ ابن سرجون اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ کیونکہ اس نے یزید کو پس پردہ بٹھا کر ابن زیاد

کی یہ باتیں سننے کا موقع دیا تھا۔ لیکن ابن زیاد اسے یوں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔

یزید نے شفقت اور اعتماد کے ساتھ اسے دیکھا۔ آگے بڑھا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

ہمیں تم پر اعتبار ہے۔ تم ہمارے ہو۔ ہم تمہارے ہیں ——— ہم نعمان کو معزول کرتے ہیں۔ تمہیں بصرہ کے ساتھ کوفہ کا بھی گورنر بناتے ہیں۔ جاؤ جو کہا ہے اسے ثابت کر کے دکھاؤ۔

باب ۲۶

بہت عجیب فیصلہ

آج کچھ عجیب سا دِن تھا ـــــــ آج کئی باتیں ایسی ہوئیں جو انوکھی تھیں، نرالی تھیں عجیب تھیں۔

کوفہ اور حسینؑ ابن علیؓ کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن ہو کر یزید کو پھر لیلٰے یاد آئی۔ منذر یاد آیا۔ آج ابن زیاد کو کوفہ روانہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن یزید نے اسے ایک دن کے لئے روک لیا۔ دربار لگا ہوا تھا اور یزید نخوت و تمکنت کا پیکر بنا مسند پر بیٹھا تھا۔ اس کے داہنے ابن سرجون اور بائیں ابنِ زیاد۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے چہرے پر غصے اور برہمی کی تمتماہٹ تھی۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ جلال کا عالم طاری ہے اور آج جو سامنے آگیا اس کی خیر نہیں۔ ابن سرجون اور ابن زیاد کو کچھ نہیں معلوم یہ کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ یزید نے انہیں کیوں بلایا ہے؟ کیوں وہ اس قدر خفا ہے اور اب کیا کرنا چاہتا ہے؟ ابن سرجون خاص طور پر متحیر تھا۔ وہ اندازہ کر رہا تھا کہ کوئی اہم فیصلہ کرنے والا ہے اور آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی فیصلہ اس نے ابن سرجون سے مشورہ کئے بغیر کیا ہو۔

دفعتہً یزید نے دستک دی۔ حاجب حاضر ہوا۔ یزید نے اسے گھور کر دیکھا اور کہا۔

"کیا منذر حاضر ہے؟"

حاجب نے عجمی آداب کے مطابق ادب سے گردن جھکائی۔ اور عرض کیا۔

"حاضر ہے۔"

یزید نے پوچھا

"اور اس کی لڑکی لیلے ؟ کیا وہ نہیں آئی ؟"
"اس کے ساتھ برقع میں لپٹی ہوئی کوئی عورت ہے تو۔ غالباً وہ لیلے ہی ہو گی۔"
یزید نے بلند آواز سے کہا۔
"دونوں کو حاضر کرو۔"
حاجب واپس چلا گیا اور ذرا سی دیر میں منذر اور لیلے کے ساتھ واپس آیا۔
منذر پر اس وقت خوف اور دہشت کی کیفیت طاری تھی۔ لیلے برقعہ میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے جذبات اور کیفیات کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔
یزید کڑکا۔
"ہمارے مواجہہ میں برقعہ کی ضرورت نہیں۔"
منذر نے لیلے سے کہا۔
"بیٹی ـــــ ! سنتی ہو۔ امیرالمومنین کیا فرما رہے ہیں ! ـــــــــــ برقعہ اتار دو۔"
لیلے نے برقعہ اتار دیا۔
اور دفعتہً ایسا معلوم ہوا جیسے اندھیرے میں بجلی چمک گئی۔ جیسے تیرہ و تار رات کی سیاہی میں چودھویں کا چاند جگمگانے لگا۔ جیسے بادل چھٹ گئے اور سورج کی جگمگاہٹ سے آنکھیں چکاچوند ہونے لگیں۔ ابن سرجون پر سکتہ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ابن زیاد ہکا بکا رہ گیا۔ خود یزید پر بھی ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی۔ سارے دربار پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص دم بخود تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے ـــــ یزید نے لیلے کو ترچھی نظر سے دیکھا اور کہا۔
تم نے ہماری تمنا کو ٹھکرایا۔ تم نے ہماری آرزوؤں کو پامال کیا۔ تم نے ہماری جناب میں گستاخی کی۔ تم نے ہماری توہین کی۔ تم نے وقت کے امیرالمومنین اور خلیفۃ المسلمین کے مقابلے میں اپنی ضد اور ہٹ کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور ہمارے دل میں وہی تمنا مچلتی ہے جسے پورا ہونا ہوتا ہے۔

لیلٰے :- یہ شان تو خدا کی ہے کہ جو چاہے وہ ہو جائے کُن فَیَکُوْن آپ بھی خدا کے ایک بندے ہیں اور اللہ کے ایک برگزیدہ نیک، صالح اور شہید بندے علی رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا ہے (بی یفسخ العزائم (ارادوں کے ٹوٹنے سے میں نے خدا کو جانا اور پہچانا)

یہ باتیں سن کر یزید کا پیچ و تاب بڑھ گیا۔ غصّہ کا روکنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ امیر معاویہ کے وقت سے آج تک قصرِ خلافت اور ایوانِ شہی میں علیؓ کا نام عزت و احترام سے نہیں لیا گیا تھا بلکہ مسجدوں کے ممبروں پر اس مبارک اور مقدس نام پر سب و شتم کا سلسلہ جاری تھا۔ آج پہلی مرتبہ یہ گستاخی سرزد ہوئی اور اس گستاخی کا ارتکاب ایک عورت نے کیا۔

یزید :- تم سے بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔ تم نے ہمارے دربار میں، ہمارے محل میں، ہماری موجودگی میں ہمارے اور خاندان خلافت کے سب سے بڑے دشمن اور مبغوض شخص ـــــ علیؓ ـــــ کا نام عزت و احترام اور تقدیس و للہیت کے ساتھ لیا ہے[1]

لیلٰے :- میں اگر آپ کی رائے نہیں بدل سکتی تو آپ میری رائے بدلنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کے ڈر سے میں سفید کو سفید نہ کہوں۔

ابن زیاد نے میان سے آدھی تلوار نکال لی اور پکارا :-

او گستاخ اور بے ادب لڑکی خاموش رہ۔ تو نہیں جانتی ـــــ امیر المومنین کے سامنے زبان درازی کرنا جرم ہے اور اس جرم کی سزا قتل ہے۔ اور میری تلوار تیری گردن ابھی قلم کر سکتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ خاموش ہو جا۔

لیلٰے :- تو دنیا کا کتا ہے۔ اپنے آقا کے کھونٹے پر غرانا اور بھونکنا تیری سرشت ہے۔ تیری بہادری کا یہ عالم ہے کہ ایک عورت کو اپنی تلوار سے ڈرا رہا ہے۔ تو دنیا حاصل

---

[1] طبری

کرنے کے لئے۔ دنیا کے پیدا کرنے والے کو بھول چکا ہے۔ تو زندہ رہنے کے لئے اپنے نفس کو، اپنے ناموس کو، اپنی خودداری کو بیچ چکا ہے۔ میں عزت کی موت مرنے کے لئے اپنی زندگی قربان کر سکتی ہوں تجھے، مجھ سے آنکھیں چار کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔ گریبان میں منہ ڈال، اور غور سے سن تیرا ضمیر اس خوشامد پر تجھے ملامت کر رہا ہے۔

ابن سرجون :۔ محترم خاتون۔ دربار خلافت کا ادب و احترام ہر حالت میں آپ کو قائم رکھنا چاہیئے۔

لیلےٰ :۔ میں خاموش تھی۔ مجھے بولنے پر مجبور کیا گیا ــــــ میں سخت، الفاظ استعمال کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ لیکن مجھ پر سخت، ناملائم، تندوترش اور تلخ الفاظ کے تیر پھینکے گئے۔ میں اتنا حوصلہ رکھتی ہوں کہ حملوں کا جواب دے سکوں۔ اگر دربارِ خلافت کا ادب اور احترام لازمی اور ضروری ہے تو اس کا لحاظ سب سے پہلے آپ کے امیرالمومنین کو کرنا چاہیئے تھا۔ اور ان کے بعد اس سگِ دنیا کو جو اپنی تلوار سے مجھے دھمکا رہا ہے۔ نصیحت کرنا ہے تو ان دونوں کو کیجئے۔

یزید :۔ ابن سرجون! تم اس دریدہ ذہن اور گستاخ لڑکی کو نہیں سمجھا سکتے اسے کیفر کردار کو پہنچنے دو۔

لیلےٰ :۔ میں ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن آپ کی کوئی تمنا جو میری ذات سے وابستہ ہو پوری نہیں ہو سکتی۔

یزید :۔ یہ ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے ــــــ ہم نے چاہا تھا کہ تیری عزت افزائی کریں۔ تجھے حرم میں داخل کر لیں۔ تیرا مرتبہ خواتین عالم میں سب سے اونچا کر دیں تجھے قصرِ خلافت کا نہیں ــــــ بلکہ تخت خلافت کا اور اپنی ذات اور نفس کا مالک و مختار بنا دیں۔ تجھے ہر وہ نعمت دیں جو تو چاہے۔ دنیا کی عورتیں تیرے وجود پر تیری شخصیت پر۔ تیری دولت و ثروت، جاہ و حشمت، اعزاز و منزلت اور اقتدار و اختیار پر رشک کریں۔ حسد کریں۔ جلیں، لیکن تو نے اپنی بدبختی سے ان تمام نعمتوں کو ٹھکرا دیا ہے۔

لیلےٰ :۔ اور مجھے اپنی اس بدبختی پر فخر ہے۔

یزید :۔ اگر ہم چاہیں تو تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ جبر و قوت سے کام لے کر ابھی تجھے اپنے حرم کی مکین بنا سکتے ہیں۔ لیکن اب ہمیں تجھ سے نفرت ہو چکی ہے۔ اب ہم تیرے حسن و جمال کو ٹھکرا دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ جس طرح تو ہمارے احسانات کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی اگر ہماری بن جاتی اسی طرح ہماری ٹھن کر ہمارے قہر و غضب اور تعزیز و انتقام کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔

لیلےٰ :۔ آپ کے قہر و غضب اور تعزیر و انتقام کا اندازہ کرنے میں مجھے کبھی کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔

یزید :۔ نہیں ___ جو کچھ ہوگا وہ تیری مرضی کے خلاف ہوگا۔ تو سمجھتی ہے ہم تجھے قید کر دیں گے۔ پھانسی دے دیں گے۔ ہاں سزا کی ایک صورت یہ بھی ہے لیکن بہت ہلکی۔ بہت معمولی۔ ہم اس سے بڑی اور عبرت انگیز سزا دیں گے تجھے ___ (ابن زیاد سے مخاطب ہو کر) حسن و جمال اور کبر و نخوت کے اس پیکر کو ہم تمہیں بخشتے ہیں۔ اسے لے جاؤ۔ باندی بنا کر دار الامارۃ میں رکھو اور بد خو غلام سے اس کی شادی کر دو (منذر سے مخاطب ہو کر) تمہیں جتنے عطیے ملے تھے وہ سب ضبط کئے جاتے ہیں تمہاری ذاتی جائداد و املاک بھی ضبط کی جاتی ہے تم پر ایک لاکھ دینار جرمانہ کیا جاتا ہے اور جب تک ادا نہ ہو جائے تم قید رہو گے۔ تم نے ہمیں دھوکا دیا۔ بہلائے فریب کیا۔ تمہاری سزا یہی ہو سکتی تھی۔

باب ۴۱

محشرستانِ جذبات

یہ فیصلہ اتنا حیرت انگیز، سنسنی خیز اور دہشت ناک تھا ـــــ کہ سارے دربار پر تمام حاضرین پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ابن سرجون جو سب سے زیادہ یزید کا مزاج شناس تھا۔ وہ بھی دنگ رہ گیا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے لیلےٰ کی سراپا جمال صورت کو دیکھتا تھا اور پیش آنے والے ذلت انگیز مصائب، کا اندازہ کرتا تھا۔ اور دل ہی دل میں کانپ کر رہ جاتا تھا۔ خود ابن زیاد جسے اتنی بڑی نعمت بن مانگے ملی تھی۔ جو اپنے سینہ میں دل کے بجائے سنگِ خشت رکھتا تھا۔ حیران تھا کہ دستِ قدرت کی بنائی ہوئی اس پری تمثال، حور جمال اور فرشتہ خصائل لڑکی پر ظلم و جور کس طرح کر سکے گا۔ جسے اپنے دل کی ملکہ بنا لیتا تو بھی فخر کرتا اسے باندی کس طرح بنائے گا؟ اس سے لونڈی کا سا ذلت آمیز سلوک کیونکر کر سکے گا؟ پھر جی بھر جانے کے بعد اپنے کسی بدخو اور بدصورت غلام کے حوالے کس دل سے کر سکے گا؟

یہ تو وہ نعمت ہے جو ہنسی خوشی خدا کو بھی نہیں سونپی جا سکتی۔

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے۔

"جو کافر۔ خدا کو بھی نہیں سونپا جا سکتا وہ ایک بدخو، کریہہ المنظر۔ درشت مزاج، سفاک، اور ظالم غلام کے حوالے کس طرح کیا جا سکے گا؟

وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کیا اتنی بڑی اور ہولناک آزمائش سے میں کامیابی کے ساتھ گزر کر سکوں گا؟

میں ہر امتحان کے لئے تیار تھا لیکن کیا اس عظیم امتحان کے لئے بھی اپنے آپ کو تیار کر سکتا ہوں؟"

میں نے ابن سرجون سے کہا تھا۔

میں امیرالمومنین کے لیئے۔ ان کی حکومت کے فروغ و استحکام کے لئے ساری دنیا سے لڑ سکتا ہوں۔ دنیا کے ہر شخص کو فرمانبردار بنا سکتا ہوں۔

اپنے بھائی کو قتل کر سکتا ہوں۔

باپ کی گردن پر چھری چلا سکتا ہوں۔

دوست کا سر قلم کر سکتا ہوں۔

اپنے محسن، مربی، شفیق اور سرپرست ابن سرجون پر تلوار کا وار کر سکتا ہوں۔
سب سے بڑھ کر یہ کہ حسینؓ ابن علیؓ یعنی سبطِ رسولؐ، جگر گوشۂ بتولؓ تک کے قتل و ہلاکت کا ذمہ لے چکا ہوں اور اپنے اس عہد پر قائم ہوں اور آخر وقت تک قائم رہوں گا۔ میرے دل میں کوئی جھجک نہیں، کوئی اندیشہ نہیں، کوئی فکر نہیں۔

لیکن ——— !

کیا میں لیلے کے ساتھ بدسلوکی کر سکتا ہوں؟

کیا یہ ممکن ہے کہ لیلے میرے سامنے باندی اور کنیز کی حیثیت سے حاضر ہو۔
بخدا ایسا نہیں ہو سکتا۔ سب کچھ کر سکتا ہوں۔ یہ نہیں کر سکتا۔ یزید کی وفاداری میں اپنی جان قربان کر سکتا ہوں۔ لیکن یزید کے لئے لیلے کو قربان نہیں کر سکتا۔

وہ میرے ساتھ جائے گی۔

وہ میرے حریم دل میں مالک اور مختار بن کر رہے گی۔

وہ میرے دارالامارۃ میں، میرے محل میں، میرے ایوان میں فرمانروائی کرے گی اور کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ سرتابی کر سکے۔ سرکشی کا مظاہرہ کر سکے۔ مملکت کی باگ اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس کا حکم چلے گا۔ وہ مجھ پر فرمانروائی کرے گی۔ میں دوسروں پر حکومت کروں گا۔

یزید اگر خفا ہوتا ہے تو ہو۔

میں اس کا ممنونِ کرم نہیں۔ وہ میرا محسن نہیں ہے۔ میں نے اس پر، میرے باپ

نے اس کے باپ پر احسانات کئے ہیں۔

اگر زیاد کی رفاقت معاویہ کو حاصل نہ ہوتی تو اموی حکومت ختم ہو چکی ہوتی اموی جاہ و جلال رخصت ہو چکا ہوتا ـــــ اموی خاندان نیست و نابود ہو چکا ہوتا ـــــ امیر معاویہ شکست کھا چکے ہوتے۔

اگر یزید کی رفاقت و اعانت سے میں ہاتھ کھینچ لوں تو وہ کیا کر سکے گا۔ لنڈورا، اپاہج اور بے بس ہو کر رہ جائے گا۔

ابن سرجون اگر اس کا دماغ ہے تو ابن زیاد اس کا دست راست ہے۔ ابن سرجون اگر اسے راہ دکھاتا ہے تو ابن زیاد اس کی رہبری کرتا۔ اس کے لئے راستہ صاف کرتا ہے۔

ابن زیاد اگر اس سے قطع تعلق کرے تو اس کی حکومت متزلزل ہو جائے گی۔

کوفہ کی یہ شورش خاندانِ بنو امیہ کے لئے پیامِ موت بن کر ابھری ہے اسے دبانے کے لئے نہ ابن سرجون جا سکا نہ یزید نے جانے کی ہمت کی۔ نہ ساری مملکت میں کوئی ایسا آدمی نکلا۔

ابن زیاد بصرہ سے بلایا گیا۔

اور اسے بن مانگے کوفہ اور بصرہ کی ولایت (گورنری) دے دی گئی۔

آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوفہ اور بصرہ کا والی ایک ہی ہو۔

یہ کام پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔ ابن زیاد کی عزت افزائی کے لئے نہیں، اپنی غرض کے لئے۔ اپنے مقصد کے لئے۔ اپنے فائدے کے لئے۔

ابن زیاد یہ سوچ رہا تھا۔ اور یزید اگرچہ خاموش تھا لیکن اس کا دل بھی محشرستان جذبات بنا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا یہ نادان۔ ضدی اور خودسر چھوکری اگر اب بھی راہ راست پر آ جائے تو میری ملکہ بن سکتی ہے۔

اس کے تمام گناہ معاف کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی ہر خطا بخش دی جائے گی۔

لیکن نہیں یہ ہٹ پر قائم ہے۔ اگر یہ اپنی ہٹ پر استوار ہے تو میں بھی ضد پر اکڑنا اور قائم رہنا جانتا ہوں۔

ایسی ذلت بخش سزا دوں گا کہ یہ تڑپے گی۔ یہ مرجانا چاہے گی مگر مر نہ سکے گی۔ یہ رحم کی التجا کرے گی۔ مگر وہ ٹھکرا دی جائے گی۔ یہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہے گی لیکن درِ توبہ بند ہو چکا ہو گا۔

جس طرح یزید کی محبت کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی طرح اس کا انتقام بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔

اور منذر ایک ایسے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا جسے پھانسی کی سزا مل چکی ہو۔ لیکن لیلےٰ کی کیفیت ان سب سے مختلف تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان، سکون سنجیدگی، استقلال اور عزیمت کے آثار و نقوش ہویدا تھے جیسے یہ سزا اس کے نہیں کسی اور کے لئے تجویز ہوئی ہے۔

باب ۴۲

سنگ دِلی

بعض لوگ مقدر کے لکھے پر قانع ہو جاتے ہیں اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو اپنی تقدیر خود بناتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور بلاشبہ لیلٰے کا شمار اسی طرح کے لوگوں میں تھا۔ وہ راضی برضا ہو کر بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ ہر ناخوشگوار حادثہ، ہر اذیت پہنچانے والا سانحہ، ہر دکھ، ہر مصیبت، ہر آفت، ہر غم اس کے سمندِ عزم پر تازیانہ کا کام کرتا تھا۔ وہ ہمت ہارنا نہیں جانتی تھی۔ نامساعد اور ناخوشگوار حالات میں بھی قسمت سے، حالات سے، زمانہ سے لڑتی رہتی تھی۔

اس کے چہرے پر ہراس تھا نہ اضطراب۔ وہ اتنی مطمئن تھی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ناخوشگوار حادثہ کوئی الم انگیز سانحہ پیش ہی نہیں آیا ہے۔

یزید کا حکم اس لئے تھا کہ نافذ ہو۔

چنانچہ وہ نافذ ہو گیا۔ یعنی لیلٰے ابن زیاد کے حوالے کر دی گئی اور منذر جیل بھیج دیا گیا لیکن اس وقت جب وہ حوالۂ زنداں ہو چکا تھا۔ یزید نے اسے پھر واپس بلایا اور کہا۔

پہلے ہماری رائے تھی کہ جب تک تم جرمانہ ادا نہ کرو جیل میں اپنی زندگی گزارو لیکن اب ہماری رائے بدل گئی ہے۔

منذر اشتیاق کے ساتھ منتظر تھا کہ دیکھئے اب امیر المومنین کیا فرماتے ہیں؛

امیر المومنین نے فرمایا۔

اب ہماری رائے یہ ہے کہ تمہارا جیل، ابن زیاد کا دارالامارۃ ہوگا۔ تم وہاں ایک غلام کی طرح رہو گے۔ تمہیں وہاں وہ تمام کام کرنا پڑیں گے جو غلاموں سے متعلق ہوتے ہیں۔

منذر خاموش نہ رہ سکا۔ وہ تقریباً چیخ پڑا۔ اس نے کہا۔

"نہیں امیر المومنین! میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔ مجھے جیل بھیج دیجئے۔"

یزید :۔ تم ہماری رائے بدلنا چاہتے ہو یہ جرأت!

منذر :۔ غلام میں اتنی جرات کہاں کہ وہ اپنے آقا اور مولا کی رائے بدل سکے۔ میں تو حضور کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ خواہ وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی ہی کیوں نہ ہو۔

یزید :۔ (طنزیہ تبسم کے ساتھ) اس عقیدت کا شکریہ ــــــ! لیکن ہم دوسرے کے کہنے پر اپنا فیصلہ نہیں بدلا کرتے۔

منذر :۔ امیر المومنین! مجھے قتل کر دیجئے لیکن کوفہ نہ بھیجئے۔

یزید :۔ آخر کیوں؟ ــــــ کوفہ کے نام سے اتنے کیوں خائف ہو؟ شاید ایک غلام کی طرح زندگی بسر کرتے شرماتے ہو۔

منذر :۔ نہیں امیر المومنین یہ بات نہیں۔ آپ کا یا آپ کے کسی غلام کا غلام بننا میرے لئے موجب فخر ہے۔ اگر میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کروں تو قصرِ خلافت کے غلاموں میں میرا نام بھی لکھ لیا جائے۔ یہ میرے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔

یزید :۔ اور اگر ہماری یہ مرضی نہ ہو کہ تم خوشی کی زندگی بسر کرو تو ــــــ؟

منذر :۔ تو یہ زندگی میرے لئے وبال دوش ہے۔ پھر میں زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں ــــــ میرے لئے قتل کا حکم صادر فرما دیجئے۔

یزید :۔ ممکن ہے تمہاری یہ آرزو ابن زیاد پوری کر دے۔

منذر :۔ لیکن یہ آرزو دمشق میں پوری ہونی چاہیئے۔

یزید :۔ ہم سمجھ گئے۔ کوفہ سے کیوں گریز کر رہے ہو؟

منذر :۔ غلام نے تو کچھ بھی عرض نہیں کیا اس بارے میں۔

یزید :۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہم جانتے ہیں؟ سمجھتے ہیں، کہو تو بتا دیں؟

منذر :۔ امیرالمومنین جو چاہیں فرمائیں۔

یزید :۔ بات یہ ہے کہ تم نہیں چاہتے کہ لیلےٰ کو ایک کنیز اور باندی کی حیثیت سے اپنی آنکھوں کے سامنے ہدفِ ستم بنتے دیکھو۔ تم خود غلام کی سی زندگی بسر کر سکتے ہو لیکن لیلیٰ باندی کی حیثیت سے تمہاری آنکھوں کے سامنے، تمہاری موجودگی میں نشانۂ ظلم و جور بنے اِس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے۔ کیوں ہے نا یہی بات ——؟

منذر :۔ بے شک امیرالمومنین یہی بات ہے۔

یزید :۔ تو معلوم ہونا چاہیئے تمہیں کوفہ بھیجنے سے ہمارا یہی مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لیلیٰ ہر روز دیکھتی رہے کہ اس کا بوڑھا اور ضعیف و نحیف باپ ایک غلام کی حیثیت سے کیسی شاندار زندگی بسر کر سکتا ہے اور تم یہ دیکھتے رہو کہ تمہاری نازوں کی پالی، لاڈلی اور چہیتی بیٹی ایک کنیز کی حیثیت سے، ایک معمولی باندی کی حیثیت سے حرمِ امیر میں کیسی قابلِ رشک زندگی بسر کرتی ہے۔ تم ہر روز، ہر آن، ہر وقت اس کی درگت دیکھتے رہو گے۔ وہ ہر روز، ہر آن، ہر وقت تمہارا حشر دیکھتی رہے گی۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

منذر :۔ امیرالمومنین میں نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا جس کی یہ سزا مجھے دی جا رہی ہے۔ میں وہ شخص ہوں جس نے امیرالمومنین کے لئے اپنی لڑکی پر ظلم توڑے جو کوئی باپ نہیں توڑ سکتا میں نے امیرالمومنین کی تائید و حمایت میں وہ سب کچھ کیا جو ایک انسان کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ صلہ ملے گا۔ اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اگر میں نے اس وفاداری کا مظاہرہ خدا کے ساتھ کیا ہوتا تو آج میں ولیِ کامل ہوتا۔ انعاماتِ الٰہی کا سزاوار ہوتا۔ افسوس میں نے اپنی دنیا بھی بگاڑ لی اور آخرت بھی خراب کی (ابن سرجون اور ابن زیاد کی طرف دیکھ کر) دوسروں کو میرے انجام سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ آج میری باری ہے تو کل

ان کی باری بھی آئے گی۔

یزید :- (گرج کر) تو میرے جان نثاروں اور وفاداروں کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہے؟

منذر :- خدا سب کچھ دیکھتا ہے۔ ظالم کی رسّی دراز ہوتی ہے۔ یہ مظالم بالا بالا نہ جائیں گے۔ ایک ایک کا حساب بارگاہِ الٰہی میں دینا پڑے گا۔

یزید :- (مسکرا کر) بہت خوب! اب آپ خیر سے وعظ فرما رہے ہیں۔

منذر :- وعظ ان کے سامنے کہا جاتا ہے جو نصیحت کی باتیں گوش ہوش سے سنتے ہوں ایسے لوگوں کے سامنے وعظ کہنے سے کیا حاصل جو اس کان سنیں اس کان اڑا دیں۔

یزید :- تیری گستاخیاں حد سے بڑھ چکی ہیں۔ ضرور تو مرنا چاہتا ہے۔

منذر :- آپ بار بار مجھے موت کی دھمکی دیتے ہیں اور میں بار بار اپنی آمادگی کا اظہار کرتا ہوں۔ آخر یہ سلسلہ کب ختم ہوگا۔

یزید :- بہت جلد ـــ (ابن زیاد سے مخاطب ہو کر) اسے بھی لیلےٰ کے ساتھ لیتے جاؤ۔ اور جس روز لیلےٰ کی شادی اپنے کسی بدخو اور کریہہ المنظر غلام کے ساتھ کرو۔ اسی دن اس پیر کہن سال کو قتل کر دو اور دولہا کو تاکید کر دو کہ جب وہ دلہن کے حجلۂ عروسی میں جائے تو اس کا کٹا ہوا سر تحفہ کے طور پر اس کی خدمت میں پیش کرے۔

باب ۴۳

خفیہ اجتماع

یزید کے الفاظ نے ابن زیاد کا دماغ عرش اعلیٰ پر پہنچا دیا۔ فرطِ مسرت سے اس کی باچھیں کھل جا رہی تھیں۔ پاؤں رکھتا کہیں تھا پڑتا کہیں تھا۔

دفعتہً یزید کی آواز فضا میں گونجی۔ اس نے کہا۔

ہمیں خلوت چاہیئے۔ کسی کو اندر نہ آنے دو۔ نہ کسی کے آنے کی ہمیں اطلاع دو۔

دربان نے سرِ تسلیم خم کیا اور باہر چلا گیا۔ ابن سرجون اور ابن زیاد بدستور سر جھکائے ادب اور تعظیم کا پیکر بنے کھڑے رہے۔

یزید کچھ دیر تک خاموش رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہے پھر اس نے سر اٹھایا اور ابن زیاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کوفہ ہمارے لئے مستقل دردِ سر بن چکا ہے"

ابن سرجون:۔ دردِ سر ہی نہیں۔ باعثِ مصیبت بھی۔

یزید:۔ نئے والی کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہیئے کہ اس کا طرزِ عمل کوفہ کے باشندوں کے ساتھ کیا ہوگا؟

ابن زیاد:۔ جو امیر المومنین کا ارشاد ہوگا۔

یزید:۔ والدِ محترم کے وقت سے کوفہ کے لوگ ہمیں پریشان کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ ایک مستقل خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔

ابن زیاد:۔ بجا ارشاد ہوا۔

یزید:۔ اب کہ ہمارا دورِ خلافت شروع ہوا ہے۔ انہوں نے آج حسینؓ ابن علیؓ کو بلایا

ہے۔ وہ حسینؑ ابن علیؑ کو دعوت دے رہے ہیں۔

ابن زیاد :- یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ انہوں نے آج حسینؑ ابن علیؑ کو بلایا ہے۔ کل یہ علیؑ ابن ابی طالب کو بھی بلا چکے ہیں۔ نہ اس وقت یہ بارگاہِ خلافت کو کسی طرح کا نقصان پہنچا سکے تھے نہ اب پہنچا سکتے ہیں۔

ابن سرجون :- یہ تو ٹھیک ہے لیکن دشمن کو حقیر اور ناچیز نہیں سمجھنا چاہیئے۔

یزید :- ہمارا یہی مطلب تھا۔ اور اسی لئے ہم نے تمہیں کوفہ اور اہل کوفہ کی قسمت کا مالک بنایا ہے۔

ابن سرجون :- اور ہمیں امید ہے تم امیرالمومنین کے اعتماد کے اہل ثابت ہو گے۔

ابن زیاد :- میرے خون کا آخری قطرہ بھی اگر امیرالمومنین پر نثار ہو جائے تو یہ میرے لئے مایۂ فخر و مباہات ہوگا۔

ابن سرجون :- تمہارے خون کا کوئی قطرہ امیرالمومنین کو نہیں چاہیئے۔ انہیں باغیوں کی گردنیں چاہئیں۔ دشمنوں کے کٹے ہوئے سر چاہئیں، غداروں سرکشوں اور ناوفاداروں کا خون پانی کی طرح میدانوں میں، سڑکوں پر، گھروں میں، چوراہوں پر بہنا چاہیئے۔ تم اس لئے نہیں بھیجے جا رہے ہو کہ خودکشی کر لو یا اپنی گردن کسی سے کٹوا لو بلکہ اس لئے بھیجے جا رہے ہو کہ جو حکومت اور خلیفہ کا مخالف ثابت ہو اسے زندہ نہ رہنے دو۔ اس سے زندگی کا حق چھین لو۔

یزید :- ہاں ہم یہی چاہتے ہیں اور صاف صاف بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں تمہیں آخری اور قطعی اختیارات حاصل ہیں۔

ابن سرجون :- تمہیں کسی کے ساتھ رعایت، نرمی اور مروت کا برتاؤ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تلوار بن کر جاؤ اور وہی کام کر دکھاؤ جو تلوار کرتی ہے ـــــ یعنی قطع برید۔

یزید :- ہم نے گورنر نعمان بن بشیر کو اسی لئے معزول کیا ہے کہ وہ پہلے سوچتا ہے پھر کرتا ہے اور یہ چیز آئین سیاست کے خلاف ہے۔ جہانداری اور جہانبانی کا اقتضا یہ ہے کہ جب حکومت کی فلاح کا سوال درپیش ہو تو ہر چیز کو فراموش کر دو۔ سب کچھ

بھول جاؤ۔ جو کچھ کرنا ہے کر گزرو۔ پھر سوچو، پھر غور کرو، پھر دیکھو۔

ابن زیاد :۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔

ابن سرجون :۔ تم ایک بہت بڑے خطرہ کے استیصال کے لئے بھیجے جا رہے ہو۔

ابن زیاد :۔ میں اس خطرہ کا سر کچل دوں گا

یزید :۔ تمہیں حسینؑ ابن علیؓ کے ساتھ پوری سختی کرنی پڑے گی۔ دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ ہماری بیعت کر لیں یا وہ اس دنیا سے تشریف لے جائیں۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔

ابن زیاد :۔ اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ اگر حسینؑ امیر المومنین کی بیعت پر رضامند ہو جائیں تو بھی انہیں قتل کر دینا چاہیئے تاکہ فتنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دب جائے۔ خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹل جائے

یزید :۔ (مسکرا کر) واقعی تم دور اندیش اور مدبر انسان ہو۔

ابن سرجون :۔ امیر المومنین تمہاری فراست اور اصابت رائے کو تسلیم فرماتے ہیں۔

یزید :۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک حسینؑ ابن علیؓ زندہ ہیں اس وقت تک ہم صحیح معنی میں کوئی مقام نہیں حاصل کر سکتے۔ ہم ہرگز یکسوئی اور بے فکری سے کاروبارِ حکومت انجام نہیں دے سکتے۔ ہم کسی شخص کی بھی اطاعت اور وفاداری پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ کبھی اور کسی قیمت پر متوقع خطرات سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ ہاں تو تم کب جا رہے ہو؟

ابن زیاد :۔ جب امیر المومنین کی طرف سے فرمانِ تقرر اور روانگی کا اذن مل جائے۔

یزید :۔ ہم نے ابن سرجون سے کہہ دیا ہے فرمانِ تقرر آج ہی مل جائے گا۔ رہا اذنِ روانگی تو ہماری رائے یہ ہے کہ کل رخصت ہو جاؤ۔

ابن زیاد :۔ ایسا ہی ہوگا امیر المومنین لیکن میری ایک عرض و استدعا ہے۔

یزید :۔ ضرور کہو۔

ابن زیاد :۔ میری روانگی اور میرے تقرر کی خبر پوشیدہ رکھی جائے۔

یزید :۔ یہ کیوں؟

باب ۴۴

یہ کون تھا؟

دوسرے روز ابن زیاد اپنے خدم وحشم کے ساتھ کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ ایک اونٹ پر داہنی طرف لیلےٰ تھی اور بائیں طرف اس کا بدقسمت باپ منذر، دونوں خاموش تھے۔ دونوں اپنے اپنے حال اور مستقبل پر غور کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرنا چاہتے تھے حالِ دل کہنا چاہتے تھے لیکن زبان یاری نہیں دیتی تھی۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمے آید

سانڈنی ہوا سے باتیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ وہ ان دونوں کی اندرونی کیفیات سے بے پرواہ اور بے تعلق تھی۔ ساربان ایک بوڑھا لیکن زندہ دل شخص تھا۔ وہ اس وقت زور شور سے حدی خوانی میں مصروف تھا اور سانڈنی محویت اور سرخوشی کے عالم میں اس حدی خوانی سے متاثر رواں دواں اس طرح چلی جا رہی تھی جیسے پانی کے بہاؤ پر کشتی بہتی ہے۔

ان اشعار میں، جو ساربان ایک خاص دھن کے ساتھ گا رہا تھا۔ ایک خاص قسم کا سوز و گداز تھا۔ ایک درد، ایک کسک، ایک ٹیس۔

ان اشعار میں غمِ فرقت کی داستان تھی۔ عشق و محبت کی کہانی تھی سوز و نیاز کا افسانہ تھا۔

ایک ایک تان پر لیلےٰ کا دل ہل جاتا تھا۔ اس کا دل زور زور سے ڈھڑکنے لگتا تھا۔ خود بخود اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں۔

اور نہ جانے کیوں دفعتہً لیلےٰ کے سامنے ربیع کی تصویر پھر گئی۔

وہ تیز طراز نوجوان، جس میں بلا کی شوخی اور غضب کی دلآویزی تھی۔ جس کی باتوں میں

ابن زیاد :۔ یہ سیاست کا اقتضاء ہے۔ میں بجلی کی طرح دفعتاً کوفہ کے لوگوں پر گرنا چاہتا ہوں۔

یزید :۔ (مسکرا کر) ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا ـــــ تمہیں ہماری خوشنودی حاصل ہے اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ دولتِ دنیا سے مالا مال کر دیں گے تم کو۔

ابن زیاد :۔ مجھے دولتِ دنیا نہیں چاہیئے۔ میں صرف امیرالمؤمنین کی خوشنودی چاہتا ہوں یزید نے شفقت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

وہ تمہیں حاصل ہے اور حاصل رہے گی۔

حقیقت سمجھ لی۔

منذر :۔ ہاں بہت اچھی طرح ـــــــ اگر مجھ پر ابتلاء اور مصائب کا یہ دور نہ آیا ہوتا تو شاید نشۂ غفلت میں سرشار رہتا۔ ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنے وجود سے شرم آنے لگتی ہے۔

لیلےٰ :۔ نہیں ابا جان! یہ نہ کہئے۔ آدمی اگر غلطی محسوس کر لے تو خدا اس کی لغزشوں کو معاف کر دیتا ہے۔

منذر :۔ اسی امید پر جی رہا ہوں ـــــــ البتہ فکر اگر ہے تو صرف ایک۔ !

لیلےٰ :۔ وہ بھی کہہ دیجئے۔

منذر :۔ تیرا حشر یہ ظالم لوگ کیا کریں گے؟

لیلےٰ :۔ کیا میرے بارے میں آپ خدا پر بھروسہ نہیں رکھتے؟

منذر کی آنکھوں میں ان الفاظ سے ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے کہا۔

بیٹا! تو میری راہ نما ہے، ہر غلطی پر، ہر گمراہی پر ہمیشہ تو نے میری راہ نمائی کی۔ واقعی اس مختصر سے جملہ نے میری کایا پلٹ دی۔ اب میں تیری طرف سے بھی مطمئن ہوں ـــــــ ہر حال میں راضی برضا ہوں۔ مجھے یقین ہے خدا جو کچھ کرے گا، بہتر ہو گا۔

اتنے میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

لیلےٰ نے کہا۔

"ضرور اس طرف سے کوئی گزرا ہے۔"

منذر بولا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی شخص ہماری باتیں سن رہا تھا۔"

لیلےٰ نے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے، لیکن کیوں؟"

منذر بولا۔

"ممکن ہے وہ ابن زیاد کا جاسوس ہو۔"

جادو تھا۔ جس کی چتون میں کشش تھی۔ جس کے انداز و اطوار دل میں کھب جایا کرتے تھے۔

جو صالح تھا، پاک باز تھا۔ جس کی نظر پاک تھی۔ جس کا دامن پاک تھا۔ جس کے خیالات پاک تھے۔ جس کی محبت پاک اور بے داغ تھی۔

ربیع کے یاد آتے ہی لیلےٰ کے دل کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ وہ بار بار آنکھوں سے آنسوں پونچھتی ـــــ بار بار اپنی کیفیت پر غالب آنے کی کوشش کرتی۔ لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی تھی۔

اتنے میں پہلا پڑاؤ آگیا۔

تمام اونٹ رک گئے اور چشم زدن میں یہ اجڑا سا مقام، ایک آباد بستی بن گیا خیمے نصب ہو گئے۔ چھولداریاں گاڑ دی گئیں۔ سپاہی کھانا پکانے میں لگ گئے۔ بیچ میں سرخ رنگ کا ایک ریشمی خیمہ تھا۔ اس میں ابن زیاد مقیم ہو گیا۔ اور اس سے ملا ہوا ایک خیمہ تھا وہ منذر اور لیلےٰ کے لئے خاص کر دیا گیا۔ اس کے قریب ایک چھولداری تھی۔ اس میں وہ ساربان ٹھہر گیا۔

لیلےٰ جب اونٹ سے اترنے لگی تو اس کی آنکھیں پرنم تھیں۔ ساربان نے نہایت ادب احترام کے ساتھ اسے اور منذر کو اتارا۔ وہ لیلےٰ کی کیفیت غم والم سے متاثر نظر آرہا تھا۔

منذر اور لیلےٰ خیمہ میں خاموش آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت بھی دونوں پر خاموشی طاری تھی۔ آخر منذر نے بابِ سخن وا کیا۔

منذر :۔ بیٹی! میں دیکھ رہا ہوں تو بہت رنجور اور مغموم نظر آرہی ہے۔ آخر کیوں؟

لیلےٰ :۔ ابا جان مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ آپ کی ہے۔ میری وجہ سے آپ بھی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے۔

منذر :۔ تو میری فکر کیوں کرتی ہے؟ سچ کہتا ہوں۔ ان آلام و مصائب سے ذرا بھی خائف نہیں ہوں بلکہ خوش ہوں ـــــ میری آنکھیں کھل گئی ہیں مجھے اپنی غلطیوں پر غور کرنے کا موقع مل گیا۔ ممکن ہے خدا مجھے تلافی مافات کی توفیق بھی عطا کر دے۔

لیلےٰ :۔ (خوش ہو کر) معلوم ہوتا ہے آپ نے یزید اور اس کے رفقاء کی حیثیت اور۔

لیلےٰ نے کہا۔

" ذرا باہر دیکھئے جا کر۔ شاید اب بھی کھڑا ہو؟"

منذر باہر نکلا تو اس نے دیکھا۔ ایک سایہ سا تیزی کے ساتھ خیمہ کے عقب سے نکل کر تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب تک جس بات کا اندیشہ تھا۔ اب وہ یقین کی صورت میں بدل گئی۔ وہ گھبرایا ہوا خیمہ کے اندر داخل ہوا۔

لیلےٰ :۔ دیکھ لیا آپ نے؟

منذر :۔ ہاں بیٹا! ضرور کوئی شخص ہماری باتیں سن رہا تھا۔ باہر نکلا تو میں نے دیکھا خیمہ کے پچھواڑے سے ایک سایہ سا برآمد ہوا اور تاریکی میں گم ہو گیا۔ ضرور وہ ہماری باتیں سن رہا تھا۔

لیلےٰ :۔ سننے دیجئے۔ وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

منذر :۔ یقیناً وہ ابن زیاد کا آدمی تھا۔ جو کان لگائے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اور اب نمک مرچ لگا کر اس سے ایک کی دس دس کہے گا جا کر۔

لیلےٰ :۔ تو کیا کرے گا ابن زیاد۔ میں نہ اس سے ڈرتی ہوں نہ اس کے کسی جاسوس سے۔

منذر :۔ بیٹی! وہ بڑا سفاک اور ظالم ہے خدا اس کے قہر سے بچائے۔ اتنے میں خیمہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ منذر چونک پڑا۔

منذر :۔ کوئی ہے۔ کون ہو سکتا ہے؟

لیلےٰ :۔ ہاں شاید کوئی دستک دے رہا ہے۔

منذر :۔ دیکھو، پھر دستک کی آواز آئی۔ میں جاتا ہوں۔

لیلےٰ :۔ ممکن ہے کسی اور خیمہ پر دستک دی گئی ہو۔ کئی خیمے آس پاس ہیں۔

منذر :۔ نہیں بیٹا! یہیں ہے میں ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔

منذر باہر نکلا تو ایک چوب دار کھڑا تھا۔ منذر نے اس سے پوچھا۔

" تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" وہ بولا۔

" کیا منذر تم ہی ہو۔ تمہارا ہی نام منذر ہے؟"

منذر:۔ جی ہاں میرا نام منذر ہے۔ ارشاد۔
چوبدار:۔ امیر ابن زیاد نے آپ کو اور آپ کی صاحبزادی لیلے کو اپنے خیمہ میں طلب فرمایا ہے۔

باب ۴۵

سنسنی خیز فیصلہ

منذر اور لیلے، ابن زیاد کے خیمے میں پہنچے۔ وہ اس وقت کسی گہری فکر میں مستغرق نظر آرہا تھا۔ منذر اور لیلے کو دیکھ کر چونکا۔ اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں پر ایک نگاہ ڈالی اور باوقار لہجہ میں کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

دونوں مسند کے سامنے بیٹھ گئے۔ لیلے کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں ـــــ منذر اشتیاق و انتظار کے عالم میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔

ابن زیاد:۔ منذر تم اپنی بیٹی کو سمجھاؤ وہ اب بھی راہ راست پر آجائے۔

منذر:۔ میں پہلے اسے غلط راستے پر سمجھتا تھا۔ اسی لئے میں نے سختی اور سنگدلی کیساتھ بار بار سرزنش کی۔ لیکن اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کا راستہ صحیح اور درست تھا۔

ابن زیاد:۔ بہرحال ابھی موقعہ ہے، کیوں لیلے! کیا تم اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ گی؟

"آپ کی نوازش کا شکریہ، لیکن میرا جواب انکار میں ہے۔"

اس جواب پر ابن زیاد چونکا نہیں، بگڑا نہیں، خفا نہیں ہوا، غصہ اور برہمی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے دل ہی دل میں اس جواب سے خوش ہوا جیسے اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ٹل گیا جیسے وہ مطمئن ہوگیا اس نے اپنے تبسم کو دبانے کی کوشش کی لیکن کوشش کے باوجود اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

دیکھو لیلےٰ! جلد بازی سے کام نہ لو۔ غصہ نہ کرو۔ ہٹ اور ضد سے کام نہ لو۔

لیلےٰ نے کہا۔

آپ چاہے جتنے مترادفات استعمال کر لیجئے لیکن اس موضوع پر گفتگو کر کے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں "

ابن زیاد کہنے لگا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ امیرالمومنین تم سے خوش ہو جائیں گے۔ تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ منذر کی چھینی ہوئی جائداد مع مزید انعام و اکرام واپس کر دیں گے۔ اس وقت انہیں غصہ آگیا تھا لیکن حقیقتاً وہ اتنی سخت اور سنگین سزا تمہیں اور منذر کو نہیں دینا چاہتے "

لیلےٰ بولی۔

" ان کی نوازشوں کا کہاں تک شکریہ ادا کیا جائے؟"

ابن زیاد :۔ یعنی تم اپنے فیصلے پر قائم رہو گی؟

لیلےٰ :۔ جب امیرالمومنین کا عتاب مجھے راستہ سے نہ ہٹا سکا تو آپ کے التفات سے وہ کیسے بدل سکتا ہے؟

ابن زیاد :۔ منذر! تم کیا کہتے ہو۔ تم ہی سمجھاؤ لیلےٰ کو؟

منذر :۔ میں اب لیلےٰ سے پورے طور پر متفق ہوں۔

ابن زیاد :۔ ایک بات اور سن لو۔

منذر :۔ فرمایئے سن رہا ہوں۔

ابن زیاد :۔ امیرالمومنین نے چلتے وقت مجھ سے فرمایا تھا کہ میں تمہیں اور لیلےٰ کو یقین دلا دوں کہ خطا معاف ہو سکتی ہے اور انعام کی تجدید ہو سکتی ہے۔

منذر :۔ وہ زمانہ گزر گیا جب یہ چیزیں میرے لئے کشش رکھتی تھیں۔

ابن زیاد :۔ (مسکرا کر) اور اب؟

منذر نے کہا۔

"اب کیا؟ جی سیر ہوگیا دنیا سے۔

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا

اب فکرِ آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اب کچھ نہیں چاہئے سوا خدا کی مرضی کے۔"

اوہ تم امیرالمؤمنین سے بے نیاز ہو چکے ہو۔

منذر:۔ یہی سمجھ لیجئے۔

ابن زیاد:۔ پھر تمہارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟

منذر:۔ انشاءاللہ جنت میں

بے ساختہ ابن زیاد ہنس پڑا۔

ابن زیاد:۔ تمہاری زندہ دلی اب بھی قائم ہے۔

منذر:۔ انسان جب ایک فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر رنج و غم کے بادل اس پر نہیں منڈلاتے۔

ابن زیاد:۔ لیلےٰ! اب تمہاری زندگی کس نہج سے بسر ہوگی؟

لیلےٰ:۔ وہ جو آپ چاہیں گے۔

ابن زیاد۔ (خوش ہوکر) کیا مطلب ہے تمہارا؟

لیلےٰ:۔ بہت صاف اور واضح ــــــ میری ماں نے مجھے آزاد جنا تھا۔ میرے باپ نے آزاد فضا میں میری پرورش اور تربیت کی۔ آپ کے امیرالمؤمنین نے مجھے باندی اور لونڈی کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ آپ شراب پئیں گے تو ساقی گری کروں گی اور مئے ارغوانی کے جام پر جام پلاؤں گی ــــــ اگر نغمہ و سرود سے دلچسپی ہے تو گانا سیکھوں گی۔ اور آپ کی محفل طرازیوں میں اپنے نغمہ کے کمالات پیش کروں گی اگر رقصِ بسمل سے دلچسپی ہے تو وہ بھی دیکھ لیجئے گا۔ غرض ایک باندی اپنے آقا کو جس طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے وہ سب کروں گی اور جب آپ میری ان چیزوں سے اکتا جائیں تو اپنے کسی بدخو اور کریہہ المنظر غلام سے میری شادی کر دیجئے گا۔

ابن زیاد چونک پڑا۔

وہ گھور گھور کر لیلےٰ کو دیکھنے لگا۔

وہ بے تابی کے ساتھ اٹھا اور لیلےٰ کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اس کے شانے کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور کہا۔

"غلط ہے۔ جھوٹ ہے۔"

لیلےٰ نے کہا۔

اگر میں نے کوئی غلط بات کی ہے تو ندامت کے ساتھ معافی چاہتی ہوں۔ اگر جھوٹ بولا ہے تو اس کے لئے بھی متوقع ہوں کہ آپ عفو و درگزر سے کام لیں گے۔

ابن زیاد بولا۔

ابن زیاد کے لغت میں معافی کا لفظ نہیں ہے۔

لیلےٰ نے کہا۔

"تو سزا دے دیجئے پھر"

ابن زیاد نے کہا۔

"تم نے میری توہین کی ہے۔ مجھے ذلیل سمجھا۔ میرے بارے میں غلط رائے قائم کی۔

لیلےٰ نے کہا۔

"میرا مقصد ہرگز آپ کی توہین کرنا نہیں تھا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں نے تو صرف امیر المومنین کے الفاظ دہرائے ہیں۔"

ابن زیاد بولا۔

"یہ قطعاً نہیں ہو سکتا، تم باندی بن کر میرے ساتھ کوفہ میں داخل نہیں ہو گی۔ میری بیوی کی حیثیت سے کوفہ میں داخل ہو گی۔ اور یزید میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا! کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

باب ۴۶

ہم بھی عاشق ہیں

ابن زیاد نے یہ بڑا سنسنی خیز فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ ہر شخص کے خلافِ توقع تھا۔ منذر کے لئے بھی، لیلےٰ کے لئے بھی بلکہ اگر یہ کہا جائے تو خود ابنِ زیاد کے لئے بھی، تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔
ابنِ زیاد نے اس فیصلہ کا اعلان کیا اور لیلےٰ کے تاثرات اور اس کا ردِ عمل معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کچھ معلوم نہ کر سکا۔ اس کے ہونٹ تبسم سے آشنا ہوئے اور پھر وہ سنبھل گئی۔ اس کی یہ کیفیت اتنی فوری اور مختصر تھی کہ نہ منذر دیکھ سکا نہ ابن زیاد، وہ اس طرح ساکت و صامت بیٹھی تھی جیسے یہ فیصلہ اس کے متعلق نہیں کسی اور کے بارے میں ہو، جیسے یہ انقلاب اس کی طرف نہیں کسی اور کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اور منذر کی کیفیت کیا تھی؟

وہ خود اس وقت عجیب کشمکش و پیچ میں گرفتار تھا ——— وہ سوچ رہا تھا لیلےٰ میرے لیے وبالِ جان بن چکی ہے۔ پہلے اس پر یزید عاشق ہوا۔ اب جناب ابن زیاد صاحب عشق و محبت سے شغل فرما رہے ہیں۔ دیکھنا چاہئے اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟

ابن زیاد سے زیادہ منذر اس فکر میں تھا کہ لیلےٰ اس فیصلہ سے کیا اثر قبول کرتی ہے؟ وہ سوچ رہا تھا جس لڑکی نے یزید جیسے شخص کو ٹھکرا دیا وہ بھلا ابن زیاد کو کیا خاطر میں لائے گی؟ اس کی جس شرط کو صحیح اسلامت کو ——— یزید منظور نہ کر سکا۔ اسے بھلا ابن زیاد کیا منظور کرے گا؟
اور وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یزید نے پھر انسانیت برتی اور فقط اس پر اکتفا کیا کہ میری جائداد ضبط کر لی۔ مجھ پر جرمانہ کر دیا۔ مجھے ایک شخص کا غلام بنا دیا۔ لیکن یہ ابن زیاد اگر پھر تو

سب سے پہلے جس چیز سے ہاتھ دھونا پڑیں گے وہ جانِ عزیز ہو گی۔ کاش میں اس کمبخت لڑکی کا باپ نہ ہوتا۔ نہ جانے کون سا گناہِ عظیم سرزد ہوا جس کی سزا قدرت کی طرف سے یہ ملی کہ مجھے لیلےٰ کا باپ بننا پڑا۔ اور یہ سزا شاید اس وقت تک بھگتنا پڑے گی جب تک تنِ بیجان میں جان باقی ہے۔

ابنِ زیاد خاموش تھا لیکن اس کی نگاہیں کام کر رہی تھیں۔

وہ لیلےٰ کے تاثرات اور ردِ عمل معلوم کرنے کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا لیکن پلے کچھ نہ پڑتا تھا۔ وہ ایک ایسا پیکر بنی بیٹھی تھی جو ادراک و احساس سے ماورا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چہرے بشرے سے، کسی چیز سے بھی یہ نہیں اندازہ ہوتا تھا کہ اس وقت وہ کس عالم میں ہے؟

کیا چاہتی ہے؟

کدھر جانا چاہتی ہے؟

آخر ابن زیاد ضبط نہ کر سکا۔ اس نے لیلےٰ کو مخاطب کیا۔

"لیلیٰ ــــــ!"

لیلےٰ :- ارشاد، حضور والا!

ابن زیاد :- تم نے ہمارا فیصلہ سن لیا؟

لیلےٰ :- سن لیا امیر عالی جاہ!

ابن زیاد :- پھر تم کس نتیجہ پر پہنچیں ــــــ؟ کیا رائے قائم کی تم نے؟

لیلےٰ :- جو اپنی رائے اور مرضی کا مختار نہ ہو اس سے یہ پوچھنا کہ تیری کیا رائے ہے ایک قسم کی ستم ظریفی ہے ظرف ہے؟

ابن زیاد :- لیلےٰ، لیلےٰ!

لیلےٰ :- ارشاد، امیر والا جاہ

ابن زیاد :- تم ہمیں غلط سمجھیں، بالکل غلط سمجھیں۔

لیسلے :۔ تو سمجھا دیجئے آپ؟

ابن زیاد :۔ تم مجبور نہیں، مختار ہو، باندی نہیں آزاد ہو، تم جس طرح یزید کو ٹھکرا سکتی تھیں ہمیں بھی ٹھکرا سکتی ہو۔ تمہاری بے مہری اور بے التفاتی نے جس طرح یزید کے سینے میں داغ ڈال دیا ہے۔ ہم بھی اپنا سینہ پہلی اور آخری مرتبہ پیش کرتے ہیں ہم تم سے محبت کرتے ہیں۔ اگر تم نے محبت قبول کر لی تو شکر گزار ہوں گے اور رد کر دی تو ناکامی کے داغ کو تمہاری ایک یادگار سمجھ کر اپنے سینہ میں ہمیشہ محفوظ رکھیں گے۔ یہ کہہ کر ابن زیاد نے لیسلے کی طرف دیکھا۔ اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی اور اس کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی کی مالک و مختار ہو۔ پھر ہم پوچھتے ہیں۔ بتاؤ۔ تم نے کیا رائے قائم کی؟ کس نتیجہ پر پہنچیں تم؟"

لیسلے :۔ آپ کا انداز یزید سے مختلف ہے۔

ابن زیاد :۔ (خوش ہو کر) میرا انداز یزید سے مختلف ہے ——— ؟
یعنی ——— ؟

لیسلے :۔ اس کا انداز آمرانہ تھا۔ اس میں حکم تھا، سختی تھی، دباؤ تھا۔ تحریص تھی۔ ترغیب تھی۔ لالچ اور دھمکی تھی۔

ابن زیاد :۔ اور میرے انداز میں کیا پایا تم نے؟

لیسلے :۔ انسانیت، معقولیت ——— اگرچہ مجھے یقین ہے، انجام کار، آپ کی اور یزید کی راہ ایک ہی ہو جائے گی۔

ابن زیاد :۔ یہ تم نے بڑی عجیب بات کہہ دی۔ یہ تم نے کیا کہا کہ انجام کار میری اور یزید کی راہ ایک ہی ہو جائے گی ——— ؟ کیسی راہ ——— ؟

لیسلے :۔ یزید بھی شروع میں جب تک آس تھی انسانیت کا پیکر بنا ہوا تھا لیکن جب مایوسی ہوئی تو شمشیر برہنہ بن گیا۔

ابن زیاد :۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ہماری پیش کش رد کر دی، ہماری یہ درخواست قبول نہ کی تو ہم بھی یزید کی طرح سختی کریں گے یا تشدد پر اتر آئیں گے۔

لیلےٰ :۔ جی ہاں، میرا مدعا اور مطلب یہی ہے۔

ابن زیاد :۔ لیلےٰ! تم بہت زیادتی کر رہی ہو۔ تم مسلسل ہمارے جذبات مجروح کر رہی ہو ــــ ہم پھر کہتے ہیں۔ تم نے ہمیں غلط سمجھا۔

لیلےٰ :۔ (مسکرا کر) آپ چاہتے ہیں میں انکار کر کے اپنا دعویٰ ثابت کر دوں۔

ابن زیاد :۔ اگر ایسا ہوا تو بلاشبہ ہمیں شدید رنج ہو گا ــــ لیکن اگر چاہو تو ایسا کر سکتی ہو اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ تمہارا خیال غلط ثابت ہو گا۔

لیلےٰ :۔ یعنی آپ میرے فیصلہ کو ہنسی خوشی قبول کر لیں گے؟

ابن زیاد :۔ ہنسی خوشی نہیں، رنج کے ساتھ، افسوس کے ساتھ، لیکن قبول کر لوں گا۔"

لیلےٰ :۔ اچھا دیکھا جائے گا۔

ابن زیاد :۔ دیکھا کیا جائے گا۔ اپنے فیصلہ کا اعلان کرو۔ ہم چاہتے ہیں کہ رسمِ نکاح یہیں انجام پائے۔ پھر آگے بڑھیں۔ پھر کوفہ میں داخل ہوں۔

لیلےٰ :۔ مجھے سوچنے دیجئے۔ غور کرنے دیجئے۔

ابن زیاد :۔ سوچ لو۔ غور کر لو۔ ہمارا سفر ملتوی رہے گا۔ ہم یہیں اسی پڑاؤ میں قیام کریں گے ہم کل یہاں سے روانہ ہونے والے تھے۔ اب پرسوں جائیں گے ــــ کیا کل تک تم آخری اور قطعی رائے قائم کر لو گی؟

لیلےٰ :۔ یقیناً ــــ!

ابن زیاد :۔ تو اب جا سکتی ہو۔

لیلےٰ اور منذر رخصت ہو کر پھر اپنے خیمہ میں آ گئے۔ ابن زیاد کے خیمہ سے باہر نکلنے کے بعد لیلےٰ نے دیکھا وہ بوڑھا ساربان تیزی سے ایک طرف سے نکل کر دوسری طرف چلا گیا۔

مانندِ برق، مثلِ نگہ، صورتِ ہوا

منذر تو اسے دیکھ بھی نہ سکا۔ لیلےٰ نے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئی۔

منذر اور لیلےٰ کے رخصت ہونے کے بعد ابن زیاد نے اپنے دیرینہ کار اور معتمد غلام مرجان کو بلایا اور کہا۔

"منذر اور لیلےٰ کی پوری نگرانی رکھو۔ نہ ان تک پرندہ پر مار سکے نہ لشکر کے باہر قدم نکال سکیں۔ ان کی حیثیت ایک خطرناک قیدی کی ہے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیئے ایک قیدی کی نگرانی کس طرح کی جا سکتی ہے؛ احتیاط صرف اتنی رکھو کہ قیدی یہ محسوس نہ کر سکے کہ وہ قیدی ہے ——!"

باب ۴۷

وہ ساربان !

منذر اور لیلےٰ جب اپنے خیمہ کے قریب پہنچے تو منذر کو اس کا ایک واقف کار مل گیا۔ وہ اس سے کھڑا ہو کر باتیں کرنے لگا۔ لیلےٰ خیمہ میں داخل ہوئی تو وہ بوڑھا ساربان جسے لیلےٰ نے ابن زیاد کے خیمہ سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ موجود تھا۔ اس وقت اسے اپنے خیمہ میں پاکر وہ کچھ متحیّر بھی ہوئی، متعجب بھی اور کسی حد تک بدمزہ بھی۔

بوڑھا ساربان، لیلےٰ کو دیکھ کر سرو قد تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ لیلےٰ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور ترش روئی کے ساتھ پوچھا۔

لیلےٰ :۔ تم یہاں کیسے ؟ کس کی اجازت سے آئے اور کیوں آئے ؟

ساربان :۔ میں اپنی جسارت کی معافی چاہتا ہوں"

لیلےٰ :۔ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو معاف نہیں کئے جا سکتے۔

ساربان :۔ تو جو سزا آپ میرے لئے تجویز فرمائیں اس کے بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔

لیلےٰ ـــ سزا ـــ ؟ ہنسی کھیل سمجھتے ہو سزا کو، جانتے ہو ایک شریف عورت کے خیمہ میں اگر کوئی شخص بلا اجازت گھس آئے تو موت سے ہلکی سزا نہیں دی جا سکتی اسے ـــ !

ساربان :۔ یہی سہی، ـــ لیکن ـــ !

لیلےٰ :۔ (برہمی کے ساتھ) لیکن ویکن کیا۔ تم بدتمیز اور گستاخ ہو ـــ تمہاری یہ جرأت ناقابلِ معافی ہے۔ میں برابر دیکھ رہی ہوں کہ تم ہماری ٹوہ میں رہتے ہو۔ ہماری باتیں سننے کی کوشش کرتے ہو۔ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی کرتے ہو۔ اگر یہ

سب کچھ ابن زیاد کے حکم سے کرتے ہو تو بھی، یہاں اس طرح آنے کی اجازت تمہیں نہیں دی جا سکتی۔ میں یہ خیمہ خالی کر دوں گی۔ تم اور ابن زیاد رہو شوق سے، میرے پڑ رہنے کے لئے کھردری زمین کا ایک گوشہ کافی ہے۔ لیکن اپنی توہین و تذلیل نہیں برداشت کر سکتی۔

ساربان :۔ بھلا آپ کی توہین و تذلیل کی جرأت کون کر سکتا ہے ؟ آپ کی توہین ابن زیاد کی توہین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ یزید سے زیادہ قوت و اقتدار کا مالک ہے۔ اور آپ اس کی مالک ہیں میں تو صرف مبارکباد دینے آیا تھا۔ ظاہر ہے مجھ۔ بوڑھے کھوسٹ کی کوئی بری نیت نہیں ہو سکتی تھی۔

لیلےٰ کا چہرہ فرطِ غضب سے تمتما اٹھا۔ وہ غصہ سے کانپنے لگی۔ اس نے بہت نرم لہجہ میں کہا۔

”نکل جاؤ یہاں سے۔ تم بدتمیز ہو، گستاخ ہو، دریدہ ذہن ہو“

ساربان :۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ صرف ایک ضعیف و نحیف شخص ہوں۔ آپ حکم دیتی ہیں میں چلا جاتا ہوں“

لے چلے جاتے ہیں اے یار چلے جاتے ہیں

لیلےٰ :۔ پھر وہی گستاخی، واقعی شامت آئی ہے تمہاری۔ یہ باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیئے۔ تم اب تک کھڑے ہو۔ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ جاتے ہو یا پھر ——— ؟

ساربان :۔ نہیں آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں جاتا ہوں۔ ابھی چلا جاؤں گا۔

لیلےٰ :۔ تو انتظار کا ہے کا ہے ؟ جاتے کیوں نہیں ؟

ساربان :۔ آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

لیلےٰ :۔ میں تمہاری بکواس نہیں سننا چاہتی۔ تم بوڑھے ہو۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ لیکن اول درجہ کے بدنظر بھی ہو۔ برابر مجھے گھورے جا رہے ہو۔ جی چاہتا ہے تمہاری آنکھیں نکال لوں۔

ساربان :- تو کس نے منع کیا ہے ! آنکھیں کیا سر بھی حاضر ہے !

لیلے :- (غصہ سے کانپتے ہوئے) خاموش ، بے ادب !

ساربان :- تعمیل کرتے ہوئے خاموش ہو جاؤں گا لیکن وہ اہم اور ضروری بات رہ جائے گی۔ جسے آپ کے سمع مبارک تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

لیلے :- کچھ مت کہو۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتی !

ساربان :- خواہ وہ بات کیسی ہی اہم ہو !

لیلے :- کتنی ہی اہم اور کیسی ہی ضروری ہو ـــــ اب میں آواز دیتی ہوں عافیت اسی میں ہے کہ نکل جاؤ یہاں سے ، بڑے میاں !

ساربان :- آخر آپ کو رحم آہی گیا میرے حال پر ـــــ واقعی بڑی رحمدل ہیں آپ !

لیلے :- (گھبرا کر) آخر تم کیا چاہتے ہو ؟ کیوں آئے ہو ؟

ساربان :- بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن کہنے کی اجازت بھی تو ملے۔ اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن آپ موقع بھی دیں۔ اپنی ساری رام کہانی سنا دینا چاہتا ہوں۔ لیکن آپ مائل کرم بھی تو ہوں کسی طرح !

لیلے :- بڑے میاں ! مجھے صرف تمہارے بڑھاپے پر رحم آتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے ایک لبِ گور بوڑھا جان سے مارا جائے۔ اپنے اوپر رحم کرو۔ بھاگ جاؤ اس خیمہ سے۔

ساربان :- میں نے ابھی کہا تھا آپ بڑی رحم دل ہیں۔ شاید آپ نے محسوس کر لیا کہ دل صرف یزید کے سینہ میں نہیں مچلتا۔ صرف ابن زیاد کے سینہ میں طوفان اور قیامت نہیں برپا کرتا۔ ایک غریب اور مفلوک الحال ساربان کے سینہ میں بھی اچھل کود مچا سکتا ہے۔ اسے بھی مبتلائے محبت کر سکتا ہے۔

لیلے :- (چیخ کر) بڈھے ، کمینے ، نمک حرام !

ساربان :- مجھے اس سے انکار نہیں کہ بوڑھا ہوں لیکن اس سے انکار ہے کہ کمینہ ہوں اور اس سے نہایت سختی کے ساتھ انکار ہے کہ نمک حرام ہوں۔ کمینہ ہوتا تو اس موقعے

فائدہ اٹھاتا اور آپ میری دسترس میں ہوتیں۔ نمک حرام اس لئے نہیں کہ یزید اور ابن زیاد دونوں کا نمک اپنے اوپر حرام کر چکا ہوں۔ نہ آج تک ان کا نمک کھایا ہے نہ زندگی کے آخری سانس تک اتنا بڑا گناہ کروں گا۔ باقی رہا بوڑھا ہونا سو وہ ایسا جرم نہیں ہے جسے بخشا نہ جا سکے اور اگر یہ جرم بھی ہے تو اس میں میری خطا کیا ہے۔ یہ تو قدرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ جس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ آج میں بوڑھا ہوں تو کل آپ بھی بوڑھی ہوں گی۔ یہ پھول سے گال مرجھا جائیں گے۔ یہ خوشنما اور دیدہ زیب رنگ میٹا جائے گا۔ یہ لانبی لانبی زلفیں مختصر ہوتے ہوتے ناپید ہو جائیں گی۔ ان ہونٹوں کا رس سوکھ جائے گا۔ ان آنکھوں کا جادو طلسم باطل بن جائے گا۔ یہ رعنائی جواب دے جائے گی۔ یہ زیبائی رفو چکر ہو جائے گی یہ پھبن جاتی رہے گی۔ یہ وقار اور دبدبہ افسانۂ پارینہ بن جائے گا یہ جلال اور جمال ایک فراموش شدہ کہانی کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ آپ کے پوتے اور پوتیاں، نواسے اور نواسیاں آپس میں فخر و ناز سے چرچا کریں گی۔ کہ ہماری دادی جان، ہماری نانی اماں بڑی خوبصورت تھیں۔ فتنۂ روزگار تھیں۔ جدھر دیکھ لیتی تھیں قیامت آجاتی تھی۔ جسے دیکھ لیتی تھیں وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ یزید نے ان سے محبت کی اور دیوانہ ہو گیا۔ ابن زیاد نے انہیں دیکھا۔ اور دل دے بیٹھا۔ لیکن ان کا کردار اتنا اونچا تھا کہ انہوں نے یزید کی دولت، ابن زیاد کی ثروت ٹھکرا دی اور ہمارے دادا جان سے ہمارے نانا میاں سے جو ایک غریب اور مفلوک الحال ساربان تھے شادی کر لی اور دنیا میں ان کا اور اپنا نام کر گئیں۔ یہ چرچے اس وقت ہوں گے جب بڑھاپے کی منزل ختم کر کے تم اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہوں گی۔ لوگ عقیدت اور اشتیاق کے ساتھ تمہاری تمہارے طفیل میری قبر دیکھنے آیا کریں گے اور قبر پر پھولوں کی چادر، تر و تازہ پھولوں کے ہار اور طرے دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھیں گے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

—— لیلے، آؤ، ہم تم ایک تاریخ بنائیں۔ شاندار یادگار اور انوکھی تاریخ، محبت کی، سچی محبت کی تاریخ۔ سوچو مت، یہ کام بہر حال تمہیں کرنا ہے۔ میں تمہارا بن چکا۔ تم میری ہو چکیں، دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ ہماری محبت کا خدا گواہ ہے، یہ چاند تارے گواہ ہیں، اس خیمہ کی تنہائی گواہ ہے، آؤ میرے قریب آؤ۔ میرے اشتیاق کو دیکھو۔ میرے حالِ زار کو دیکھو، مجھے قبول کر لو۔ میں نے سارا سامان تیار کر رکھا ہے۔ میری اونٹنی بڑی تیز رفتار اور اس سے زیادہ وفادار ہے۔ وہ ہم دونوں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر بادِ صبا کی طرح ریت کے ٹیلوں اور پہاڑوں کو طے کرتی ہوئی نکال لے جائے گی وہاں۔ جہاں ہم ہوں گے، تم ہو گی، خدا کی سلطنت ہو گی۔ نہ ابن زیاد کا دبدبہ ہو گا۔ نہ یزید کی حکومت ہو گی —— سوچ کیا رہی ہو لیلے! آؤ آؤ۔

لیلے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے ساربان کی داڑھی پر ہاتھ ڈال کر اسے کھینچا۔ وہ ہاتھ میں آ گئی اور —— ربیع کھڑا مسکرا رہا تھا۔

باب ۴۸

نئے پروگرام نئے ولولے

ربیع کو اس طرح اچانک دیکھ کر لیلےٰ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی ——— جان نذر دینی بھول گئی۔ اضطراب میں کتنے دنوں سے وہ اس کی راہ تک رہی تھی۔ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ کبھی نظر نہ آیا۔ کبھی امید پیدا ہوتی کبھی یاس غالب آجاتی۔ کبھی یقین ہوتا کہ وہ آئے گا، ضرور آئے گا۔ مصیبت کے اس بھنور سے نکال لے جائے گا۔ کبھی۔ اندیشہ پیدا ہوتا۔ وہ بھول گیا۔ وہ نہیں آیا وہ نہیں آئے گا۔ زندگی کے یہ دن صرف اس لئے ہیں کہ کسی کی یاد میں صرف کر دیئے جائیں۔ محبت کے ماتم میں وہ محبت جو پروان نہ چڑھ سکی جو راس نہ آئی۔

اور عین اس وقت جبکہ مایوسی حد کمال کو پہنچ چکی تھی۔ جب آس مٹ چکی تھی۔ جب ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ دفعتہ وہ رونما ہوا اور اس کے رونما ہوتے ہی ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔ سارے مصائب کا خاتمہ ہو گیا۔ ہر پریشانی ختم ہو گئی۔ اب پھر خوشی تھی۔ مسرت تھی ؎

اے فلک رشک سے نہ جل مرنا
بچھڑے ملتے ہیں بعد مدت کے

لیلےٰ نے کہا:۔

"تم ———؟"

اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

ربیع نے کہا۔

" ہاں لیلےٰ میں ہوں، میرے استقلال کو دیکھو۔ کیسی کیسی مصیبتوں میں گھرا رہا۔ لیکن تمہیں نہ بھولا۔ کیسے کیسے ناسازگار اور نامساعد حالات سے دوچار رہا۔ لیکن لیلےٰ کی یاد مونس و ہمدم بنی رہی "

لیلےٰ نے کہا۔

لیکن تم تھے کہاں ؟"

ربیع بولا۔

" یہ نہ پوچھو۔ نہ جانے اس عرصہ میں کہاں کہاں کی خاک چھانی ہے ؛ کہاں کہاں جانا پڑا ہے سے ؛

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نہ تمہارے خیال سے غافل رہا، نہ تمہارے حالات سے

لیلےٰ :۔ میں تو آپ کو بہت سچا سمجھتی تھی!

ربیع :۔ اور اب جھوٹا سمجھنے لگی ہو۔

لیلےٰ :۔ پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ جن میں صداقت نہیں۔

ربیع :۔ یہ تم نے کیسے جانا؟

لیلےٰ :۔ اس طرح کہ آپ ایسی بات کہتے ہیں جو واقعہ کے خلاف ہے واقعیت سے دُور ہے۔ بھلا آپ کو میرے حالات کا پتہ کیسے چلا؟

ربیع :۔ یہ تم نے کیا کہا۔

ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

مَنْ جَدَّ وَجَدَ (جس نے کوشش کی پالیا)

لیلےٰ :۔ پھر آپ مجھ سے کبھی ملے کیوں نہیں؟

ربیع :۔ اس لئے کہ ملنا بے کار تھا۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے فرائض انجام دے رہا تھا جن پر تمہیں بھی قربان کر سکتا تھا۔

لیلے :۔ اَب وہ فرائض انجام دے چکے آپ ؟

ربیع :۔ ہاں ، بڑی حد تک ۔

لیلے :۔ اب آپ میری مدد کر سکتے ہیں ؟

ربیع :۔ اسی لئے تو سایہ کی طرح اس سفر میں تمہارے ساتھ ہوں ، کبھی خادم کی حیثیت سے ، کبھی ساربان کے روپ میں ـــــ قائل تو نہ ہو گی ہماری ؟

لیلے :۔ آپ کی قائل تو ہمیشہ سے ہوں ـــــ لیکن اب ہو گا کیا ؟

ربیع :۔ اتنے بڑے گھر میں پہنچنے کے بعد بھی سوچتی ہو کہ کیا ہو گا ؟ اب تمہیں چاہیئے کیا ؟

لیلے :۔ آپ کا مطلب کیا ہے ان باتوں سے ؟

ربیع :۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب ابن زیاد اتنی خوشامد کر رہا ہے تو کیوں ـــــ توڑ و اس غریب کا دل ۔ ویسے وہ ہے بھی بڑا آدمی !

لیلے :۔ (تیوری چڑھاکر) آپ کے طنز کا سلسلہ جاری رہے گا ؟ آخر آپ مجھے سمجھتے کیا ہیں ؟ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے بغیر میرا بیڑا پار نہیں لگ سکتا ۔ تو آپ مغالطہ میں ہیں ۔

ربیع :۔ یعنی تم خود اپنے سفینۂ زندگی کی ناخدا بن جاؤ گی ؟

لیلے :۔ ہاں ، ضرور ۔

احسان ناخدا کا اٹھائے میری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

مجھے نہیں چاہیئے آپ کی مدد ، جائیے ، تشریف لے جائیے ۔ یہ کہہ کر لیلے دوسری طرف جاکر بیٹھ گئی ۔

ربیع :۔ لیلے :۔ تم خفا ہونا بھی جانتی ہو ؟

لیلے :۔ اگر آپ خفا کرنا جانتے ہیں تو مجھے خفا ہونا بھی آتا ہے ـــــ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو ، اپنی ہیئت اور وضع ٹھیک کر لیجئے ۔ ابھی ابا جان آتے ہوں گے ۔ وہ آ گئے اور آپ اسی طرح کھڑے رہے تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں

گے۔

ربیع :۔ نہیں لیسلےٰ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں جس طرح کھڑا ہوں، اسی طرح کھڑا رہوں گا چاہے تمہارے والد آجائیں ـــــــ یا ابن زیاد یا یزید۔

لیسلےٰ :۔ کیوں شامت آئی ہے کچھ؟

ربیع :۔ یہی سمجھ لو۔ اگر تم خوش نہیں ہوتیں تو مجھے مر جانے دو۔

لیسلےٰ :۔ یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے؟ خوشی اور ناخوشی کا کیا سوال ہے؟

ربیع :۔ یہی تو اصل سوال ہے ـــــــــــــــ بتاؤ میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو یا نہیں۔

لیسلےٰ :۔ اس کا جواب آپ کو خود معلوم ہونا چاہیئے۔

ربیع :۔ میں نے اسی لئے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر یہ روپ بھرا ہے اگر ابن زیاد کو شبہ بھی ہو گیا کہ میں ساربان نہیں، ربیع ہوں تو وہ میری کھال کھنچوالے گا۔ اس کی مجھے پروا نہیں، لیکن ابھی کچھ عرصہ تک موت کا استقبال کرتے ہوئے گھبراتا ہوں۔

لیسلےٰ :۔ استقبال کرنے کا خیال ہی کیوں آتا ہے آپ کے دل میں؟

ربیع :۔ وہ تو آنا ہی چاہیئے۔ میری صرف ایک حسرت ہے، چاہتا ہوں وہ پوری ہو جائے پھر مروں۔ وہ یہ کہ تم میری بن جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے کتنے دکھ جھیلے ہیں صرف میرے لئے۔ میں تم سے دور تھا اور دور رہنے پر مجبور تھا لیکن تمہارے حالات سے واقف تھا تمہاری سہیلی رقیہ میری بھی ہمدرد ہے اس نے تمہارے حالات سے مجھے باخبر رکھا۔ کن کن مصائب سے تمہیں دوچار ہونا پڑا۔ وہ سب کچھ میرے علم میں ہے اور یہ بھی کہ تم میری محبت قبول کر چکی ہو۔

لیسلےٰ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

ربیع نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"موت برحق ہے۔ ہر شخص کو مرنا ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ جیداری سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں لیکن میرے مرنے سے پہلے اگر تم میری نہ بنیں تو جنت بھی مجھے

پھیکی اور بے مزہ نظر آئے گی۔

لیلےٰ :- آپ نے ابھی کہا تھا کچھ فرائض ہیں جن پر آپ مجھے قربان کر سکتے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں۔ ان کی نوعیت کیا ہے؟

ربیع :- ضرور پوچھ سکتی ہو۔ حق ہے تمہیں اس کا۔ لیکن ابھی نہیں ذرا صبر سے کام لو۔ وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اور وہ وقت بہت قریب ہے۔ اس وقت تو صرف یہ سوال ہے کہ یہاں سے چل نکلو سلامتی کے ساتھ۔ میری یہ سانڈنی بڑی برق پا ہے، بجلی کی طرح ریت کے سمندر میں دوڑتی ہے۔

لیلےٰ :- لیکن ابا جان کو تو آ لینے دو۔

ربیع :- وہ آتے رہیں گے۔ تم سامانِ سفر تیار کرو۔ آج ہی رات کو ہمیں یہاں سے نکل جانا ہے ورنہ پھر کبھی موقعہ نہ ملے گا۔

لیلےٰ سامان باندھنے میں مصروف ہو گئی۔ ربیع اپنے خیمہ میں واپس جانے لگا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔

رات کو دو بجے میری سانڈنی بالکل تیار ببول کے اس درخت کے پاس ملے گی۔ تم اور منذر اپنا مختصر سا سامان لے کر وہاں آجاؤ۔

وہ چلا گیا اور جیسے ہی گیا۔ منذر آگیا۔ منذر نے لیلےٰ کو سامانِ سفر باندھتے دیکھا تو سمجھا، لڑکی دیوانی ہو گئی ہے وفورِ غم سے اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

لیلےٰ! تو یہ کیا کر رہی ہے۔؟

لیلےٰ نے مسکراتے ہوئے اشارہ سے چپ رہنے کی ہدایت کی اور پھر پاس جاکر چپکے چپکے کان میں باتیں کرنے لگی۔ وہ سنتا جا رہا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔

باب ۴۹

فرار

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ قافلہ پر سکوت مرگ آسا طاری ہے کبھی کبھی کسی طلایہ دار کی آواز گونج جاتی ہے اور اس کے بعد پھر سناٹا۔

ابن زیاد اپنے خیمہ میں بے خبر سو رہا ہے۔ مرجان، جو منذر اور لیلےٰ کی نگہبانی پر مامور کیا گیا تھا۔ ساربان کے خیمہ میں بے ہوش پڑا ہے۔ جیسے کسی نے کوئی نشہ آور چیز پلا دی ہو۔ خواہ ابن زیاد کی بے خبر نیند بھی اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ یہ صرف نیند نہیں۔ اس میں کچھ بے ہوشی کی آمیزش بھی ہے۔ بوڑھے ساربان کا خیمہ خالی پڑا ہے منذر کے خیمہ میں بھی۔ سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ منذر ہے نہ لیلےٰ۔

تھوڑی دیر کے بعد نماز فجر کی اذان قافلہ میں گونجی۔

"الصلوٰۃُ خیرٌ من النوم"

اس دل افروز، روح پرور اور دلکشا آواز نے نیند کے ماتوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ جہاں اب تک موت کا سکوت چھایا تھا وہاں زندگی کی چہل پہل نظر آنے لگی —— کوئی حوائج ضروری سے فارغ ہو رہا ہے۔ کوئی وضو کر رہا ہے۔ کوئی نماز کے لئے تیاری کر رہا ہے۔ کوئی سنتیں پڑھ رہا ہے۔ لیجیے تھوڑی ہی دیر میں میدان نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔

اَب فجر کا وقت آخر ہوتا جا رہا ہے لیکن میرِ قافلہ ابنِ زیاد اب تک برآمد نہیں ہوا۔ معمول یہ ہے کہ نماز وہی پڑھاتا ہے لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں۔ نمازی بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ چند لمحے اور اگر نذرِ انتظار ہو گئے تو نماز قضا ہو جائے گی۔

اب لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، کیا بات ہے؟ ابن زیاد اب تک خوابِ راحت سے بیدار نہیں ہوا؟ سب یہی سوچ رہے ہیں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ بھی کر رہے ہیں۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ ابن زیاد کے خیمہ میں جائے، اسے بیدار کرے۔ خیمہ کے نگہبان خاموشی کے ساتھ پہرے دے رہے ہیں۔ ان میں بھی یہ حوصلہ نہیں کہ اندر داخل ہوں۔ اور اپنے آقائے ولی نعمت کو ہوشیار کریں۔

بہت دیر ہوگئی تو ایک شخص نے کہا۔

"وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہم نے اگرچہ چند لمحے بھی اور ضائع کئے تو نماز قضا ہو جائے گی"

ایک دوسرے شخص نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم میں سے کوئی جائے اور امیر ابن زیاد کو جگا دے؟"

وہی شخص گویا ہوا۔

"بیکار ہے ——— اب اگر امیر بیدار بھی ہو جائیں تو نماز نہیں پا سکتے جب تک وضو کریں گے۔ وقت جا چکا ہوگا۔ نماز قضا ہو چکی ہو گی۔ ہر شخص خود ہی اپنا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ امیر کے انتظار میں مَیں تو اپنی نماز قضا نہیں کر سکتا"

"اللہ اکبر اللہ اکبر"

یہ کہہ کر اس نے اقامت شروع کی اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اس اقدام نے دوسروں میں بھی ہمت پیدا کی اور وہ بھی اس شخص کی اقامت میں نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔

اور واقعی اب اگر ایک لمحہ کی بھی تاخیر کی جاتی تو نماز کے قضا ہو جانے میں کوئی شک نہیں تھا۔ کیونکہ امام نے جب سلام پھیرا ہے تو سورج کی کرنیں شبنم کے قطروں پر جگمگا رہی تھیں۔

نماز کے بعد لوگ وہیں میدان میں بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ ابن زیاد برآمد ہو تو اس کی خیریت معلوم کریں۔ لیکن کافی عرصہ گزر گیا امیر ابن زیاد نہ برآمد ہوئے نہ بیدار ہوئے۔

اب لوگوں کی تشویش بڑھی۔ پہرے دار نے کہا۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ لوگ خیمہ میں تشریف لے جائیں اور دیکھیں امیر کس حال میں ہیں؟ اتنا دن چڑھ آیا ہے اگر اب تک وہ بیدار نہیں ہوئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ دال میں کالا ہے۔"

بات معقول تھی۔ آخر کچھ لوگ ہمت کر کے اندر داخل ہوئے۔

ابن زیاد بستر پر چادر اوڑھے ہوئے لیٹا تھا۔ لوگوں نے اُسے آواز دی۔ پکارا، ہاتھ پاؤں ہلائے۔ آخر جھنجوڑا تو بڑی مشکل سے کروٹ بدلی۔ پھر کچھ لوگوں نے منہ پر پانی چھڑکا تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ پہلے تو اِدھر اُدھر نظر ڈالی لیکن کچھ سمجھ نہ سکا۔ لوگ کیوں جمع ہیں؟ مگر لیکن پُرزور آواز میں پوچھا:۔

"کیا ہے؟ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟"

لوگوں نے عرض کیا:۔

"دوپہر ہونے کو آئی۔ اور آپ اب تک مستِ خواب ہیں۔ خیریت تو ہے؟ مزاج تو اچھا ہے؟"

یہ سن کر ابن زیاد نے پھر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور صورتِ حال کو سمجھ کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے پوچھا:۔

"کیا میں اب تک سوتا رہا ہوں؟"

لوگوں نے عرض کیا:۔

"جی ہاں، یا امیر! آپ اب تک محوِ استراحت رہے ہیں۔ نمازِ فجر بھی قضا ہو گئی آپ کی۔ اب تھوڑی دیر میں ظہر کی اذان ہوا چاہتی ہے۔"

یہ سن کر ابن زیاد کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کہا۔

"مرجان کہاں ہے اسے بلاؤ۔!"

فوراً لوگ دوڑے دوڑے گئے کہ مرجان کو تلاش کریں۔ مگر وہ کہیں نہ ملا۔ لوگوں نے آکر اطلاع دی:۔

"وہ تو یہاں نہیں!"

" یہ سن کر ابن زیاد تڑپ گیا۔ اس نے چیخ کر کہا:۔

"کہاں جا سکتا ہے؟ اسے ڈھونڈو۔ زندہ یا مردہ جہاں ملے لے کر آؤ!"

لوگ پھر تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اتنے میں ہانپتا کانپتا فراش حاضر ہوا۔ اس نے کہا:۔

"وہ تو ساربان کے خیمہ میں بے ہوش پڑا ہے"

ابن زیاد :۔ ساربان کے خیمہ میں؟ اور خود ساربان کہاں ہے؟

فراش :۔ وہ تو وہاں نہیں ہے!

ابن زیاد :۔ (متحیر ہو کر) وہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟

فراش :۔ میں نہیں جانتا یا امیر! وہ کہاں چلا گیا؟

ابن زیاد :۔ جاؤ منذر کو بلا لاؤ۔ کہنا امیر یاد کرتے ہیں۔

فراش :۔ وہ بھی خیمے میں نہیں ہیں۔

ابن زیاد :۔ (بگڑ کر) جسے بلاتا ہوں وہ غائب، آخر یہ کیا ماجرا ہے؟ جاؤ لیلےٰ کو لے آؤ۔

فراش :۔ یا امیر!

ابن زیاد :۔ یا امیر کے بچے! کہتا کیوں نہیں۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟ کیا لیلےٰ بھی کہیں غائب ہو گئی؟

فراش :۔ "جی! وہ بھی خیمہ میں نہیں ہیں۔ نہ کچھ سامان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہیں باہر گئے ہیں وہ لوگ؟

ابن زیاد :۔ باہر کہاں جا سکتے ہیں؟ ——— طلایہ دار کو بلاؤ۔

وہ فوراً ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔

ابن زیاد :۔ تم نے رات بھر جاگ کر پہرہ دیا؟

طلایہ دار :۔ جی ہاں، رات بھر جاگ کر پہرہ دیتا رہا ہوں"

ابنِ زیاد :۔ پھر منذر اور بیلے کس طرح نکل گئے ؟

طلایہ دار :۔ میں نہیں جانتا۔ رات بھر ان کے خیمہ میں روشنی ہوتی رہی۔ ایک مرتبہ میں نے چاہا بھی کہ جاؤں۔ وجہ دریافت کروں۔ لیکن مرجان نے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ امیر کا حکم ہے اس خیمہ میں کوئی نہیں جا سکتا۔ میں خاموش ہو گیا۔

ابن زیاد :۔ مرجان کو حاضر کرو۔

کئی لوگ گئے اور مرجان کو اٹھا کر لے آئے۔ وہ اب تک پورے طور پر ہوش میں نہیں آیا تھا۔ مدہوشی کی باتیں کر رہا تھا۔

ابن زیاد :۔ یہ تیری کیا حالت ہو رہی ہے کمبخت ؟

مرجان :۔ چاندنی رات ہے۔ تارے چھٹکے ہوئے ہیں۔ ایک ناظورۂ ملائک قریب اپنا نغمہ سنا رہی ہے۔ واہ کیسی اچھی آواز ہے۔ کتنا عمدہ گلا ہے ـــ !"

ابنِ زیاد :۔ خاموش، بے ادب ـــــ تو ساربان کے خیمہ میں کیسے پہنچا ؟ کیوں گیا تھا وہاں

مرجان نے اٹھلا کر کہا۔

"کون ہوتا ہے حریف مئے مردافگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد"

ابن زیاد :۔ ساربان کہاں گیا ؟

مرجان :۔ "اونٹنی کا دودھ بڑا مزیدار ہوتا ہے۔ اس میں تلخی بھی ہوتی ہے اور شیرینی بھی "

ابن زیاد :۔ اونٹنی کے بچے، تیرا باپ منذر کہاں گیا !

مرجان :۔ ؎ "نہ چھیڑو ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں
جدائی کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں"

یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ابن زیاد نے حکم دیا :۔

"اس کے جوتے مارو !"

مار پڑنے لگی بیچارے پر اور وہ پٹتے پٹتے بے ہوش ہو گیا۔

ابن زیاد غصے سے ہونٹ چبا رہا تھا۔ منذر کا اس طرح بچ کر نکل جانا۔ لیلیٰ کا راہِ فرار اختیار کرنا۔ اس کا بے ہوش کر دیا جانا۔ مرجان کو نشہ آور چیز پلا دینا، یہ ایسے سانحات تھے جنہوں نے اسے شعلۂ برق بنا دیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا، یہ سب کیسے ہوا؟ مگر یہ معمہ کسی طرح حل نہیں ہوتا تھا۔ ساربان کی طرف بار بار خیال جاتا تھا لیکن یہ وہی ساربان تو تھا جسے مرجان نے اپنی ذمہ داری پر ابن زیاد کے پاس ملازم رکھا یا تھا۔ اور جب تک وہ ملازم رہا تھا بڑی مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ نہیں یہ کام صرف ساربان کا نہیں ہو سکتا۔ اس کی تہہ میں کوئی اور چیز کار فرما ہے اس کی پشت پر کچھ اور لوگ ہیں ـــ لیکن وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟۔

باب ۵

جوش جہاد

ابنِ زیاد کی اس سے بڑھ کر توہین کیا ہو سکتی تھی۔ کہ لیلیٰ اور منذر اس کی آنکھوں کے سامنے سے دھول جھونک کر نکل جائیں۔ اسے حیرت تھی کہ وہ کون شخص تھا جس نے مرجان کو بے ہوش کیا اور نہایت ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ ان دونوں قیدیوں کو، جن میں سے ایک کا وہ خود قیدی تھا۔ اس طرح نکال لے گیا، جس طرح مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ اس کی برہمی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ بہت زیادہ کرید اور جستجو کے بعد اتنا معلوم ہو گیا تھا، کہ اس ساربان نے اسے کوئی میٹھی چیز پلائی تھی۔ جسے پیتے ہی یہ معلوم ہوا کہ وہ آسمان پر اڑا جا رہا ہے۔ اور پھر پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ خود ابنِ زیاد پر جو کچھ گزری تھی۔ اس کی تفصیل یہ معلوم ہوئی۔ کہ رات کو سوتے وقت جو دودھ پیا تھا۔ وہ لیلیٰ کا بھیجا ہوا تھا۔ جسے مرجان نے ساربان سے لیا۔ اور خیمہ کے پہرہ دار کو لے جا کر دے دیا۔ اس نے مطبخ کے داروغہ کو دیدیا۔ اور اس نے بغیر کچھ سوچے ہوئے ابنِ زیاد کی خدمت میں پیش کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ لیلےٰ کا درجہ کیا ہے؟ اور وہ کتنی ابنِ زیاد کی لاڈلی بن چکی ہے۔

ان معلومات کے بعد یہ جستجو شروع ہوئی کہ ساربان دراصل کون تھا؟

مرجان سے جب زیادہ پوچھ گچھ کی گئی اور پوچھ گچھ کے ساتھ مار پیٹ کا سلسلہ بھی شروع ہوا تو اس نے بتایا کہ درحقیقت وہ ساربان کو بالکل نہیں جانتا۔ وہ ایک ضرورت مند کی حیثیت سے آیا۔ چونکہ ابنِ زیاد کے ہاں کوئی نیا ملازم نہیں رکھا جا سکتا، لہٰذا اس نے سو درہم بطور رشوت پیش کئے۔ اور اپنی غربت و بیچارگی کا واسطہ دے کر التجا کی کہ وہ ضامن

بن جائے۔ چونکہ ساربان نے روپیہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی باور کرا دیا تھا۔ کہ وہ دونوں ہم قبیلہ ہیں اور اس نے کچھ اتے پتے بھی ایسے بتائے تھے۔ جن سے یقین ہوگیا کہ وہ جھوٹ نہیں کہتا۔ لہٰذا اس نے ضمانت دے دی اور وہ ملازم ہوگیا۔

یہ جو کچھ معلوم ہوا کافی تھا۔ لیکن بہر حال یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ کہ وہ ساربان دراصل کون تھا؟ یہاں ملازمت اختیار کرنے کا محرک کیا تھا؟ لیلیٰ اور منذر سے کس طرح اس نے شناسائی پیدا کی۔ اور کیونکر ان دونوں کو بہکا کر لے گیا؟ کہاں لے گیا؟ کیوں لے گیا؟ اور وہ لوگ اس کے ساتھ جانے کو کیوں تیار ہوئے؟ کیا دونوں میں ساز باز تھی پہلے سے؟

کیا یہ لوگ، ساربان سے پہلے سے کچھ ربط ضبط رکھتے تھے؟ یہ بڑا ٹیڑھا سوال تھا اور اس کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔

بہر حال ابن زیاد نے بڑی برہمی کے ساتھ حکم دیا کہ خیمے اکھاڑے جائیں۔ اور قافلہ کوفہ کی طرف کوچ کرے۔

اور عین اسی وقت جب خیمے اکھاڑے جا رہے تھے۔ اور لوگ ابن زیاد کی برہمی اور غضب سے سہمے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا قافلہ کوفہ میں داخل ہو رہا تھا!

اس قافلہ کا میر کارواں ربیع تھا اور افراد قافلہ، منذر اور لیلیٰ!

یہ لوگ شہر کے بالکل عقبی حصہ میں ایک مختصر سے خس پوش گھر کے اندر اُترے۔ قیام و طعام کا انتظام پہلے سے مکمل تھا۔ اس گھر میں تین کمرے تھے۔ ایک منذر کے لئے وقف ہوگیا، ایک لیلیٰ کے لئے، ایک ربیع کے لئے۔ گھر اگرچہ چھوٹا اور مختصر سا تھا۔ لیکن نہایت ستھرا اور پاکیزہ جب نہا دھو کر فارغ ہوئے تو ناشتہ پر بیٹھے۔ ناشتہ بالکل سادہ تھا۔ اونٹنی کا دودھ، اور چند کھجوریں۔

لیلےٰ نے پوچھا:۔

"ہم لوگ کہاں ہیں؟"

ربیع:۔ "اتنے دن اس شہر میں رہ چکی ہو۔ لیکن اتنی انجان؟"

لیلےٰ:۔ "میں تو شام سے ایک مرتبہ صرف کوفہ تک آئی ہوں۔ اور کسی شہر کی صورت دیکھی نہ

وہاں سے واقف ہوں "

ربیع :۔ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ یہ کوفہ ہے جہاں آپ تشریف فرما ہیں "

لیلےٰ :۔ (حیرت سے) "کوفہ ؟ ـــــ لیکن یہ تمہارے بھائی کا گھر تو نہیں ہے۔ جہاں ہم پہلے ٹھہرے تھے ؟"

ربیع :۔ "ان کے گھر میں کیوں ٹھہراؤں ؟ کیا میرا گھر نہیں ہے ؟ اپنی چیز اپنی ہی ہوتی ہے "

منذر :۔ "لیکن بیٹا کوفہ آ کر تم نے اچھا نہیں کیا "

ربیع :۔ یہ کیوں ؟ کیا کوفہ میرا وطن نہیں ہے ؟"

منذر :۔ "تمہارا وطن تو ہے۔ لیکن ابن زیاد کا دارالامارۃ بھی تو ہے ؟ کیا یہاں رہ کر تم اس سے چھپ سکتے ہو ؟ یاد رکھو اسے سن گن بھی مل گئی کہ ہم لوگ یہاں ہیں تو سفاکی اور شقاوت کی انتہا کر دے گا "

ربیع :۔ فکر نہ کیجئے۔ وہ خدا نہیں ہے۔ کہ ہمارا اسے پتہ چل جائے۔ اور اگر چل بھی گیا تو ہمارا کچھ نہیں کر سکتا "

لیلےٰ :۔ اتنا تو ظالم ہے وہ "

منذر :۔ "ظالم ہی نہیں۔ انسان دشمن بھی۔ لوگ جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ انسانوں کا شکار کھیلتا ہے "

ربیع :۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ کوفہ ابن زیاد کا دارالامارۃ ہے اور بہت جلد یہ امام عالی مقام حضرت حسین علیہ السلام کا صدر مقام بننے والا ہے "

منذر :۔ (حیرت سے) "یہ کیا کہا ؟"

لیلےٰ :۔ واقعی یہ تو عجیب خبر سنائی آپ نے ؟

ربیع :۔ یزید کی حکومت کے خلاف تمام عالمِ اسلام متحد ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور کوفہ میں وہ آگ بھڑک رہی ہے۔ جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں کا ہر ہر فرد یزید کے خلاف بغاوت کرنے پر تیار ہے۔

منذر :۔ "بیٹا ! اگر یہ خبر سچ ہے۔ تو میں گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے لے چلو۔

ربیع :- "کہاں لے چلوں؟ کہاں جانا چاہتے ہیں آپ؟"

منذر :- (آنکھوں میں آنسو بھر کر) "میں خطاکار ہوں۔ گنہگار ہوں، میں نے امیرالمومنین علی علیہ السلام کی رفاقت سے منہ موڑا۔ دنیا خرید لی اور آخرت بیچ ڈالی۔ اور وہ دنیا بھی میرے پاس نہ رہی۔ وہ بھی مجھ سے چھٹ گئی۔ لیکن ابھی میں زندہ ہوں۔ اور عمل کی پونجی سے آخرت دوبارہ خرید سکتا ہوں؟

ربیع :- بڑے پاکیزہ خیالات ہیں آپ کے؟

منذر :- صرف حوصلہ افزائی پر اکتفا نہ کرو۔ مجھے ہتھیار دو۔ مجھے ان بہادروں کے پاس پہنچا دو۔ جو یزید کا تختہ الٹنے کے لیے بے چین اور مضطرب ہیں۔ جو اس ظالم، غاصب اور غیر اسلامی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتے ہیں۔ میں بوڑھا ہوں۔ لیکن دیکھ لوگے۔ میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ کس بہادری سے کرتا ہوں۔"

ربیع :- "مجھے یقین ہے آپ بہادر اور شجاع ہیں۔"

منذر :- "تو بس بیٹا! اب دیر نہ کر مجھے لے چل۔"

ربیع :- "ذرا صبر کیجئے۔ میں اور آپ دونوں چلیں گے۔ لیکن آج نہیں چند روز بعد۔"

منذر :- اوہ میں اتنا انتظار نہیں کر سکتا۔"

ربیع :- "شوقِ شہادت آپ کو بھی ہے اور مجھے بھی۔ ہم دونوں میدان جنگ میں کودیں گے۔ اور انشاءاللہ دشمن کا صفایا کر دیں گے۔ لیکن امیر کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے جو اس کا حکم ہوگا وہ کریں گے۔"

منذر :- "امیر کیا امام حسین علیہ السلام تشریف لے آئے ہیں یہاں؟"

ربیع :- "ابھی نہیں لیکن جلد آئیں گے ـــــ اور ان کی تشریف آوری سے پہلے مسلم بن عقیل آرہے ہیں۔ ان کے ہاتھ پر عام بیعت ہوگی۔ پھر جسے میدان میں آنا ہے میدان میں آکر اپنے جوہر دکھائے گا۔ اور جسے گھر میں چھپ کر جان بچانی ہے گھر میں دبک کر بیٹھ رہے گا۔"

منذر :- (خوش ہوکر) "ٹھیک ہے بیٹے! لیکن یہ تو بتاؤ مسلم بن عقیل کب آرہے ہیں؟"

ربیع :۔ بہت جلد شاید اسی ہفتہ میں "

لیلےٰ :۔" ایک بات میں بھی کہے دیتی ہوں "

ربیع :۔" فرمایئے، ضرور فرمایئے ہم ضرور سنیں گے۔

لیلےٰ :۔ اگر صورت حال یہ ہے تو میں بھی چھپ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ میں بھی جہاد میں اپنا فرض ادا کروں گی "

منذر :۔ (جوش کے ساتھ) " میں تجھے اس کی اجازت دیتا ہوں "

ربیع :۔ (مسکرا کر) " اور میں بھی ـــــــ! "

باب ۵۱

محبّت کی کسک

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ لیلیٰ سہم گئی۔

"کوئی دستک دے رہا ہے!"

ربیع نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا:۔

"تو گھبرا کیوں گئیں؟ بظاہر یہ ایک خس پوش مکان ہے۔ لیکن درحقیقت قلعہ ہے۔ اسے یزید کا لشکر سر نہیں کر سکتا۔ اسے ابن زیاد کی فوجیں فتح نہیں کر سکتیں۔ اس پر نعمان بن بشیر یورش نہیں کر سکتا۔ یہاں، ہمارا کوئی دشمن اور مخالف نہیں آسکتا۔ یہ وہ آبادی ہے۔ جو سبطِ رسولؐ پر، پروانہ وار قربان ہونے کا عہد کر چکی ہے۔ یہاں کی کسی بات کی ٹوہ نہیں لگ سکتی۔ دستک دینے والا یقیناً ہمارا دوست ہوگا۔ بیٹھو میں ابھی آیا۔!"

لیلیٰ اب تک سہمی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا:۔

"تم کیوں جاتے ہو، ابّا کو بھیج دو؟ —— اُنہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ کوئی دشمن بھی ہوا تو نہیں پہچان سکے گا۔"

ربیع نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا:۔

"ابھی آیا۔ بس چشم زدن میں!"

ربیع چلا گیا اور غریب لیلےٰ اوہام و افکار کی زد میں آگئی —— اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ وہ رو رو کر سوچتی تھی۔

"یہ دستک دینے والا کون تھا؟"

"کوئی دشمن تو نہ تھا؟"

"ممکن ہے ابن زیاد کا کوئی مخبر یا جاسوس ہو؟"

ان تخیلات نے اتنا پریشان کیا کہ دوڑی دوڑی منذر کے پاس آگئی بڑے پریشان اور مضطرب انداز میں کہا:-

"ابا جان! ذرا باہر تو جائیے۔ دیکھئے کیا ہو رہا ہے؟"

منذر بھی گھبرا گیا۔

"کیا ہو رہا ہے بیٹی؟ کچھ بتاؤ تو؟"

وہ مدھم آواز میں گویا ہوئی:-

"میں نہیں جانتی، نہ جانے کس نے دستک دی۔ اور وہ باہر چلے گئے۔"

منذر نے حواس درست کرتے ہوئے پوچھا:-

"ربیع چلا گیا باہر؟"

وہ بولی:-

"جی ہاں ــــــ اور اب تک نہیں آئے۔"

منذر:- "کیا وہ دشمن تھا؟ جاسوس تھا؟"

لیلے:- "معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جائیے اور دیکھئے کیا ہو رہا ہے؟ اب تک کیوں نہیں آئے؟ مجھے تو وہم ہو رہا ہے۔"

بیچارہ منذر بھی گھبرا گیا۔ اور بھاگوں بھاگ باہر پہنچا۔ تو وہاں ربیع کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

یہ شہر نیا تھا، محلہ نیا تھا، لوگ نئے تھے، اور وہ ایک اشتہاری مجرم کی طرح وقت کے سب سے زیادہ ظالم شخص کے پنجہ سے گلوخلاصی حاصل کر کے یہاں پہنچا تھا۔ خود ڈرتا تھا کہیں دھر نہ لیا جاؤں۔ کہیں ابن زیاد کا کوئی آدمی نہ پکڑ لے۔

لیکن ربیع سے جو اُنس اور تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ وہ مجبور کرتا تھا۔ کہ اپنی زندگی خطرہ میں ڈال کر بھی اسے تلاش کرے، چنانچہ جب سراسیمگی اور پریشانی کے "" میں ایک گلی سے دوسری گلی میں بھاگنا اور گھومنا شروع کیا۔

آخر جب تلاش کرتے کرتے تھک گیا۔ تو مجبوراً گھر واپس آیا۔ لیلے دروازے میں کھڑی تھی۔ باپ کو دیکھتے ہی ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اسے اکیلا آتا دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں۔ گلوگیر آواز میں پوچھا:۔

"بابا! آپ تو اکیلے واپس آ گئے۔ کیا وہ نہیں ملے؟"

منذر نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا:۔

"بیٹی! محلہ کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ایک ایک چپہ ڈھونڈھ ڈالا اگر کوئی سوئی گری ہوتی تو وہ بھی مل جاتی۔ لیکن ربیع نہیں ملا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا؟"

لیلے نے رہنمائی کرتے ہوئے کہا:۔

"ضرور وہ اسی آدمی کے ساتھ گئے ہیں؟"

منذر نے جواب دیا:۔

"لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا۔ وہ آدمی کون تھا؟ اور ربیع اس کے ساتھ کیوں چلا گیا؟ میرے لئے یہ شہر نیا ہے، یہاں کے لوگ نئے ہیں۔ نہ کسی سے واقفیت نہ شناسائی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے پوچھوں؟"

لیلے نے کوئی جواب نہ دیا۔ رونے لگی۔

منذر تڑپ اٹھا۔ اس نے کہا:۔

"بیٹی پریشان کیوں ہوتی ہے؟ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو سارے محلے میں چرچا ہوتا!"

یکایک ربیع مسکراتا ہوا آ گیا۔ اسے دیکھ کر منذر کی جان میں جان آئی۔ لیلے کے ہونٹوں پر دل نواز تبسم کھیلنے لگا۔ منذر کے چہرے پر مسرت کا نور جگمگانے لگا۔ دونوں خوش تھے بہت زیادہ خوش۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں کو الگ الگ دولتِ کونین مل گئی ہے —!

منذر نے ایک شفیق بزرگ کی طرح خفا ہوتے ہوئے کہا:۔

"کہاں چلے گئے تھے تم ربیع —؟"

وہ بولا ـــــ "ایک بہت ضروری کام تھا، کیوں کوئی خاص بات تھی؟"

منذر :۔ "یہاں جان پر بن گئی اور تم پوچھتے ہو۔ کوئی خاص بات تھی۔

ربیع :۔ "لیکن کیوں جان پر بن گئی؟ کیا ہوا تھا؟"

منذر :۔ "میں کیا جانوں؟ لیلے گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی۔ اور کہنے لگی۔ کوئی آدمی ربیع کو بلا کر لے گیا ہے۔ اب تک نہیں آئے۔ کہیں وہ کوئی دشمن نہ ہو۔ جائیے دیکھئے باہر گیا تم ندارد۔ گلیوں، کوچوں اور چوراہے پر دیکھا تو کہیں نام و نشان ہی نہیں۔ اب تو میں گھبرا گیا۔ کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ ـــــ بہر حال خدا کا شکر ہے تم آگئے۔!"

ربیع نے محبت بھری نظروں سے لیلے کی طرف دیکھا اور کہا :۔

"خطرہ کی کوئی بات نہ تھی۔ یہ محلہ ہمارا قلعہ ہے۔ یہاں کوئی غیر قدم نہیں رکھ سکتا۔"

منذر :۔ یہ تو صحیح ہے بیٹا! لیکن یوں یک بیک نہ غائب ہو جایا کرو۔ لیلے تو پھر لڑکی ہے مجھے دیکھو۔ بوڑھا ہو گیا ہوں، تجربہ کار ہوں۔ جہاندیدہ ہوں لیکن گھبرا گیا۔"

ربیع :۔ "یہ آپ لوگوں کی محبت اور شفقت ہے!"

منذر :۔ "لیکن بات کیا تھی؟ کون شخص تھا وہ جس نے دستک دی تھی؟"

ربیع :۔ "وہ حضرت امام حسینؑ کا خادمِ خاص سلیمان تھا۔ جو ایک بہت ضروری کام سے آیا تھا۔!"

منذر :۔ "حضرت حسینؑ کا خادمِ خاص؟ ـــــ کیا حضرت امام تشریف لا چکے ہیں؟"

ربیع :۔ ابھی نہیں ـــــ لیکن بہت جلد آنے والے ہیں۔ ان کی طرف سے حالات کا جائزہ لینے کے لئے حضرت مسلم بن عقیلؓ تشریف لے آئے ہیں۔ اور کئی ہزار آدمیوں سے اطاعت کی بیعت لے چکے ہیں۔"

منذر :۔ "اور میں ان کی خدمت میں جانے کے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہوں کب لے چلو گے مجھے ان کے پاس؟"

ربیع :۔ "بصرہ سے واپس آکر۔"

منذر :۔ "بصرہ سے واپس آکر؟ کیا تم بصرہ جا رہے ہو؟"

ربیع :- "جی ہاں ــــ ابھی اور اسی وقت۔ ایک بہت ضروری اور بے حد اہم کام ہے"

لیلےٰ :- "یہ بھی تو معلوم ہو۔ وہ بہت ضروری اور بے حد اہم کام کیا ہے؟"

ربیع :- "حضرتؑ نے ایک مکتوب میرے پاس بھیجا ہے۔ جو بصرہ کے عمائد کے نام لکھا گیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے۔ کہ خط لے کر ان کے پاس جاؤں۔ کیونکہ میں ان سے ذاتی واقفیت بھی رکھتا ہوں ــــ بصرہ بھی اگر ہمارے ساتھ ہو جائے تو سارے کام بڑی آسانی اور کامیابی سے انجام پا سکتے ہیں۔ اور مجھے امید ہے وہ ہمارا ساتھ دے گا۔ اسلئے کہ حق ہمارے ساتھ ہے اور ہم صرف امرِ حق میں اہل بصرہ کی امداد و اعانت اور رفاقت و تعاون کے طلب گار ہیں (منذر سے مخاطب ہو کر)

آپ تشریف رکھیں گھر میں، ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہر چیز بافراط موجود ہے۔۔ انشاء اللہ کسی طرح کی تکلیف اور زحمت نہیں ہو گی۔"

باب ۵۲

وقتِ رخصت

منذر کے جاتے ہی لیلےٰ بھی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ ربیع پیچھے پیچھے گیا۔ اور اسے مخاطب کر کے کہا:۔

"لیلےٰ! کیا تم بھی مجھے بصرہ جانے کی اجازت دیتی ہو؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی:۔

"جی تو نہیں چاہتا کہ جاؤ۔ لیکن کام ایسا ہے کہ خوشی سے اجازت دیتی ہوں!"

ربیع:۔ "لیلیٰ تمہارے ان الفاظ نے میری ہمت بلند کر دی ہے۔ میرے ارادوں میں اور زیادہ ثبات و استحکام پیدا کر دیا ہے۔ مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی"

لیلےٰ:۔ "لیکن کوشش کرنا کہ جلد آؤ۔ وہیں بیٹھ نہ رہنا"

ربیع:۔ (ہنس کر) "کیا بات کی ہے۔ بھلا ایک لمحہ بھی بیکار ضائع کر سکتا ہوں؟ کام ختم کرتے ہی انشاء اللہ ہوا کے گھوڑے پر آؤں گا"

لیلےٰ مسکرانے لگی۔ پھر اس نے پوچھا:۔

"کیا واقعی اسی وقت جانے کا ارادہ ہے؟"

ربیع نے جواب دیا:۔

"ہاں، سلیمان کو مسجد میں بٹھا کر آیا ہوں۔ اس وقت ٹھنڈے ٹھنڈے روانہ ہو جانا چاہیئے"

لیلےٰ:۔ "لیکن کھانا تو کھا لو"

ربیع:۔ (مسکرا کر) "کھانا تو ابھی تھوڑی دیر ہوئی کھا چکا ہوں"

لیلےٰ :۔ "تو میں کچھ ناشتہ کے طور پر ساتھ کئے دیتی ہوں۔"

ربیع :۔ "اس نوازش کا شکر گزار ہوں۔ لیکن اب وقت نہیں ہے جانے دو دیر ہو جائے گی۔"

لیلےٰ :۔ "اچھا تو جاؤ ——— لیکن ابھی آئی۔"

یہ کہہ کر وہ منذر کے کمرہ میں چلی گئی۔ ربیع اپنے کمرے میں چلا آیا اور سامانِ سفر درست کرنے لگا۔ اتنے میں لیلےٰ واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں تھیلی تھی۔ اس نے ربیع کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:۔

"اس میں کچھ جو کے ستو ہیں، کچھ کھجوریں ہیں!"

ربیع نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"لیلےٰ! تم کتنا خیال کرتی ہو میرا، کیا میں اس قابل ہوں؟"

لیلےٰ :۔ (زیرِ لب تبسم کے ساتھ) "میں نہیں جانتی۔"

ربیع :۔ "تم ان لوگوں میں سے ہو۔ جو زبان سے نہیں کہتے کر کے دکھاتے ہیں۔ تم نے میرے سفر کے لئے زادِ راہ کا انتظام کر دیا۔ دوڑی دوڑی گئیں اور جو کچھ ملا لے آئیں۔ جی چاہتا ہے اس تھیلی کو آنکھوں سے لگا لوں۔"

لیلےٰ :۔ "کہیں ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ ستو کے ذرّے اگر آنکھوں میں گھس گئے تو آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔"

ربیع :۔ "تمہارے لئے جان ہتھیلی پر لئے گھوم رہا ہوں۔ اور تم مجھے آنکھوں کا ڈراوا دیتی ہو۔"

لیلےٰ :۔ "ذرا سوچ سمجھ کر بات کیا کیجئے۔"

ربیع :۔ "کیوں! کوئی غلطی ہوئی اس خاکسار سے؟"

لیلےٰ :۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ کہنا ہے۔ سب اسی وقت نہ کہہ ڈالئے۔ کچھ دوسرے وقت کے لئے بھی رکھیئے ——— آخر واپس آنے کے بعد بھی تو باتیں کریں گے!"

ربیع :۔ "سمجھ گیا۔ تم مجھے بنا رہی ہو۔ اچھا یہی سہی۔ ہم اس قابل نہیں۔ واقعی سچ ہے محبت

کر کے آدمی اپنی وقعت کھو دیتا ہے۔"

لیلےٰ:۔ (ایک تاثر کے ساتھ) "یہ نہ سمجھئے اگر آپ نے میری باتوں کا یہ مطلب سمجھا ہے تو بہت غلط سمجھا ہے۔"

یہ کہتے کہتے لیلےٰ پر سنجیدگی کی کیفیت طاری ہو گئی ۔ ربیع نے کہا:۔

"تم تو خفا ہو گئیں لیلےٰ! میں نے تو یونہی ہنسی میں کہا تھا۔ جانتا ہوں، تمہاری نظر میں میری کتنی وقعت ہے۔ تمہارے دل میں میری کتنی جگہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی تو بات ہے کہ ایک شخص دستک کی آواز سن کر اپنے گھر سے باہر گیا اور پھر دیر تک واپس نہ آیا۔ تو ایک لڑکی جو اس کی محبت کو قبول کر چکی تھی، بے تاب ہو گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس کی بڑی بڑی کنول کی سی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ اپنے بوڑھے باپ کے پاس پہنچی۔ اور رسمِ حیا کو بالائے طاق رکھ کر استدعا کی کہ اس کے محبوب کو تلاش کرائے وہ ناکام لوٹا۔ تو پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں ـــــ بتاؤں وہ شخص کون تھا اور وہ لڑکی کون تھی۔!"

لیلےٰ کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا:۔

"معاف کیجئے۔ دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ جھوٹے ہیں اول درجہ کے!"

ربیع:۔ "جھوٹے ہیں اول درجہ کے ـــــ اس کا کیا مطلب؟"

لیلےٰ:۔ "بے وقوف بناتے ہیں ایک دوسرے کو ـــــ وہ لڑکی جانتی نہیں محبت کسے کہتے ہیں؟ کیا چیز ہوتی ہے محبت، اور اسی طرح وہ شخص گو لوگوں سے محبت کا نام سنتے سنتے یہ لفظ تو استعمال کرنے لگا ہے۔ لیکن اس کے مفہوم و معنی سے ناواقف ہے۔!"

ربیع:۔ "خوب، بہت خوب، کیا بات فرمائی ہے آپ نے۔"

لیلےٰ:۔ "تو غلط ہے یہ بات؟"

ربیع:۔ "نہیں جناب! بھلا جو بات آپ فرمائیں۔ وہ غلط ہو سکتی ہے؟ لیکن اگر اجازت ہو تو ایک سوال کروں؟"

لیلےٰ :۔ ڈاکرڈکر" اجازت ہے سائل! تم سوال کر سکتے ہو۔"

ربیع :۔" پھر اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے تھے؟"

لیلےٰ :۔" تنکا پڑ گیا ہوگا آنکھ میں!"

ربیع :۔" اور آواز کیوں بھرّا گئی تھی؟"

لیلےٰ :۔" زکام ہو گیا ہوگا۔"

ربیع :۔" اور اس نے اپنے باپ کو اس کی تلاش میں کیوں بھیجا تھا؟"

لیلےٰ :۔" کہانی سننے کو جی چاہ رہا ہوگا اس کا!"

ربیع :۔" اور پھر وہ اس کے لئے جلدی سے زادِ سفر کیوں فراہم کرلائی؟ ستو، کھجور!"

لیلےٰ :۔" ممکن ہے کھجوریں اتنی پرانی ہوں کہ سڑ چکی ہوں۔ اور ستو بھی اتنا پرانا ہو کہ اس میں بھبک آنے لگی ہو، کھانے والے کو چاہیئے کہ کھانے سے پہلے تحقیق کرلے۔"

ربیع :۔" اور اب وہ اس کے پاس اپنے سارے کام چھوڑ کر کیوں کھڑی ہے؟"

لیلےٰ :۔" تاکہ وہ جلدی سے چلا جائے۔ پھر وہ دروازے بند کر کے آرام کی نیند سوئے۔"

ربیع :۔" اور اگر وہ نہ جائے؟"

لیلےٰ :۔" نہیں وہ جائے گا۔ ضرور جائے گا۔"

ربیع :۔" یہ کیسے جانا تم نے؟ کیا تم اسے بات کا دھنی اور قول کا پکا سمجھتی ہو؟"

لیلےٰ :۔" میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔ لیکن سنا ہے۔ کہ وہ ایسا ہی ہے۔"

ربیع :۔" تو ایسے شخص سے بھی محبت نہیں کی جا سکتی؟ ایسا آدمی بھی نہیں چاہا جا سکتا!"

لیلےٰ :۔" اس کا جواب فرصت میں دیا جائے گا ——— ! سائل! تم نے ایک کے بجائے بہت سے سوالات کر ڈالے۔ اب اپنی زبان بند کر دو ——— ورنہ ———!"

ربیع :۔" ورنہ کیا ہوگا؟"

لیلےٰ ؛۔ "اگر تم نے اپنی زبان بند نہ کی۔ تو اسی کمرہ میں بند کر دیئے جاؤ گے۔ پھر لاکھ چیخو۔ چلاؤ۔ فریاد کرو ـــــ لیکن دروازہ نہیں کھلے گا ـــــ اچھا ہم جاتے ہیں۔ السلام علیکم !"

یہ کہہ کر لیلےٰ واپس جانے کے لئے مڑی۔ ربیع نے پُرسوز انداز میں کہا :۔

"جاؤ لیلےٰ ! میں بھی جاتا ہوں۔ لیکن راستہ بھر بہت یاد آؤ گی۔ نہ جانے کیا بات ہے ؟ تم سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ محبت آج سے نہیں ، بہت دنوں سے کر رہا ہوں۔ لیکن یہ کیفیت تو کبھی نہ تھی۔ کبھی کبھی محسوس کرتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو تم میری زنجیر پا بن جاؤ "

لیلےٰ بڑے غور سے ربیع کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اثر انگیز لہجہ میں جواب دیا :۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیلےٰ اپنے آپ سے واقف ہے۔ اور اپنے ربیع سے بھی جس روز اس نے یہ محسوس کیا کہ زنجیر پا بن رہی ہے۔ اسی روز اپنے ہاتھ سے گلا گھونٹ لے گی۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے گی۔ بیشک وہ محبت کا جواب محبت سے دے چکی ہے۔ اور یہ محبت اب اس کا دین و ایمان بن چکی ہے۔ لیکن ان چیزوں سے بالا بھی ایک چیز ہے۔ وہ ہے حق ـــــ حق پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حق کسی چیز پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک حق و باطل کی کش مکش جاری ہے ـــ اُس وقت تک لیلےٰ اور ربیع ایک ندی کے دو کنارے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ـــــ لیکن ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ دور رہنے پر مجبور ہیں "

ربیع نے پُرنم لیکن سراپا محبت آنکھوں سے لیلےٰ کی طرف دیکھا۔ اور سامانِ سفر سنبھالتے ہوئے کہا:۔

" لیلیٰ تم نے وہ جذبہ پھر میرے دل میں تازہ کر دیا۔ جس کے بارے میں مجھے شبہ آنے لگا تھا کہ کمزور پڑ رہا ہے ـــــ اچھا خدا حافظ !

باب ۵۳

یزید بن مسعود

لیلٰے سے رخصت ہو کر ربیع مسجد میں پہنچا۔ سلیمان منتظر بیٹھا تھا اسے لے کر وہ بصرہ روانہ ہو گیا:-

بصرہ پہنچنے کے بعد خود تو حضرت امام حسینؑ کا خط لے کر یزید بن مسعود نخشلی کے پاس پہنچا اور سلیمان کو منذر بن جارود کے پاس بھیج دیا۔

ربیع، یزید بن مسعود کے پاس پہنچا۔ وہ قبائل بنو تمیم، بنو حنظلہ اور بنو سعد پر غیر معمولی اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ خود بھی بہادر اور شجاع انسان تھا۔ محبِ اہل بیت رسولؐ تھا۔ حضرت امام کا خط پڑھ کر آنکھوں سے لگایا۔ سر پر رکھا۔ اور اس کے بعد قبائل کے اربابِ بست و کشا کو گھر پر مدعو کیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے۔ تو اس نے کہا:-

"اے بنو تمیم! میرا رتبہ اور میرا حسب و نسب تمہارے نزدیک کیسا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:-

"اے سردار! اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے — ؟ ہر شخص جانتا ہے کہ شرافت و بزرگی اور حسب و نسب میں کوئی شخص آپ کا ہم پلہ اور ہم رتبہ نہیں ہے۔"

یہ سن کر یزید بن مسعود نے پھر کہا:-

"میں نے تمہیں یہاں اس لئے جمع کیا ہے کہ چند اہم امور میں صلاح و مشورہ کروں اور تمہاری امداد و اعانت کا طلبگار ہوں۔"

ان لوگوں نے جواب میں کہا:-

"بسر و چشم — آپ فرمایئے۔ ہم ہر بات قبول کریں گے۔ اور ہر رائے تسلیم

اس نے یہ کہا اور تیزی سے باہر نکل کر چلا گیا۔

اور لیلیٰ اس وقت تک دیکھتی رہی۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا۔ وہ خوش بھی تھی اور مغموم بھی۔ اس کی آنکھوں سے جو آنسو ٹپک رہے تھے نہ جانے وہ خوشی کے تھے یا غم کے؟

کریں گے۔"

یزید بن مسعود نے ایک پُر اثر خطبہ دیا۔ حمد و ثنا کے بعد کہا:۔

مسلمانو۔!

معاویہ نے وفات پائی۔ ان کے مرنے سے جور و گناہ کا دروازہ ٹوٹ گیا۔ اور ظلم کے ستون دھڑام سے زمین پر آرہے۔ معاویہ کا خیال تھا کہ انہوں نے اپنی سلطنت کو خوب مضبوط بنالیا ہے۔ لیکن یہ خیال محض واہمہ ثابت ہوا۔ معاویہ کے انتقال کے بعد اب جو شخص تختِ خلافت پر قابض ہے۔ وہ شرابی اور فاسق و فاجر ہے۔ وہ خلافت کا دعوےٰ کر رہا ہے۔ اور مسلمانوں پر ان کی مرضی کے خلاف اپنا حکم نافذ کرنا چاہتا ہے۔ نہ اس میں علم اور بردباری کا مادہ ہے۔ نہ وہ علم کے زیور سے مزیّن ہے۔ میں خدا ئے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس شخص سے جہاد کرنا مشرکین کے ساتھ جہاد کرنے سے افضل ہے۔

مسلمانو۔۔۔!

دیکھو یہ حسینؓ ابن علیؓ امیر المومنین کا خط ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں۔ ان سے زیادہ معزز روئے زمین پر اور کوئی شخص نہیں ملے گا ان کے فضل اور علم کا ذکر کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ شرافت۔ بزرگی، علم اسلام کی راہ میں ایثار اور قربانی کرنے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت قریبہ کے باعث خلافت کے مستحق صرف اور صرف حضرت امام حسینؓ ہی ہیں۔ جو چھوٹوں سے محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور بڑوں سے عزت اور تکریم کے ساتھ۔۔۔!

مسلمانو!

وقت آگیا ہے کہ تم خدائے تعالےٰ کے نور سے بڑھ بڑھ کر حصّہ لو۔ اور باطل کی گمراہیوں میں پڑ کر اپنے آپ کو ہلاک اور برباد نہ کرو۔ جنگِ جمل کے موقع پر صخر بن قیس نے تم لوگوں کے ساتھ جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔۔۔ اَب

خدائے تعالےٰ نے تمہیں ایک اور موقع دیا ہے ۔ دل وجان سے ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے لئے نکل کھڑے ہو۔ اور اس طرح رسوائی کا داغ اپنے دامن سے دھو ڈالو ۔ خدا کی قسم ! جو شخص حضرت امام کی مدد سے کنارہ کشی اختیار کرے گا ۔ خدا اس کی آل اولاد کو ذلت اور رسوائی میں ڈال دے گا ۔ اور اس کے خاندان پر تباہی نازل کرے گا !

دیکھو ! لوگو دیکھو !

"میں جنگ کے لیے بالکل تیار ہوں ۔ اب بھی جو شخص باہر نہ نکلے گا ۔ یاد رکھے کہ وہ اپنے تئیں کسی طرح بھی قتل اور ہلاکت و بربادی سے نہیں بچا سکے گا ۔"

یزید بن مسعود کی یہ دل ہلا دینے والی تقریر لوگوں نے کامل استغراق اور انہماک کے ساتھ سنی ۔ اس کے بعد بنو حنظلہ جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے ۔ انہوں نے کہا :۔

" اے ابو خالد !

ہم تیرے ترکش کے تیر اور تیرے قبیلے کے گھوڑے ہیں ۔ اگر تو ہمیں دشمنوں پر چلائے گا تو نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھے گا ۔ اور اگر تو ہمارے ذریعے جہاد کرے گا تو فتح پائے گا ۔ تو جس جگہ جائے گا ، ہم تیرے ساتھ جائیں گے ۔ تو جس جنگ میں حصہ لے گا ۔ اس میں ہم تیرے دوش بدوش لڑیں گے ۔ ہم اپنی تلواروں کے ساتھ تیری مدد کریں گے اور اپنی جانوں پر کھیل کر تجھے ہر گزند اور حملہ سے بچائیں گے ـــــ ہم حاضر ہیں تو جہاں چاہے ، ہمیں لے جا !"

بنو حنظلہ کے بعد بنو سعد بن زید کھڑے ہوئے ۔ انہوں نے جوابی تقریر کرتے ہوئے کہا :۔

" اے ابو خالد !

تیری رائے کے خلاف کوئی رائے قائم کرنے اور تیری مخالفت کرنے سے زیادہ بدترین اور ناگوار بات ہمارے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ تاہم، ہم کچھ مہلت چاہتے ہیں تاکہ اس امرِ اہم میں کچھ صلاح و مشورہ باہمی طور پر کرلیں۔"

اب بنو عامر بن بنو تمیم کی باری تھی۔ وہ اٹھے۔ اور انہوں نے یزید بن مسعود کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا :-

" اے ابو خالد!

ہم تیرے مددگار، حلیف اور دوست ہیں۔ ہم کسی قیمت پر بھی تیری ناراضگی اور برہمی اور غیظ و غضب کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تو ہمیں آواز دے۔ ہم لبیک کہتے تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ تو ہمیں حکم دے۔ ہم دل و جان سے تیری اطاعت کریں گے۔!"

ان حوصلہ افزا جوابات نے یزید بن مسعود، سلیمان اور ربیع کو پورے طور پر مطمئن کر دیا۔ ان لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد یزید بن مسعود نے ربیع سے کہا :-

" میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اور میرا خیال ہے کہ ٹھیک طرح سے ادا کیا!

ربیع نے جواب دیا :-

ان قبائل کے ارباب کارنے آپ کی دعوت پر لبیک کہا۔ انہوں نے باطل سے رشتہ توڑنے اور حق سے رشتہ جوڑنے پر آمادگی ظاہر کی۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ بات کے کھرے اور قول کے سچے ہیں۔ جو کچھ زبان پر ہے وہی دل میں ہے اور جو کچھ دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ ان کے الفاظ پُرزور تھے۔ ان کا لب و لہجہ پُرجوش تھا۔ ان کے عزم میں چٹان کی سختی، فولاد و آہن کی پختگی، اور پہاڑ کی استقامت تھی۔ یقیناً یہ لوگ ہمارا ساتھ دیں گے اور ہر حالت میں ہماری رفاقت کریں گے۔"

سلیمان :- میرا جہاں تک تعلق ہے۔ پورے طور پر مطمئن ہوں۔ اور حضرت امام کو بھی

اطمینان دلاؤں گا۔ کہ بصرہ کے لوگ زندگی کے آخری سانس تک آپ کے ساتھ رہیں گے۔ وہ اس غیر اسلامی حکومت سے تنگ آچکے ہیں اور تہیہ کر چکے ہیں کہ اس کا تختہ الٹ دیں۔ تاکہ حق کا بول بالا ہو۔ قرآن کی حکومت ہو ___ اور اسلام کا سکہ چلے ___!"

ربیع :۔" بالکل صحیح خیال ہے ___! (یزید بن مسعود سے مخاطب ہوکر) ہم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے اب اجازت مرحمت ہو کہ ہم اپنے مستقر پر واپس جائیں:"

یزید بن مسعود :۔" اس قدر جلد؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کو چند روز ٹھہرنا پڑے گا۔ آپ ہمارے مہمان عزیز ہیں۔ اس قدر جلد واپس نہیں جا سکتے۔"

ربیع :۔ آپ کا اخلاق کریمانہ دیکھ کر جی تو ہمارا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن وقت کا تقاضا کچھ اور ہے۔

یزید بن مسعود :۔ (مسکرا کر) "بجا فرمایا! لیکن دو ایک دن میں کوئی ایسا حرج تو نہیں ہو جائے گا۔"

سلیمان :۔" یہ بھی غور فرمایئے دور دراز راستہ طے کرنا ہے۔ یہاں سے کوفہ جاؤں گا۔ وہاں مسلم بن عقیل پہنچ چکے ہیں۔ ان کی کارگزاریوں کا جائزہ، اور ان کا پیام لیتا ہوا مکہ معظمہ جاؤں گا۔ تاکہ حضرت امام جلد از جلد تشریف لائیں۔ اور حق و باطل کے مابین جو آویزش شروع ہو چکی ہے۔ کامیابی اور کامرانی کے ساتھ انجام کو پہنچے۔ انشاءاللہ اگر زندگی ہے تو پھر حاضر ہوں گے اور آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کریں گے۔"

باب۵

پہلا شہید

سلیمان، ربیع کے ساتھ یزید بن مسعود کے ہاں نہیں ٹھہرا۔ وہ منذر بن جارود کا مہمان تھا۔ اس نے بہت زیادہ جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا۔ شاندار طور پر پذیرائی کی۔ پُرخلوص اور محبت بھرے انداز میں اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ حضرت امام کا خط پڑھ کر وہ گویا ہوا:۔

"اگرچہ ابن زیاد مجھے بیٹے کی طرح عزیز ہے۔ کیونکہ وہ میری بیٹی کا شوہر ہے لیکن اس کے طور طریقے مجھے سخت ناپسند ہیں۔ وہ دنیا کما رہا ہے اور آخرت لٹا رہا ہے۔ اس نے درہم و دینار کی پرستش شروع کر دی ہے اور حق و صداقت سے رشتہ توڑ لیا ہے۔ تم جس بزرگ شخصیت کا پیام لے کر میرے پاس آئے ہو۔ اس کے ایک اشارہ پر اپنی ہزار جانیں قربان کر سکتا ہوں اور ہاں میاں سلیمان! ذرا یہ تو بتاؤ۔ مکہ کے حالات کیا ہیں؟ وہاں کے لوگ حضرت امام کو دھوکہ تو نہیں دیں گے؟

سلیمان نے کہا:۔

"مکہ اور مدینہ کے لوگ امام والا مقام کے فداکاروں اور جاں نثاروں میں ہیں۔ مکہ وہ مقام ہے جہاں کے باشندوں نے کفار قریش کی زیادتیوں اور سفاکیوں کے مقابلہ میں بھی اپنے ایمان پر آنچ نہ آنے دی۔ اور مدینہ وہ مقام ہے۔ جس نے مکہ کے مہاجروں یعنی اسلام کے پرستاروں کے لئے اپنا آغوش کوذکر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام اب بھی اپنی صحیح حالت میں اگر کہیں ہے تو شام و عراق اور بصرہ و کوفہ میں نہیں۔ صرف حجاز مقدس میں ہے۔"

منذر بن جارود :۔ "بے شک، بے شک، میرے عزیز بیشک"
سلیمان :۔ "لہٰذا وہ لوگ دھوکہ نہیں دے سکتے۔ پیمان شکنی نہیں کر سکتے!"
منذر بن جارود :۔ "بالکل درست، بالکل صحیح۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی"
سلیمان :۔ "البتہ سوال جو کچھ ہے وہ کوفہ اور بصرہ کا ہے"
منذر بن جارود :۔ "بصرہ کی طرف سے تو اطمینان رکھو۔ یہاں تمہیں کوئی زحمت اپنی دعوت کو پھیلانے میں نہ ہوگی۔ البتہ کوفہ کے بارے میں مجھے شبہ ہے"
سلیمان :۔ "یہ کیوں جناب؟"
منذر بن جارود :۔ "کوفہ کے لوگ ہمیشہ سے ڈھلمل یقین ہیں۔ کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ بلکہ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں ـــــــ تمہیں معلوم نہیں۔ یہ لوگ حضرت علیؑ کے کتنے پرجوش ساتھی تھے؟"
سلیمان :۔ "جی ہاں تھے، جانتا ہوں"
منذر بن جارود :۔ "لیکن پھر ان کا ساتھ دینے میں سستی کرنے لگے"
سلیمان :۔ "یہ بھی معلوم ہے!"
منذر بن جارود :۔ پھر یہی لوگ ہیں جنہوں نے حضرت امام حسنؑ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ لیکن دغا دی"
سلیمان :۔ "بے شک ـــــــ کون نہیں جانتا ان واقعات کو"
منذر بن جارود :۔ "لہٰذا بُرا نہ مانو تو کہوں۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ لوگ آخر وقت تک ساتھ دے سکیں گے"
سلیمان :۔ "شبہ تو مجھے بھی تھا۔ لیکن اب نہیں ہے"
منذر بن جارود :۔ "کوئی خاص سبب ہے اس اطمینان کا؟"
سلیمان :۔ "جی ہاں ـــــــ وہاں حضرت مسلم بن عقیل پہنچ چکے ہیں"
منذر بن جارود :۔ (تعجب سے) ایں، مسلم بن عقیل پہنچ گئے ہیں وہاں کب ـــــــ؟"

سلیمان :۔ "کافی عرصہ ہوگیا۔"

منذر بن جارود :۔ "اور تعجب ہے۔ نعمان بن بشیر حاکم کوفہ نے انہیں گرفتار نہیں کیا ——
لیکن ٹھیک ہے۔ جانتا ہوں۔ وہ بھی میری طرح محب اہل بیت ہے۔ وُہ۔
کوئی گستاخی اور بے ادبی نہیں کر سکتا۔"

سلیمان :۔ جی ہاں، گو وہ اموی حاکم ہے۔ اور اپنی حکومت کا خیر خواہ اور وفادار بھی ہے
لیکن اس کے محب اہل بیت ہونے میں شبہ نہیں۔"

منذر بن جارود :۔ "ٹھیک ہے پھر کام بن جائے گا —— اب میں مطمئن ہوں۔
خطرہ جو کچھ تھا۔ وہ اسی کی طرف سے تھا۔ عوام کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو
پورا ساتھ دیں گے —— دعوت اب کس مرحلہ تک پہنچ چکی ہے ؟"

سلیمان :۔ "کامیابی کا مرحلہ اب بہت قریب ہے۔ کئی ہزار آدمی مسلم بن عقیل کے
ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ مکہ میں حضرت امام حسینؓ کے پاس خطوں کا تار لگا
ہوا ہے۔ وفود آرہے ہیں۔ پیام آرہے ہیں۔ طلبی کے تقاضے ہو رہے ہیں
—— اسی لئے حضرت امامؓ نے پہلے مسلم بن عقیل کو بھیجا ہے اب کچھ عرصہ کے
بعد وہ بھی تشریف لے آئیں گے۔"

منذر بن جارود :۔ "کب تشریف لے آئیں گے وہ ؟"

سلیمان :۔ "بس البصرہ اور کوفہ کے ردّعمل کا انتظار تھا۔"

منذر بن جارود :۔ "وہ تو معلوم ہو ہی گیا۔ میرا نام بھی ان لوگوں میں لکھ لو، جو سب سے
پہلے امام والا مقام پر قربان ہوں گے۔ لیکن ایک شخص کا انتظار ہے وہ آلے تو
اپنے رفقاء کے بارے میں واضح طور پر بتا سکوں گا کہ کتنے ہیں، اور کس حد تک
جا سکتے ہیں ؟ لہٰذا تم کو چند روز انتظار کرنا پڑے گا۔"

اس گفتگو کے بعد سلیمان ربیع کے پاس پہنچا اور ربیع سے مشورہ کیا۔ ربیع
کی رائے یہ ہوئی۔ میں تو کوفہ واپس جاتا ہوں۔ یزید بن مسعود کا خط حضرت مسلم کے
حوالے کروں گا۔ وہ اسے مکہ روانہ کر دیں گے۔ تم یہاں ٹھہرو اور منذر بن جارود کا

جواب باصواب لے کر روانہ ہوتا۔

یہ بات طے پاگئی۔ ربیع اپنا سامانِ سفر درست کرنے لگا۔ اور سلیمان، منذر بن جارود کے ہاں جو اس کی قیام گاہ تھی، چلا آیا۔ لیکن منذر کا طرزِ عمل بدلا ہوا تھا۔ نہ وہ تپاک تھا، نہ گرم جوشی، نہ وہ اظہارِ اخلاص تھا، نہ فدا کاری اور جاں نثاری کے وعدے۔

سلیمان کو بڑی حیرت ہوئی۔ کہ یہ کیا ہوگیا؟

تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ کچھ سپاہی آرہے ہیں۔ وہ آئے اور سیدھے منذر کے پاس چلے گئے۔ منذر سے انہوں نے پوچھا:۔

"آپ کا مہمان اور حسین ابن علیؓ کا قاصد کہاں ہے؟"

منذر نے جواب دیا:۔

"میرا معزز مہمان میرے پاس یہاں موجود ہے ——— یہ دیکھو ——— سامنے جو خوش رُو نوجوان نظر آ رہا ہے۔ یہی سلیمان ہے۔ لیکن تمہیں اس سے کیا مطلب؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا:۔

"امیر ابن زیاد نے انہیں یاد فرمایا ہے۔"

منذر بن جارود:۔ (انجان بن کر) "کیا امیر ابن زیاد واپس آگئے شام سے ——— ؟ خیر کوئی بات نہیں۔ میاں سلیمان! سنتے ہو؟ ان سپاہیوں کے ساتھ چلے جاؤ ممکن ہے کوئی ضروری کام ہو۔"

سلیمان کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن اب سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ فریب کیا گیا ہے۔ اس نے منذر بن جارود سے کہا:۔

اس نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں ——— حق و صداقت پر قربان ہونے والوں کی جس فہرست میں اپنا نام پہلے مُہر پر لکھوایا تھا۔ اب اسے کاٹ دیجئے اور میرا نام وہاں لکھ دیجئے۔

منذر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سپاہی۔ سلیمان کو اپنے ساتھ لے کر ابن زیاد کے پاس پہنچے۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور نخوت بھرے انداز میں کہا:۔

"تو ہے سلیمان! حسینؓ ابن علیؓ کا قاصد؟"

سلیمان نے استقلال کے ساتھ جواب دیا۔

"ہاں میرا نام سلیمان ہے!"

ابن زیاد نے پوچھا:۔

"کیا تو اس لئے آیا ہے کہ فتنہ و فساد پھیلائے؟ امیرالمومنین یزید کے خلاف سازش کرے اور حسینؓ ابن علیؓ کی خلافت کا راستہ ہموار کرے؟"

سلیمان نے متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کہا:۔

"ہاں، اسی لئے آیا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ اور تجھے بھی دعوت دیتا ہوں کہ اس پیام پر کان دھر، اس دو روزہ زندگی اور اقتدار پر نہ اترا۔ یہ سوچ کہ مرنے کے بعد خدا کو کیا جواب دے گا؟"

ابن زیاد کے لئے زیادہ سننا ناممکن ہو گیا۔ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا:۔

"خاموش! تو بے ادب ہے، گستاخ ہے، باغی ہے، تو ایک باغی کا جاسوس اور مخبر ہے۔ تو یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکتا۔ تجھے مرنا پڑے گا۔ تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ تاکہ دوسرے سبق حاصل کریں۔"

سلیمان نے عزم و استقلال کے ساتھ جواب دیا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مرنا بہرحال ہے۔ خواہ آج خواہ کل۔ وہ موت بڑی اچھی ہے۔ جو خدا کی راہ میں آئے۔ اور وہ زندگی ناقابل صد ہزار ملامت ہے جو خدا کی نافرمانی اور معصیت میں بسر ہو۔ میں تیری بخشی ہوئی موت کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور تجھ سے تعزیت کرتا ہوں کہ تیرے حصہ میں بڑی خراب اور مکروہ زندگی آئی ——!"

ابنِ زیاد نے آواز دی :-

"جلاد ـــــ !"

فوراً جلاد حاضر ہوا ۔ اور اس نے ابن زیاد کا اشارہ پاتے ہی سلیمان کی گردن ایک ہی وار میں قلم کر دی !

باب ۵۵

رات کی تاریکی میں

جب ربیع، یزید بن مسعود کا خط لئے تیزی کے ساتھ کوفہ کی طرف بڑھ رہا تھا ٹھیک اسی وقت ابن زیاد مسجد جامع کے ممبر پر کھڑا مسلمانانِ بصرہ سے خطاب کر رہا تھا:-

"اے اہل بصرہ!

امیر المومنین یزید نے مجھے کوفہ کا بھی والی مقرر کیا ہے۔ اور میں اس وقت وہاں روانہ ہو رہا ہوں۔ اپنا قائم مقام اور جانشین میں نے اپنے بھائی عثمان بن زیاد کو مقرر کیا ہے۔"

خبردار!

عثمان کے احکام سے سرتابی نہ کرنا ــــــ دل و جان سے اس کی اطاعت کرنا۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوا کہ تم میں سے کسی نے اس کی نافرمانی کی ہے۔ تو نہ صرف یہ کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کے دوستوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ اور جس محلہ کا یہ واقعہ ہوگا۔ اس کے سردار کو بھی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے!"

ابن زیاد کی اس ہیبت انگیز اور لرزہ خیز تقریر نے اہل بصرہ پر دہشت اور سراسیمگی کی کیفیت طاری کر دی۔ اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ سہم کر اپنے اپنے گھروں

میں بیٹھ رہے ——— اپنی جان کسے نہیں پیاری ہوتی؛

وہی لوگ جو بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے۔ جو بغاوت اور شورش کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جو یزید کی حکومت کا تختہ الٹنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ اس طرح دبک کر بیٹھ گئے۔ جیسے صابن کا جھاگ یا پانی کا بلبلہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ وُہ ہیں جو باطل سے لڑنے اور حق پر کٹ مرنے اور جان دے دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

بصرہ کی تو یہ کیفیت تھی کہ سلیمان کے قتل اور ابن زیاد کی تقریر کے بعد ایک سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوفہ کا یہ حال تھا کہ مخالفانہ جوش وخروش بڑھتا جا رہا تھا۔ یزید کے خلاف تقریریں عام تھیں۔

ربیع نے یزید بن مسعود کا خط مسلم بن عقیل کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ خط اربابِ کار کی مجلس میں بآوازِ بلند پڑھا گیا۔ اس نے تحریر کیا تھا:-

"امامِ عالی مقام!

آپ کا خط ملا۔ جس امر کی طرف آپ نے مجھے دعوت دی ہے۔ میں اسے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ آپ کی اطاعت کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

خدائے بزرگ و برتر نے کبھی دنیا کو کسی نیک حاکم سے خالی نہیں رکھا موجودہ زمانہ میں آپ خدا کی طرف سے اس کی مخلوق پر حجت اور زمین پر اس کی امانت ہیں، بے تامّل یہاں تشریف لے آئیں۔ بنو تمیم کی گردنیں آپ کے سامنے جھکی ہوں گی۔ اور وہ اس پیاسے اونٹ سے بھی زیادہ آپ کی اطاعت کریں گے۔ جو پانچویں دن پیاس سے بے حال، گھاٹ پر پہنچا ہے۔ یقین فرمایئے بنو تمیم کی طرح بنو سعد بھی دل وجان سے آپ کی مدد کریں گے!"

یہ خط باآواز بلند پڑھا گیا۔ اور اس نے حاضرین پر مسرت اور شادمانی کی کیفیت طاری کر دی۔ کوفہ کے لوگ اگرچہ اپنی طرف سے اس مہم کو سر کرنے کے لئے دل وجان سے تیار تھے۔ لیکن بصرہ کے فیصلے کا انہیں بھی انتظار تھا۔ کوفہ اور بصرہ کی حیثیت دو توام بھائیوں کی طرح تھی۔ کوئی معاملہ بھی ہو۔ ایک دوسرے پر اثر پڑنا لازمی تھا۔

حضرت مسلم کے پاس سے رخصت ہو کر ربیع اپنے گھر روانہ ہوا۔ تاکہ لیلیٰ سے مل کر آج ہی رات مکہ معظمہ روانہ ہو جائے۔

رات بھیگ چکی تھی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کی نیند سو رہے تھے۔ منذر بھی نماز سے فارغ ہو کر خوابِ خرگوش میں مصروف تھا۔ البتہ لیلیٰ جاگ رہی تھی۔

کیا صرف آج ہی ـــــ ؟

نہیں، جس روز سے ربیع نے رخصتِ سفر باندھا تھا۔ لیلے کی نیند اس سے روٹھ گئی تھی۔ ساری خلقت جب چین کی نیند سوتی تھی۔ وہ اختر شماری میں اپنا وقت صرف کرتی تھی ـــــ جاگتی رہتی۔ اور روتی رہتی تھی۔ اِسے ربیع کے بارے میں نہ جانے کیوں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہ بچھڑ نہ جائے؟ کہیں وہ چھین نہ جائے؟ کہیں ایسا نہ ہو، یہ ملاقات آخری ثابت ہو؟

یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔ لیکن نہ منذر نیند سے ہوشیار ہوا نہ لیلے کی محویت نے اس طرف متوجہ ہونے دیا۔

تیسری یا چوتھی دستک پر عالمِ استغراق سے چونکی۔ اور اٹھ کر دروازے تک گئی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا ـــــ لیکن وہ ایک عرب لڑکی تھی۔ دلیر اور بہادر۔ دروازے پر پہنچی۔ اور پوچھا کون ہے؟

جواب ملا:-

"دروازہ کھول دو۔ میں ہوں ربیع!"

لیلیٰ جنت میں پہنچ گئی۔ بے وہم وگمان ربیع آگیا۔ یہ بات تو اس کے حاشیۂ خیال میں بھی

نہ تھی۔

اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ربیع اندر آگیا۔ ربیع نے محویت اور ازخود رفتگی کے عالم میں لیلے سے کہا:۔

"لیلے! تم اچھی تو رہیں؟ تمہاری آواز میں کچھ نقاہت ہے۔ دُبلی بھی نظر آرہی ہو۔ کہیں بیمار تو نہیں ہوگئیں تھیں؟"

لیلے نے اپنے کمرہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا:۔

"اندھیرا تو اتنا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اور آپ نے مجھے دُبلا اور بیمار بھی دیکھ لیا —— اچھی ہوں —— اپنا حال کہیئے!"

اب ربیع لیلے کے کمرہ میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے لیلے کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور کہا:۔

"لیلیٰ میں غلط نہیں کہتا۔ واقعی تم دبلی اور کمزور نظر آرہی ہو، تمہارا رنگ زرد ہے، چہرہ اترا ہوا ہے، صورت سے پریشانی برس رہی ہے۔ آخر کیا بات ہے؟"

لیلے:۔ "کچھ نہیں۔ اتنے دنوں کے بعد آپ نے دیکھا ہے۔ اس لئے ایسی نظر آرہی ہوں!"

ربیع:۔ "واہ! یہ کیا بات ہوئی؟ مجھے بھی تم نے اتنے دنوں کے بعد دیکھا ہے۔ میں کب دبلا نظر آرہا ہوں —؟ نہیں لیلے ضرور کوئی بات ہے۔ مجھے بتاؤ ورنہ مجھے صدمہ ہوگا۔ میرا دل بہت نازک ہے۔"

لیلے:۔ (مسکراتے ہوئے) "آپ کا دل اور نازک؟ اور کمزور؟"

ربیع:۔ "ہاں! بہت زیادہ، نہ جانے کیا بات ہے؟ ایسا محسوس کرنے لگا ہوں، جیسے یہ دل میرا نہیں رہا۔ کسی اور کا ہوگیا ہے۔"

لیلے:۔ "یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ بتاؤ کیا کر آئے بصرہ میں؟"

ربیع نے ساری سرگذشت اوّل تا آخر سنادی۔ لیلے غور سے سنتی رہی پھر اس نے پوچھا۔

"سلیمان نہیں آیا؟ اسے منذر بن جارود نے روک لیا؟ کہیں اس میں کچھ فریب نہ ہو۔ مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے؟"

ربیع :- "یہ تمہارا وہم ہے۔ وہ اگرچہ ابن زیاد کا خسر ہے۔ لیکن محب اہل بیت ہے — ! میں محسوس کرتا ہوں۔ تم میرے سوال کے جواب میں ٹال مٹول سے کام لے رہی ہو۔ اس گھر میں کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ہے۔ جس کے بارے میں یہ شبہ ہو کہ اس نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہوگی۔ تم ہو اور تمہارے والد — کہیں تم دونوں میں تو لڑائی نہیں ہو گئی پھر سے ؟"

لیلےٰ ہنسنے لگی۔

"وہ ہم دونوں میں لڑائی کیوں ہوتی ؟ ابّا اب بالکل بدل گئے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب وہ یزید پر اور اس کی دولت پر ریجھے ہوئے تھے۔ اب تو اس سے نفرت میں وہ مجھ سے بھی دو قدم آگے ہیں مجھے تو بعض وقت ڈر لگتا ہے کہیں کسی دن گھر سے باہر نکل کر کوئی گل نہ کھلائیں۔ ان کا جوش تو اس وقت نوجوانوں کے جوش و خروش سے بھی بڑھا ہوا ہے۔"

ربیع ہنسنے لگا — !

باب ۵۶

پھر سفر

بڑی دیر تک ربیع اور لیلیٰ میں باتیں ہوتی رہیں۔ آدھی رات کا گجر جب بجا۔ تو ربیع چونک پڑا۔ اس نے ایک آہ سرد بھر کر کہا:۔

"اجازت دو لیلیٰ! آدھی رات بیت چکی۔ مسافر پھر سفر پر آمادہ ہے۔ دیر ہوئی تو منزل کھوٹی ہو جائے گی۔"

لیلیٰ نے پوچھا:۔

"ابھی تو اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو۔ اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

ربیع :۔" بصرہ سے یزید بن مسعود کا جو خط لایا ہوں۔ اسے لے کر حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں مکہ جا رہا ہوں۔ حضرت مسلم نے یہ ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔! جی نہیں چاہتا کہ جاؤں۔ لیکن جانا پڑ رہا ہے۔ لیلیٰ کیا بات ہے تم میں؟ کہ تمہارے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ تمہاری باتوں سے طبیعت نہیں اکتاتی۔ جی چاہتا ہے تمہیں دیکھتا رہوں، تمہاری باتیں سنتا رہوں۔ ماہ و سال کی گردش رُک جائے اور میں تمہارے پاس بیٹھا رہوں۔ تمہیں دیکھتا رہوں۔ تکتا رہوں۔"

خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم
نہ تمہاری یاد سے طبیعت سیر ہوتی ہے نہ تمہاری دید سے!"

لیلیٰ نے اٹھلاتے ہوئے کہا:۔

"اگر یہی بات ہے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے چلو۔"

لیلٰے :- "نہیں لیلیٰ! تمہیں کمزور اور زرد دیکھ رہا ہوں۔ واقعی تم کچھ بیمار معلوم ہوتی ہو۔ سفر کے شدائد کی تاب نہ لاسکو گی۔ تم بیمار ہو۔ میں انشاء اللہ جلد واپس آجاؤں گا!"

باتیں ختم کرکے ربیع نے نظر جو اوپر اٹھائی۔ تو دیکھا لیلیٰ کی آنکھیں پُرنم ہیں۔ وہ بے قرار ہوگیا۔ اس نے اضطراب و اضطرار کے ساتھ پوچھا :-

"لیلیٰ! یہ کیا؟"

وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے کہا :-

"کچھ نہیں! تم تو بہت بدگمان ہو جاتے ہو —— یہ بتاؤ کب تک واپس آجاؤ گے؟"

ربیع :- دس پندرہ دن میں —— اور اگر حضرت امام تشریف لائے۔ تو شاید دو چار دن اور لگ جائیں"

لیلٰے :- کیا آج ہی جانا ہے! یہ نہیں ہوسکتا ایک دو دن آرام کرلو مجھے تو کہتے ہو لیکن۔ آئینہ میں اپنی صورت بھی تو دیکھو"

ربیع :- "میری فکر نہ کرو۔ تم اچھی ہو تو میں بھی اچھا ہوں۔ تم خوش ہو تو میری خوشی کی بھی انتہا نہیں۔ تم رنجیدہ ہو تو سمجھ لو میری خوشی چھن گئی۔ مجھے اگر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اپنی صحت کا خیال کرو مجھے اگر خوش دیکھنا چاہتی ہو۔ تو خود خوش رہو۔ میری کنجی تمہارے ہاتھ میں ہے"

لیلٰے :- "توبہ ہے۔ تمہاری تقریر تو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتی"

ربیع :- "اچھا چپ ہو جاتا ہوں۔ رات بہت گزر گئی اب آرام کرو۔ اور مجھے سفر کی اجازت دو —— لیکن چلتے چلتے ایک بات ضرور کہوں گا"

لیلٰے :- "ہاں کہو۔ کیا ہے وہ بات؟"

ربیع :- ایک دور دراز منزل پر جارہا ہوں۔ ایک ایسا مقصد لے کر جس کے حصول کی راہ میں جان بھی کام آسکتی ہے مجھے افق پر فتنہ و فساد، جنگ و پیکار، خانہ جنگی اور خونریزی کے بادل نظر آرہے ہیں"

لیلےٰ :۔ "خدا نہ کرے ربیع ـــــ ! کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ جنہیں سن کر دل دہل جائے"

ربیع :۔ "خدا کرے میرا خیال غلط ہو۔ لیکن یزید اور ابن زیاد کے دم خم خود دیکھ چکی ہو۔ کیا یہ لوگ آسانی سے ہار مان لیں گے ؟"

لیلےٰ :۔ "یہ لوگ ظالم ہیں۔ اور ظلم کبھی سر سبز نہیں ہوتا"

ربیع :۔ "وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن لڑائی ضرور ہوگی اور بڑی خوفناک اور لرزہ خیز ہوگی"

لیلےٰ :۔ "مجھے تو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوگا۔ شام کے سوا ہر ملک امام عالی مقام کی اطاعت اور وفاداری کا دم بھر رہا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے ؟"

ربیع :۔ "اس واقع سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یزید نے جو قوت مجتمع کر لی ہے وہ بھی رنگ لائے بغیر نہ رہے گی"

لیلےٰ :۔ "ہاں، یہ جانتی ہوں ـــــ لیکن کوئی خاص بات کہہ رہے تھے تم ؟"

ربیع :۔ "ہاں، وہی بات کہنے کے لئے رکا ہوں"

لیلےٰ :۔ "تو کہتے کیوں نہیں ؟ کہو ـــــ بتاؤ کیا بات ہے وہ ؟"

ربیع :۔ "آؤ، ان دمکتے ہوئے تاروں کو گواہ کر کے ایک عہد کریں"

لیلےٰ :۔ "عہد کس قسم کا ؟ یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے ؟"

ربیع :۔ "آؤ ہم دونوں عہد کریں ـــ اس بات کا عہد کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکے گی۔ ہم ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔ اور زندگی کے آخری سانس تک اس رشتہ کو قائم رکھیں گے ـــ !"

لیلےٰ :۔ "تم آج کہہ رہے ہو۔ اور میں یہ عہد اسی دن سے کر چکی ہوں جب میں نے پہلی دفعہ تمہیں دیکھا تھا۔ تمہاری باتیں سنی تھیں۔ تمہارے خیالات سے واقف ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک کیسے کیسے مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے مجھ پر ؟ لیکن کیا ایک مقام پر بھی میں پیچھے ہٹی ؟ میں نے یزید کو ٹھکرا دیا۔ میں نے ابن زیاد کو ٹکا سا جواب دیا۔ میں اپنے باپ کا مقابلہ

کرتی رہی، اس کی سختیاں سہتی رہی۔ لیکن اپنے عزم وارادہ سے بال برابر بھی نہ ہٹی۔
اگر مُہر کرنا ہے تو تم کرو۔ مجھے نہ کہو۔ میں اس منزل سے بہت دن ہوئے
گزر چکی ہوں۔"

ربیع :۔" یہی باتیں ہیں جو میرے دل میں بس گئی ہیں۔ انہی چیزوں نے میرے مضبوط
اور توانا اور ناقابلِ شکست دل کو فتح کر لیا ہے۔ لیلیٰ تم کتنی اچھی ہو۔ اسے
میرے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔"

لیلےٰ :۔ (مسکرا کر) "غلط ـــــ یزید بھی جانتا ہے اور ابن زیاد بھی۔"
پھر ہنسنے لگی۔

ربیع :۔ تمہارا جہاں تک تعلق ہے۔ مجھے پورا پورا اطمینان ہے۔ لیکن معاف کرنا منذر
سے اب بھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں ایسا ہو۔ وہ پھر جائے؟ اس کا ارادہ بدل
جائے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟"

لیلےٰ :۔" یوں تو دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ لیکن تم ضرورت سے
زیادہ ان سے بدگمان ہو چکے ہو۔ ان بیچارے نے شروع میں جو کچھ کیا وہ کیا۔
لیکن اب تو ہر معاملہ میں ہم سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ اس بڑھاپے
میں جتنا دکھ وہ جھیل لیتے ہیں۔ کوئی نوجوان نہیں جھیل سکتا۔"

ربیع :۔" یہ تو ٹھیک ہے۔ ندامت محسوس کر رہا ہوں۔ کہ ایسی بات کیوں آئی ـــ
میرے دل میں؟ لیکن جانتی ہو۔

عشق است و ہزار بدگمانی

نہ جانے رہ رہ کر کیوں یہ اندیشہ دل میں آہی جاتا ہے؟"

لیلےٰ :۔ میری خاطر سے یہ اندیشہ نکال دو۔ مجھ پر اعتبار کرو۔ میں کسی دشمن کو بھی
دھوکہ نہیں دے سکتی۔ نہ کہ تمہیں؟"

ربیع :۔" یہ تو نہ کہو۔

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت

کیا ابن زیاد کو دھوکہ دے کر نہیں فرار ہوئیں ؟"

لیلےٰ :۔ (مسکرا کر) "اگر میں نے ایسا کیا بھی تو تمہارے کہنے سے۔ اگر اس نے مجھ سے پوچھا تو صاف صاف کہہ دوں گی۔"

ربیع :۔ "یعنی مجھے پھنسا دو گی ؟ واہ بھئی، اچھی قدر کی دل زار کی ؟"

لیلےٰ :۔ (گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے) "کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ابن زیاد کہاں مرگیا ؟ وہ کوفہ ہی آ رہا تھا۔ اور ہم اسے راستہ میں چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔ دوسرے ورنہ تیسرے دن اسے بہر حال یہاں آ جانا چاہیئے تھا۔"

ربیع :۔ "یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ کہاں مرگیا کمبخت ؟ ایسے لوگوں کو نہ موت آتی ہے نہ زوال ستاتا ہے۔ وہ زندہ رہے گا۔ برسرِ اقتدار رہے گا۔ اور طاعون کی صورت میں جلد ہی اس شہر پر نازل ہوگا۔ خدا خیر کرے۔"

لیلےٰ :۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ اگر وہ آیا۔ اور کسی طرح اسے ہمارا پتہ چل گیا۔ اور اس نے ہمیں پکڑوا بلایا۔ تو کیا کرو گے۔ ؟"

ربیع :۔ "اوّل تو انشاء اللہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور بہ فرضِ محال ایسا ہوا بھی تو اطمینان رکھو۔ جب تک ربیع زندہ ہے۔ ابن زیاد کیا، یزید کا ہاتھ بھی لیلیٰ کے دامن تک نہیں پہنچ سکتا ——— کیوں یہ خیال کیوں آ گیا تمہارے دل میں ؟"

لیلےٰ :۔ "مکہ جا رہے ہو وہاں سے کئی دن کے بعد آنا ہوگا۔ اگر اس عرصہ میں ابن زیاد آ گیا۔ اور اسے کسی طرح ہماری ٹوہ لگ گئی تو کیا ہوگا ؟ اسی لئے میں نے کہا تھا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی لیتے چلو ——؟"

ربیع :۔ (محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے) "کیوں فکر مند ہوتی ہو خواہ مخواہ ؟ میں انتظام کر کے جا رہا ہوں۔ میرے چند عزیز دوست ہیں سچے اور کھرے دوست میرے پسینہ پر خون بہا دینے والے۔ وہ ہر طرح نگرانی رکھیں گے۔ انشاء اللہ کسی قسم کی گڑ بڑ نہیں ہو سکے گی۔"

لیلےٰ :۔ "اب میں مطمئن ہو گئی ——— لیکن جس قدر جانے میں جلدی کر رہے ہو،

واپس آنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرنا ۔"

ربیع :۔ "انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا ۔"

اتنے میں موذن نے فجر کی آذان دی ۔ آذان جب تک ہوتی رہی وہ چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ آذان ختم ہونے کے بعد اس نے کہا :۔

"اگر آتے ہی سفر پر روانہ ہو جاتا ، تو راتوں رات نہ جانے کتنی دور نکل جاتا ۔ اب صبح ہو گئی ۔ دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے مجھے شہر کی حدود سے باہر چلا جانا چاہئیے ورنہ خطرات بڑھ جائیں گے ۔"

یہ کہہ کر ربیع اٹھا لیلیٰ پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور ــــــــــ !

"خدا حافظ ــــــ"

کہتا ہوا رخصت ہو گیا ۔

لیلیٰ دروازے تک رخصت کرنے گئی ۔ اور ٹکٹکی باندھے بڑی دیر تک اس رات کو تکتی رہی جسے پامال کرتا اس کا سبک سیر اور صبا رفتار گھوڑا روانہ ہوا تھا ۔ نہ جانے کب تک کھڑی رہتی کہ کسی نے شانے پر ہاتھ رکھا ۔ گردن موڑ کر دیکھتی کیا ہے کہ منذر کھڑا ہے ۔ اس نے کہا :۔

"بیٹی ! یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے تو ؟"

وہ کچھ نہیں بولی ۔ گردن جھکالی اس نے ــــ !

باب ۵۷

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر !

یزید بن مسعود کا نامہ لے کر ربیع، حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں روانہ ہو چکا تھا۔ کوفہ میں یہ خبر زور و شور کے ساتھ گرم تھی ــــ کہ حضرت امام حسینؓ آج ہی کل میں تشریف فرما ہوا چاہتے ہیں ــــ اہالیانِ کوفہ کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ وہ ــ دیدہ و دِل فرشِ راہ کئے بیٹھے تھے۔ کہ سبطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں۔ اور وہ ان کی خدمت میں اپنی ہر چیز حتیٰ کہ جان عزیز تک پیش کردیں۔

اِن خبروں نے نعمان بن بشیر، حاکمِ کوفہ کو سخت پریشان کر رکھا تھا اس کا معاملہ یہ تھا کہ ؎

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

نہ وہ اپنی عاقبت خراب کرنا چاہتا تھا نہ دنیا بگاڑنا چاہتا تھا۔ امویوں کی خوشنودی مزاج بھی پیشِ نظر تھا۔ اور سبطِ رسولؐ کی ناراضگی بھی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک مسلم بن عقیلؓ سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا تھا۔ نہ ان کے خلاف اموی سرداروں کے اصرار کے باوجود کوئی سخت قدم اٹھایا تھا۔ حالانکہ جانتا تھا کہ وہ کیوں تشریف لائے ہیں ؟ بلکہ یہ بھی جانتا تھا کہ حضرت امام حسینؓ کے لئے بیعت بھی لے رہے ہیں۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ اگرچہ ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بادِ سموم کے جھکڑ چل رہے

گیا۔ اس نے دیکھا "حضرت امام حسینؑ" ایک سیاہ عمامہ باندھے اور روئے مبارک کو ایک کپڑے سے ڈھانپے۔ گھوڑے پر بیٹھے تشریف لا رہے ہیں۔ اور خلقت کا ایک انبوہ عظیم ان کے پیچھے پیچھے مرحبا اور خوش آمدید کے نعرے لگاتا سیل رواں کی طرح آ رہا ہے ـــــ اتنے میں ابن زیاد قریب آگیا۔ مجمع بھی ساتھ ساتھ تھا ابن زیاد نے کہا:۔

"دروازہ کھول دو"

یہ آواز نعمان کے کان میں پہنچی۔ تو اس نے التجا اور اصرار کے ساتھ عرض کیا:۔

"خدا کی قسم ـــــ! میں اپنی امانت آپ کے سپرد نہیں کر سکتا۔ یا امام! میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ آپ سے جنگ کروں ـــــ میں آپ کو خدائے بزرگ و برتر کا واسطہ دیتا ہوں۔ کہ تشریف لے جائیے اور دارالامارۃ میں داخل ہونے کی کوشش نہ کیجئے"

اس نیازمندانہ تقریر کا جواب ڈانٹ سے ملا۔ ابن زیاد نے درشت لہجہ میں کہا:۔

"میں کہتا ہوں دروازہ کھول"

حاضرین میں ایک شخص نے ابن زیاد کی آواز پہچان لی اور بہ آوازِ بلند کہا:۔

"لوگو ـــــ! یہ حضرت امام حسینؑ نہیں۔ ابن مرجانہ (ابن زیاد) ہے، ہوشیار!

ابن زیاد کا نام سنتے ہی۔ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ اور آن کی آن میں جہاں لوگوں کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہاں ایسا سناٹا چھایا کہ گمان ہوتا تھا۔ جیسے بہت دن ہوئے ادھر سے کوئی گزرا ہی نہیں ہے۔

نعمان بن بشیر نے بھی آواز سے ابن زیاد کو شناخت کر لیا تھا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پھاٹک کھول دیا جائے ـــــ حکم کی تعمیل ہوئی۔ اور ابن زیاد محل کے اندر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے نعمان بن بشیر سے کہا:۔

"امیرالمومنین! یزید کو تمہاری نااہلیت اور کمزوری کا علم ہو چکا ہے اور آج میں

تھے۔ آفتاب کی تمازت اور موسم کی حدت نے لوگوں کو پریشان اور از کار رفتہ کر رکھا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔

ٹھیک اس موقع پر ابن زیاد کوفہ میں وارد ہوا۔

لیکن ایک عجیب انداز سے ــــــ !

اس کے سر پر سیاہ عمامہ تھا۔ چہرے کو اس نے کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھا۔ بصرہ کے چند اعیان مثلاً شریک ابن اعور اور منذر بن جارود ہمرکاب تھے۔ کوفہ میں اس کا داخلہ نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ ہوا۔ ساتھ جو لشکر تھا۔ اسے ایک منزل پرے چھوڑ دیا تھا۔ چند سواروں اور کچھ سپاہیوں کے ساتھ کوفہ میں داخل ہوا۔ نہ کوئی جاہ وحشم کا مظاہرہ تھا نہ کسی جلال وتمکنت کی نمائش۔ اس حالت میں اسے آتے دیکھ کر یہ گمان تو کسی کو نہیں گزرا کہ یہ ابن زیاد ہے۔ ہاں لوگوں کو یہ خیال ضرور ہوا کہ شاید حضرت امام حسینؓ تشریف لے آئے۔ اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ ہر طرف سے خلقت دیدار اور استقبال کے لئے ٹوٹ پڑی۔ چنانچہ جس طرف سے وہ گزرتا پُرخروش اور پُرزور نعرے لگتے۔

"مرحبا، مرحبا! اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند دلبند"

"خوش آمدید، اے ابن رسول اللہ"

ابن زیاد نے ان نعروں کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ خاموشی کے ساتھ اپنے گھوڑے پر سوار دارالامارۃ یعنی گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچ گیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے نعمان بن بشیر کو بھی یہ خبر مل گئی کہ حضرت امام حسین تشریف لے آئے اور سیدھے دارالامارۃ کی طرف آرہے ہیں۔ تاکہ اس پر قبضہ کرکے اپنی خلافت اور حکومت کا اعلان کر دیں۔ یہ سنتے ہی نعمان گبھراگیا۔ وہ اب بھی اس پر تیار نہیں تھا کہ حضرت امام حسینؓ سے مقابلہ کرے۔ لیکن اس پر بھی آمادہ نہیں تھا کہ دارالامارۃ ان کے حوالے کر دے۔ اور ان کی حکومت تسلیم کرلے۔ آخر جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو اس نے دارالامارۃ کے پھاٹک بند کرا دیئے۔ اور خود صورتِ حالات کا جائزہ لینے کے لئے کوٹھے پر چڑھ

نے بھی دیکھ لیا کہ تم حکومت کس شان سے کرتے ہو۔ بہرحال میں اب بصرہ اور کوفہ کا مشترک طور پر حاکم ہوں۔ اور تمہیں امیرالمومنین کے حکم سے معزول کرتا ہوں۔"

یہ سُن کر نعمان بن بشیر کا رنگ فق ہو گیا۔ اور ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ وہ ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہہ سکا۔ ابن زیاد نے کہا :-

"تم نے سُن لیا ہم نے کیا کہا ؟"

نعمان بن بشیر :- "جی ہاں سن لیا۔ میں اس وقت سے اپنے آپ کو معزول سمجھتا ہوں۔"

ابن زیاد :- "لیکن تم جانتے ہو۔ ابن زیاد، عفو و رحم کا قائل نہیں ہے۔ اس کے دستِ عقوبت سے کوئی مجرم بچ کر نہیں جا سکتا !"

نعمان بن بشیر :- "بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

ابن زیاد :- "کوفہ کے لوگ، امیرالمومنین یزید کی بیعت سے منحرف ہو چکے ہیں ؟"

نعمان بن بشیر :- "بڑی حد تک میرا مطلب یہ ہے کہ باشندگان کوفہ کی ایک بہت بڑی تعداد امیرالمومنین کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی۔"

ابن زیاد :- "وہ لوگ حسینؓ ابن علیؓ کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے ہیں ؟"

نعمان بن بشیر :- "جی ہاں، یہ امر واقعہ ہے۔"

ابن زیاد :- "تو تم نے انہیں ہموار کرنے کی کیا کوششیں کیں ؟"

نعمان بن بشیر :- "میں نے نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کیا تھا کہ ان کی مخالفت زیادہ شدید نہ ہو جائے۔"

ابن زیاد :- "نہیں ——— یہ کہو۔ تم نے انہیں من مانی کرنے کی اجازت دے رکھی ہے کیا مسلم بن عقیل کوفہ میں ہیں۔ ؟"

نعمان بن بشیر :- "جی ہاں، وہ یہیں ہیں !"

ابن زیاد :- "کہاں ٹھہرے ہیں ؟ کون ان کا میزبان ہے ؟"

نعمان بن بشیر :- "میں نہیں جانتا کوشش کے باوجود ان کی قیام گاہ کا مجھے سراغ نہیں لگ سکا۔"

ابن زیاد :۔ "کیا وہ حسینؓ ابن علیؓ کے لئے لوگوں سے بیعت نہیں لے رہے ہیں ؟"

نعمان بن بشیر :۔ "سنا تو میں نے بھی ہے۔ لیکن میری اب تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہیں کہہ سکتا یہ خبر کہاں تک صحیح ہے ؟"

ابن زیاد :۔ "تم کوفہ کے لوگوں کو سازش اور شرارت سے نہیں روک سکے۔ تم حسینؓ ابن علیؓ کی دعوتِ امامت و خلافت کا سدباب نہیں کر سکے۔ تم مسلم بن عقیل کی قیام گاہ کا سراغ نہ لگا سکے۔ نہ انہیں کوفہ سے نکل جانے پر مجبور کر سکے۔ ان کوتاہیوں کی کم سے کم سزا یہ ہو سکتی ہے کہ گرفتار کر لئے جاؤ۔ تمہارا مال اسباب ضبط کر لیا جائے۔ اور دمشق بھیج دیئے جاؤ تاکہ امیرالمومنین تمہارے لئے کوئی موزوں اور مناسب سزا تجویز کر سکیں ۔"

نعمان بن بشیر نے یہ باتیں سنیں۔ لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

ابن زیاد نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا :۔

"لیکن قبل اس کے دمشق بھیجے جاؤ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھتے جاؤ کہ شورش پسند لوگوں کا استیصال کس طرح کیا جاتا ہے ؟ تم کوفہ کے لوگوں کو کسی سازش اور شرارت سے نہ روک سکے۔ ہم تمہیں بتائیں کہ یہ کام کس طرح کیا جا سکتا ہے ؟ تم مسلم بن عقیل کا سراغ نہ لگا سکے۔ لیکن ہم تمہیں بتائیں گے کہ مجرم کس طرح گرفتار کئے جا سکتے ہیں ؟ کیونکر ان کی گردن کاٹی جا سکتی ہے ؟"

یہ کہہ کر ابنِ زیاد نے شریک بن اعور سے کہا :۔

"نعمان تمہاری حراست میں رہے گا۔ یہ تمہارا دوست ہے۔ لیکن اسے بتا دو کہ حکومت کے مفاد پر دوستی کس طرح قربان کی جا سکتی ہے۔ یہ کسی رحم و رعایت کا مستحق نہیں ہے۔ اگر تم نے اس طرح نہ رکھا۔ جس طرح ہم چاہتے ہیں۔ تو تمہارا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو اس کا ہوا ہے !"

یہ سن کر شریک بن اعور کانپ گیا۔ اس نے کہا :۔

"یا امیر! میرے طرزِ عمل سے آپ کو کوئی شکایت نہ ہوگی ۔"

پھر ابن زیاد نے منذر بن جارود سے کہا :-

" تمام سردارانِ محلہ کل ہمارے حضور میں حاضر کیئے جائیں۔ ہم ان سے براہ راست گفتگو کریں گے۔"

باب ۵۸

ابنِ زیاد کا اضطراب

ابن زیاد نے نعمان بن بشیر کو گرفتار کر لیا۔ اس کی جائیداد ضبط کر لی۔ لیکن یہ مسئلہ کا حل نہ تھا۔ اس نے اپنا اضطراب کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت مضطرب تھا۔ کوفہ کی سرزمین پر جب اس نے قدم رکھا تو اس کا استقبال،

"السلام علیکم یا ابن رسول اللہ"

"خوش آمدید یا سبطِ رسول اللہ"

کی آوازوں سے ہوا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ حسینؓ ابن علیؓ کی عقیدت کی جڑیں کتنی مضبوط ہیں۔ سارا کوفہ امام ہمام کے دیدار کے لئے امڈ پڑا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا۔ یزید سے لوگ بیزار اور متنفر ہیں۔ معاملہ حد سے آگے بڑھ چکا ہے جتنا اس نے سمجھا تھا اس سے کہیں زیادہ سنگین صورت حال ہے۔

رات کے کھانے کے بعد اس نے شریک ابن اعور اور منذر بن جارود کو طلب کیا۔ ان سے اپنا دردِ دل بیان کیا اور مشورہ کرنے لگا کہ اس صورتِ حال جو لمحہ بہ لمحہ نازک تر اور خوفناک تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کس طرح عہدہ برآ ہو۔ اس نے شریک بن اعور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:-

"کیوں شریک! تم نے دیکھا حالات کتنے نازک ہو چکے ہیں؟"

شریک بن اعور:- "جی ہاں دیکھا۔ اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو، ——— کہنا تو نہیں چاہتا لیکن کہنا پڑتا ہے۔ کہ کم از کم کوفہ تو ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

ابن زیاد :۔ دیگر گر ؟ احمقوں کی سی باتیں نہ کرو۔ میں نے اس لئے تمہیں بزمِ مشورہ میں شرکت کی دعوت نہیں دی ہے کہ مجھے مایوس کرو۔ اس لئے بلایا ہے۔ کہ ان حالات سے سربرہونے کی کوئی تدبیر بتاؤ ؟"

منذر بن جارود :۔" ان شورش پسندیوں کا ایک ہی جواب ہے !

ابن زیاد :۔" وہ کیا ؟ کس قسم کا جواب ؟"

منذر بن جارود :۔" وہی جو آپ نے حسینؑ ابن علیؓ کے قاصد سلیمان کو دیا تھا۔ یعنی قتل وغارت ہلاکت اور بربادی۔ جو شخص مشکوک نظر آئے اس کی گردن اڑا دی جائے۔ جس کی وفاداری مشتبہ ہو اسے جان کی امان نہ ملے۔ جو ہمارا ساتھ نہ دے۔ وہ ہمارا دشمن ہے۔ جو امیر المومنین یزید بن معاویہ کے دشمنوں سے ساز باز رکھے وہ اس قابل نہیں کہ زندہ رہ سکے "

ابن زیاد :۔ شریک میں اسی قسم کی باتیں سننا چاہتا تھا "

شریک بن اعور :۔" منذر سے زیادہ خوشنما الفاظ میں یہ مفہوم ادا کر سکتا تھا۔ لیکن میرے خیال میں سختی کر کے ہم اور زیادہ لوگوں کو اپنا مخالف بنالیں گے "

ابن زیاد :۔" پھر تمہاری رائے میں کیا ہونا چاہیئے ؟"

شریک بن اعور :۔ میں نے نعمان کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔ امکانی حد تک سختی اور تشدد سے کام لے رہا ہوں "

ابن زیاد :۔" شاباش ! تمہیں یہی کرنا چاہیئے تھا "

شریک ابن اعور :۔" لیکن میری ناقص رائے میں طرزِ عمل وہی مناسب اور مستحسن تھا جو اس نے اختیار کیا تھا "

ابن زیاد :۔" یعنی نرمی اور ملاطفت —— کیوں ؟"

شریک بن اعور :۔" جی ہاں، میری رائے یہی ہے "

منذر بن جارود :۔" آپ کی اس تجویز کا انجام یہ ہوگا کہ ابنِ زیاد کی گردن ماردی جائے گی۔ میرا حشر سب سے زیادہ عبرتناک ہوگا۔ خود آپ کو بھی اپنی جان کے لالے

پڑ جائیں گے۔ مسلم بن عقیل حسینؑ ابن علیؓ کی طرف سے کوفہ کے گورنر ہوں گے۔ امیر المومنین یزید کی خلافت کم از کم اس شہر میں تو افسانۂ ماضی بن جائے گی۔ (ابن زیاد سے مخاطب ہو کر) کیا آپ یہ انجام دیکھنے کے لئے تیار ہیں؟ کیا اسی لئے یہاں کے گورنر بن کر تشریف لائے ہیں؟ کیا امیر المومنین یزید نے اسی لئے آپ کو یہاں بھیجا ہے؟"

ابن زیاد :۔ "مجھے جو کچھ کرنا ہے جانتا ہوں۔ بلکہ اس کا نقشہ بھی بنا چکا ہوں۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اہلِ کوفہ پر ایسی سختی کروں گا۔ کہ وہ پشت ہا پشت کے لئے بغاوت، سرکشی اور نافرمانی کو بھول جائیں گے۔ میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ سختی کروں گا۔

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر پھر بھی حالات نہ سنبھلے تو کیا ہوگا؟"

منذر بن جارود :۔ "پھر بھی حالات نہ سنبھلے، اس کا کیا مطلب؟ کیا لوگ قبر سے اٹھ کر آپ کی مخالفت کریں گے۔؟"

شریک بن اعور :۔ "لیکن قبر میں جانے سے پہلے تو کر سکتے ہیں؟

ابن زیاد :۔ "آپ لوگ اگر اسی طرح برسرِ پیکار رہے تو میں استعفیٰ دے دوں گا۔ میں نے یہاں کی امارت اس لئے قبول کی تھی کہ آپ حضرات کے اشتراک و تعاون سے وہ کام کر دکھاؤں جو اَب تک کسی سے نہ ہو سکا۔ اور پھر امیر المومنین یزید کے دربار سے وہ انعام ہم سب حاصل کریں جو ہمیں محسودِ خلائق بنا دے۔ لوگ ہم پر رشک کرنے لگیں۔

شریک ابن اعور :۔ "تو بسم اللہ! مجھے کسی خدمت کے بجا لانے میں عذر نہیں آپ اگر میری وفاداری کا امتحان چاہتے ہیں تو مجھے مکہ بھیج دیجئے۔ حسینؓ کا سر کاٹ لاؤں گا۔۔ مسلم بن عقیل کو پکڑوا بلایئے ان کی جان لے لوں گا۔ نعمان موجود ہے۔ اس کی گردن ابھی حاضر کی جا سکتی ہے۔ اور اگر ان باتوں سے بھی تشفی نہ ہو تو اتنی جرأت رکھتا ہوں کہ اپنے ہاتھ سے اپنا سر قلم کر دوں۔ ———

بتایئے آپ کیا چاہتے ہیں؟"

منذر بن جارود :۔ "تم تو خفا ہو گئے۔ اتنے نازک دماغ ہو۔ اس کا تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا ـــــ بہرحال اب ہمارے مابین کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ ہم دونوں مل کر امیر ابن زیاد کی خدمت کریں گے۔ ان کے دست و بازو ثابت ہوں گے۔ دوست! یاد رکھو۔ ہمارا یہ اعزاز و اکرام، ہماری یہ عزت و منزلت، ہمارا یہ جاہ و حشم صرف، صرف امیر المومنین یزید کے دم قدم تک ہے۔ وہ سلامت ہیں تو ہم بھی موجود ہیں۔ وہ نہ رہے تو ہم کہاں جائیں گے؟"

ابن زیاد :۔ "اور کیا، ذرا سوچو تو؟ ـــــ تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لو۔ حسینؑ ابن علیؑ مسند خلافت پر متمکن ہیں ـــــ اب کیا ہوگا؟"

منذر بن جارود :۔ "وہی جو علیؑ ابن طالب کے زمانہ میں ہوا تھا۔"

شریک ابن اعور :۔ "بیت المال، مسلمانوں کی ملکیت بن جائے گا۔ قصر خلافت ڈھا دیا جائے گا۔ اس کے بجائے ایک خس پوش مکان ہوگا جس میں امیر المومنین قیام فرمائیں گے۔"

ابن زیاد :۔ "یہ لونڈیاں آزاد کر دی جائیں گی، شاعروں کے قصیدے سننے والا کہیں دور دور نظر نہیں آئے گا۔ نہ ان بیچاروں کو انعام ملے گا۔ دنیا کی لذتیں ہم سب پر حرام ہو جائیں گی۔ بس ایک ہی کام رہ جائے گا۔ نماز پڑھو روزہ رکھو، زکوٰۃ دو۔، غریبوں کی مدد کرو۔ غیر مسلموں سے مساوات کا برتاؤ کرو۔ جو بھوکا ہو اسے کھانا کھلاؤ۔ جو ننگا ہو اسے کپڑا پہناؤ۔"

منذر بن جارود :۔ "گانا سننا جرم ہو جائے گا۔ رقص و نغمہ کی مجلسیں خواب و خیال ہو جائیں گی۔ شراب کے ایک ایک قطرہ کو لوگ ترسیں گے۔"

ابن زیاد :۔ "میں تو ایسی حکومت کے تصور سے خائف ہو جاتا ہوں۔ بھلا وہ بھی کوئی زندگی ہے۔ جو اس طرح گزرے کہ انسان عبادت ہی عبادت بن کر رہ جائے۔"

شریک بن اعور :۔ (ہنستے ہوئے) سب کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن اپنی لونڈیوں سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ جام شراب سے کنارہ کشی نہیں کر سکتا۔ رقص و نغمہ کی محفل سے

رشتہ منقطع نہیں کر سکتا! ـــــــــــ یا امیرالمومنین! شریک، آپ کا شریکِ حال ہے۔"

ابن زیاد:- "بس تو بیڑہ پار ہے۔ بتاؤ (منذر سے مخاطب ہو کر) تم نے محلّہ کے سرداروں کو طلب کیا؟"

منذر بن جارود:- "جی ہاں، صبح وہ لوگ حاضرِ خدمت ہوں گے۔"

ابن زیاد:- "ان لوگوں کو کیسا پایا؟"

منذر بن جارود:- "بڑے تیز و طرار لوگ ہیں۔ پِٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے۔ جس جس سے ملا۔ اس نے امیرالمومنین کو وہ وہ ملاحیاں سنائی ہیں کہ میں تو ـــ ششدر رہ گیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔ صرف حکومت ہی نہیں ہماری زندگی تک خطرہ میں ہے۔ نہ جانے کب یہ طوفان، طوفانِ بلا بن کر نمودار ہو۔ اور ہم اس سیلِ بے پناہ میں ایک تنکے کی طرح بہنے لگیں۔"

ابن زیاد:- "ایسا نہیں ہوگا۔ ہم اپنے فرض سے واقف ہیں۔ ہم جانتے ہیں ہمیں کیا کرنا ہے؟ ـــــ کل تم دیکھ لوگے۔ فضا پھر بادل بن جائے گی۔ جو آج ہم سے بات نہیں کرتے وہ ہمارے قدموں پر سر رکھیں گے۔"

باب ۵۹

ابنِ زیاد کی تلوار

منذر بن جارود اور شریک بن اعور کی رقابت ختم ہو چکی ہے۔ ابن زیاد نے کچھ ایسا انچھر پڑھ کر پھونکا کہ یہ دونوں پھر شیر و شکر ہو گئے ہیں اور یزید کی خلافت کو دوام و استحکام بخشنے کے لئے غیر مشروط طور پر اشتراک و تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

دارالامارۃ کے بڑے ہال میں ایک زر کار اور زر نگار مسند پر ابن زیاد۔ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے قہر و جلال کا پیکر بنا بیٹھا ہے۔ سامنے شمشیر برہنہ رکھی ہے۔ اور بائیں طرف ایک کوڑا۔ مقابل میں منذر بن جارود، شریک بن اعور اور دوسرے معتمد افسر اور حکام چپ چاپ بیٹھے ہیں۔

ان سرداروں کا سردار حاتم بن قیس ہے۔ وہ بالکل ابن زیاد کے روبرو بیٹھا ہے۔ ابن زیاد نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا:۔

"کیا حاتم بن قیس تم ہی ہو؟"

حاتم بن قیس:۔ "جی ہاں، یہ میرا نام ہے"

ابن زیاد:۔ "کیا سردارانِ محلّہ نے تم کو اپنا شیخ اور ترجمان بنا لیا ہے؟"

حاتم بن قیس:۔ "جی ہاں ——————— اس اعزاز پر مجھے فخر ہے!"

ابن زیاد:۔ (قبضہ شمشیر پر ہاتھ رکھ کر) "بتاؤ! امیر المومنین یزید کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

حاتم بن قیس :۔ "وہ معاویہ بن ابوسفیان کے بیٹے ہیں"
ابن زیاد :۔ "وہ امیر المومنین بھی ہیں، خلیفۃ المسلمین بھی ہیں"
حاتم بن قیس :۔ "ہاں، وہ مسندِ خلافت پر متمکن ہیں"
ابن زیاد :۔ "اور جو مسندِ خلافت پر متمکن ہو۔ اس کی اطاعت واجب ہوتی ہے۔ یہ بھی تو معلوم ہوگا آپ کو؟"
حاتم بن قیس :۔ "بشرطیکہ وہ اسلام کے راستے پر چلے۔ راہِ حق پر گامزن ہو۔ کوئی ایسا حکم نہ دے۔ جو شرعِ اسلامی کے منافی ہو"
ابن زیاد :۔ "کیا تمہارا خیال ہے کہ امیر المومنین یزید ان شرائط پر پورے نہیں اترتے؟"
حاتم بن قیس :۔ "میرا خیال کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک دنیا کا یہی خیال ہے"
ابن زیاد :۔ (گرج کر) کہاں ہے وہ دنیا؟ لاؤ اسے ہمارے سامنے حاضر کرو۔ ہم اسے سزا دیں گے، ہم اسے برباد کریں گے، ہم اسکا نام و نشان تک مٹا دیں گے"
حاتم بن قیس :۔ "خدا کا کام اپنے ذمہ لینے کی کوشش نہ کیجئے۔ مارنا اور جلانا، آباد رکھنا اور ویران کر دینا، سرسبز و شاداب کرنا اور فنا کر دینا کسی بندے کا کام نہیں۔ یہ کارِ خدائی ہے۔ اور خدا ہی کو زیب دیتا ہے!"
ابن زیاد :۔ (غصہ سے) "خاموش، تو بے ادب ہے۔ گستاخ ہے!"
حاتم بن قیس :۔ "زبان کاٹی جاسکتی ہے لیکن حق بات سے اسے باز نہیں رکھا جاسکتا یہ گردن قلم کی جاسکتی ہے۔ لیکن غیر حق کے آگے اسے جھکنے پر مجبور نہیں جاسکتا۔ یہ جان لی جاسکتی ہے۔ لیکن معصیت کے فرامین پر اس کی اطاعت حاصل نہیں کی جاسکتی"
ابن زیاد :۔ (برہمی کے عالم میں) "تجھے یہ سب کچھ کرنا پڑے گا!"
حاتم بن قیس :۔ "اے ابن زیاد! تو قوت اور طاقت کے نشہ میں سرشار ہے لیکن تو بھول گیا۔ قوت طاقت کا اصل سرچشمہ ذاتِ الٰہی ہے۔ یہ قوت اور طاقت

اگر حق کی تبلیغ اور سچائی کی راہ میں صرف ہوتی ہے تو مبارک ہے۔ اور اگر یہ ناحق کی حمایت اور باطل کی تائید میں صرف کی جاتی ہے تو کارِ شیطان ہے۔ خدا سے ڈر، تو بھی ایک دن اسی طرح مرے گا۔ جس طرح تیرا باپ مرا تھا۔ اور آج وہ اپنے اعمال کی جواب دہی کر رہا ہوگا۔ اسی طرح تجھے بھی اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ اے ابن زیاد! یاد رکھ۔ معاویہ اپنی قبر میں ہیں اور زیاد اپنی قبر میں۔ کوئی ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتا، ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تو اپنی قبر میں دفن ہوگا اور یزید اپنی قبر میں۔

وہ تیری مدد کو نہیں پہنچ سکے گا۔ اور تو اس کی دستگیری نہیں کر سکے گا۔ اس کے اعمال اس کے ساتھ ہوں گے اور تیرے اعمال تیرے ساتھ، پس عقل سے کام لے۔ دنیا پر آخرت کو قربان نہ کر۔ دنیا کی زندگی فنا ہونے والی اور آخرت کی زندگی کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔ یہ داہنے اور بائیں جو لوگ تیرے دستِ بازو بن کر بیٹھے ہیں۔ صرف اقتدار کے پجاری ہیں۔ جس طرح یہ تیری خوشامد کر رہے ہیں۔ اسی طرح نعمان بن بشیر کی خوشامد کرتے تھے۔ آج وہ گرفتار بلا ہے، اور یہ اس کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ کل تجھ پر بھی یہ وقت آ سکتا ہے۔ اور تیرا ساتھ بھی اسی طرح چھوڑ دیں گے۔ جس طرح انہوں نے نعمان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ عقلمند ہے جو واقعات سے سبق حاصل کرتا ہے۔ اور احمق وہ ہے جو واقعات کو اپنا اور اپنی رائے کا تابع سمجھ لے۔"

ابن زیاد :۔ "میں نے تجھے اس لئے نہیں بلایا ہے۔ کہ تیرا وعظ سنوں۔"

حاتم بن قیس :۔ "میں بھی یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ باطل پرستیوں میں تیرا ساتھ دوں۔"

ابن زیاد :۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ تو امیرالمومنین کا مخالف اور حسینؑ ابن علیؓ کا حامی ہے؟"

حاتم بن قیس :۔ "کیا اس میں کچھ شک ہے؟ ——— ہاں میں حسینؓ ابن علیؓ کا حامی ہوں۔ حامی نہیں، جانثار، فدائی ——— ہاں، میں یزید کا مخالف ہوں۔ مخالف ہی نہیں دشمن، عدو۔ حسینؓ کا حامی! اس لئے ہوں کہ وہ رسولؐ کی تصویر اور اسلام کا نمونہ ہے، اور یزید؟ وہ غاصب اور فاسق و فاجر ہے۔"

ابن زیاد :۔ "حد ہو گئی یہ باتیں میں نہیں برداشت کر سکتا۔ اس دریدہ ذہنی کی تجھے سزا بھگتنی پڑے گی۔"

حاتم بن قیس :۔ "مجھے دہشت زدہ کرنے کی کوشش نہ کر۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ تیرا ہاتھ بار بار تلوار کے قبضہ پر جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ تلوار میری گردن پر گرنے کے لئے بیقرار ہے۔ مجھے معلوم ہے تو میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ ——— میں جانتا ہوں تو کسی ایسے شخص کو زندہ نہ رہنے دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ جو تیرے راستے میں حائل ہو۔ پھر بھی اپنے مسلک پر قائم ہوں میرا فیصلہ اٹل ہے۔ یہ سر حسینؓ کی حمایت میں کٹ سکتا ہے۔ یزید کے سامنے جھک نہیں سکتا، اس لئے کہ حسینؓ ابن علیؓ حق ہے اور یزید باطل، حسینؓ نور ہے اور یزید تاریکی — !"

شاید حاتم ابھی کچھ اور کہتا۔ لیکن دفعتاً بجلی کی طرح ایک تلوار چمکی اور حاتم کی گردن کو کاٹتی ہوئی خون میں لت پت ابن زیاد کے ہاتھ میں لرزنے لگی۔

یہ سب کچھ اتنی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہوا کہ جب حاتم کی گردن، جسم سے الگ ہو کر گری۔ تب اس کے ساتھیوں نے جانا کہ کیا ہوا!۔

ابن زیاد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جاتے جاتے سردارانِ محلہ سے کہا :۔

"یہ صرف ایک نمونہ تھا۔ تم سب کا یہی حشر ہو گا۔ اگر میری نافرمانی کی۔ یاد رکھو۔ تمہارے محلہ میں جو کوئی خارجی ہو اسے پکڑو۔ اور میرے حوالے کر دو۔ تمہارے محلہ میں حسینؓ ابن علیؓ کا جو دوستدار ہو۔ اسے گرفتار کرو۔ اور میرے پاس

پہنچا دو۔ تمہارے محلہ میں جو یزید کا بدخواہ ہے۔ اسے گھسیٹتے ہوئے میرے پاس لاؤ۔ اور دیکھو میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں ؟

میں نے اپنے جاسوس اور مخبر سارے شہر میں پھیلا رکھے ہیں۔ وہ ایک ایک بات کی مجھے خبر دیتے ہیں۔ اگر کسی محلہ سے کوئی حسینؑ کا حامی اور یزید کا مخالف گرفتار ہوا۔ تو اس کی گردن بعد میں ماری جائے گی۔ اس سے پہلے سردارِ محلہ کی گردن پر تلوار پڑے گی اور اس کے بعد اہالیان محلہ کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔ پھر اس دشمنِ خلافت کی باری آئے گی !"

پھر اس نے منذر بن جارود سے کہا :-

"جامع مسجد چلو۔ وہاں اہل شہر سے خطاب کروں گا ——— میرا فرض ہے کہ اپنی تلوار بے نیام کرنے سے پہلے انہیں بتا دوں کہ کیا کرنے والا ہوں ؟"

پھر وہ سردارانِ محلہ سے مخاطب ہوا :-

"آپ لوگ بھی مسجد میں پہنچئے !"

یہ لوگ ہانپتے کانپتے مسجد میں پہنچے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے منادی ہو چکی تھی۔ اور شہر کا بہت بڑا حصہ ابن زیاد کی تقریر سننے کے لئے مجتمع ہو چکا تھا ——— تھوڑی دیر کے بعد ابن زیاد بھی پہنچ گیا۔ عصا کے بجائے اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس نے داہنے، بائیں کسی طرف نہیں دیکھا۔ سر جھکائے تلوار لیئے سیدھا ممبر پر پہنچا۔ اور حمد و ثنا کے بعد تقریر شروع کی :-

"لوگو !

امیرالمومنین یزید نے مجھے کوفہ کا گورنر مقرر کیا ہے۔ میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کروں گا۔ فرمان برداروں کے ساتھ احسان کروں گا۔ غداروں اور نافرمانوں کا سر کچل دوں گا۔ جو میرے ساتھ رفاقت اور اطاعت کا برتاؤ کرے گا۔ وہ میرے لطف و کرم سے مالا مال ہو گا۔ جو سرکشی اور نافرمانی کرے گا۔ اس کی تو تیغ میرا کوڑا کرے گا۔

اس کی خاطرداری میری شمشیر بے نیام کرے گی۔ لہٰذا جسے زندگی عزیز ہو۔
چاہیئے کہ سرکشی اور بغاوت کے خیالات اپنے دل سے نکال دے۔
اور امن و عافیت کی زندگی بسر کرے۔

باب ۶

بیچاری لیلےٰ

ربیع مکہ معظمہ حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں گیا ہوا تھا ——— ابن زیاد — قہرِالٰہی کی صورت میں کوفہ کو زیر و زبر کر رہا تھا۔ جب تک وہ نہیں آیا تھا۔ یہاں کا ذرہ ذرہ امام حسین کا فداکار اور یزید کا دشمن تھا۔ لیکن جب سے وہ آیا تھا اور اس نے سختی شروع کی تھی۔ صورت حال بالکل بدل گئی تھی۔ اب سبطِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فداکار خال خال بھی نظر نہیں آتے تھے۔ نہ وہ اجتماعات تھے، نہ وہ جلسے، نہ وہ نعرے تھے۔ نہ وہ جوش و خروش، نہ وہ ہنگامہ آرائیاں تھیں۔ نہ وہ سرفروشی اور جاں نثاری کے عزائم۔ ایک خاموشی سی چھائی ہوئی تھی ہر طرف ایک سناٹا سا مسلّط تھا۔ شہر کے کوچہ و بازار اور بام و در پر جسے دیکھئے وہ سہما ہوا مرعوب اور وہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ لوگ آپس میں باتیں کرتے ڈرتے تھے۔ کہیں یہ بات ابن زیاد تک نہ پہنچ جائے۔ اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ لوگ مسجدوں میں جاتے تھے اور چپ چاپ نماز پڑھ کر چلے آتے تھے۔ امام کا خطبہ سنتے تھے۔ اور خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ حضرت علیؓ کے خلاف مسجد کے ممبر پر سب شتم کے الفاظ سنتے تھے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتے تھے —!

چند دنوں کے اندر اتنا بڑا انقلاب واقع ہو گیا تھا کہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ یہ وہی کوفہ ہے۔ جہاں جہاد اور شہادت کے تذکرے اور چرچے ہوتے رہتے۔ اور اب یہ حال تھا کہ جان بچا لینے کے سوا کوئی فکر کسی کو نہ تھی۔

لیلیٰ، یہ انقلاب دیکھ رہی تھی اور سہمی ہوئی اپنے گھر میں بیٹھی تھی۔ وہ مرنے سے نہ ڈرتی تھی۔ موت برحق ہے۔ ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ لیکن وہ ابن زیاد کے ہاتھوں نہیں مرنا چاہتی تھی۔ اور ربیع کی عدم موجودگی میں بھی اسے جان دینا منظور نہیں تھا۔ وہ سوچتی تھی۔ اگر ابن زیاد کو میرا پتہ چل گیا تو کیا ہوگا؟

ایک روز سہ پہر کا وقت تھا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا۔ یہ اب کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ اب ڈوبا اور اب ڈوبا۔

لیلےٰ اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں افسردہ اور پریشان بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ کہ منذر آتا دکھائی دیا ــــ اس کا بوڑھا باپ!

منذر کو دیکھ کر وہ سر وقد کھڑی ہو گئی۔ اور دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ کہ آج خلافِ معمول بہت ہشاش بشاش نظر آ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی رونق ہے۔ ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا ہے۔ بڑھاپے کے اضحلال میں بشاشت کی شوخی نے مل کر عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔ سوچنے لگی۔ آج وہ کون سی بات واقع ہوئی ہے۔ جس نے اس شخص میں زندگی اور نشاط و مسرت کی رمق پیدا کر دی ہے، ابھی تھا جو زندگی سے تھک چکا تھا، بیزار ہو چکا تھا۔ جس کے لئے زندگی وبال دوش بن چکی تھی؟

باپ کو خوش دیکھ کر اپنی پریشانیاں اور فکریں بھول گئی۔ منذر نے بڑے چاؤ اور پیار سے کہا:۔

بیٹی! کیا بات ہے۔ میں کئی دن سے تجھے آشفتہ خاطر اور پریشان حال دیکھ رہا ہوں۔ شاید تو اس لئے فکر مند ہے کہ ربیع اب تک نہیں آیا۔ لیکن میری بچی وہ بڑے اہم کام سے گیا ہے۔ ابھی تو شاید مکہ بھی نہ پہنچا ہوگا۔ شاید ابھی کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا ــــ لیکن تو سہمی ہوئی کیوں ہے؟"

لیلیٰ نے اپنی کیفیت پر غالب آتے ہوئے کہا:۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں۔ پریشان اور مضطرب ذرا بھی نہیں ہوں۔

یہ آپ کا خیال ہے؟"

منذر:۔ (ہنستے ہوئے) "بیٹی! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہے مجھ سے اپنا حال چھپانے کی کوشش نہ کر۔ میں تیرا باپ بھی۔ ہوں اور دوست بھی اگر کوئی بات پریشانی کی محسوس کرتی ہے تو بے دھڑک کہہ دے!"

لیلےٰ:۔ "کچھ نہیں، بس یہ سوچ رہی ہوں۔ کہ ابن زیاد کمبخت یہاں پہنچ گیا۔ ہے"

منذر:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) "ایک زمانہ تھا کہ میں بھی یہ باتیں سوچا کرتا اور پریشان ہوا کرتا تھا۔ گھنٹوں اور پہروں یہ خیالات مجھے پریشان رکھتے تھے بعض دفعہ تو رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن اب اگر ابن زیاد کی تلوار بھی اپنے سر پر چمکتے دیکھ لوں۔ تو ذرا نہیں گھبرا سکتا۔ اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ موت اٹل اور زندگی فانی ہے۔ پھر جو چیز اٹل ہے۔ اس سے بھاگنے کی کوشش کیوں کریں؛ زندگی جب فانی ہے تو ہم اس فانی زندگی کے لئے حق کو چھوڑ کر باطل کا سودا کیوں کریں؟"

لیلےٰ:۔ "کتنا عجیب انقلاب پیدا ہو گیا ہے آپ میں ابا جان!"

منذر:۔ "ہاں بیٹی! میں خود اس انقلاب پر متحیر ہوں ——— لیکن یہ خدائی دین ہے جب تک یہ بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں اتنا کمزور تھا کہ علیؑ کا ساتھ چھوڑ بیٹھا۔ پھر تیرا استقلال دیکھ کر حوصلہ پیدا ہوا۔ مگر وہ بھی کمزور تھا۔ یزید کے سامنے کانپنے لگا۔ حالانکہ جانتا تھا وہ خلافت کا مستحق نہیں ہے۔ ابن زیاد سے لرزنے لگا۔ حالانکہ جانتا تھا وہ خدا نہیں ہے۔ مستقبل کے خوف سے ہراساں ہو گیا۔ حالانکہ جانتا تھا۔ مستقبل میرے ہاتھ میں۔ نہیں ہے۔ جو کچھ ہونے والا ہے ضرور ہو گا۔ اور چونکہ وہ خدا کی طرف سے ہو گا۔ لہٰذا خواہ میں اسے پسند کروں یا ناپسند، ہر حالت میں وہی بہتر

اور مناسب ہوگا۔ جب سے یہ بات دل میں سمائی ہے، عجیب حال پاتا ہوں اپنا۔ نہ اب یزید کی دہشت ہے۔ نہ ابن زیاد کا خوف۔ بلکہ یوں سمجھ، نہ اب میں تلوار سے ڈرتا ہوں نہ قبر سے۔"

لیلے :۔" یہ تو بڑا اچھا خیال ہے آپ کا؟"

منذر :۔" اور میں چاہتا ہوں تو بھی اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کر لے۔ میں نے تجھ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تو میری یہ بات گرہ میں باندھ لے۔"

لیلے :۔" ایسا ہی کروں گی ابا جان! ________ لیکن اسے کیا کروں کہ ابن زیاد کی دہشت دل سے نہیں نکلتی کسی طرح؟"

منذر :۔" کیا تو خدا کی تقدیر پر شاکر اور قانع نہیں ہے؟"

لیلے :۔" ضرور ہوں۔ بھلا خدا کی تقدیر سے کسے مفر ہو سکتا ہے؟ ہم چاہیں یا نہ چاہیں اس کی مرضی ضرور پوری ہوگی۔"

منذر :۔" ٹھیک ________ لیکن یہ تیرا خیال ہے عقیدہ نہیں۔ خیال کمزور ہوتا ہے۔ عقیدہ مستحکم، اپنے اس خیال کو عقیدہ بنا لے۔ پھر نہ ابن زیاد کی جبروت تجھے ڈرائے گی، نہ یزید کی شوکت و طاقت!"

اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ منذر آہستہ آہستہ اذان کے الفاظ دہراتا رہا۔ اذان کے بعد اس نے لیلیٰ سے کہا۔

" مسجد تک جاتا ہوں۔ نماز سے فارغ ہو کر جلد آجاؤں گا۔ تو گھبرائے گی تو نہیں۔؟"

لیلے :۔" بالکل نہیں گھبراؤں گی۔ شوق سے تشریف لے جایئے۔"

منذر چلا گیا ____!

اور لیلے اس کے جانے کے بعد پھر اپنے خیالات میں کھو گئی۔ منذر

نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ بالکل صحیح تھا۔ دلیل اور منطق کا جہاں تک تعلق تھا ایک بات بھی غلط نہیں تھی۔ لیکن جب ابن زیاد کی باندی بننے اور اس کے کسی کریہہ المنظر اور بدخو غلام کی بیوی بننے کا خیال آتا تو سر سے پاؤں تک کانپ جاتی تھی۔

باب ۱۶

ایک اور حادثہ

ابن زیاد قہر و جلال کا پیکر بنا کوفہ میں وارد ہوا۔ اور آتے ہی ایک قیامت برپا کر دی۔ اس کے جاسوس سارے شہر میں، ہر محلہ میں، ہر گھر میں پھیل گئے۔ اور ہر ایک کی ٹوہ لگانے لگے ـــــــ جسے ذرا مشتبہ پایا اسے نذر زنداں کر دیا۔ جسے کچھ بھی مخالف دیکھا۔ اس کی گردن اڑا دی۔ جس کے "چال چلن" کو مشکوک پایا۔ اسکا مال و اسباب ضبط کر کے جلا وطنی کا پروانہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

منذر جو مغرب کی نماز پڑھنے گیا۔ تو ندارد، عشاء تک انتظار کرتی رہی لیکن جب رات بھیگنے لگی تو گھبرائی کہ اب تک نہ آنے کے کیا معنی ہیں؟ گھر سے ملا ہوا ایک اور گھر تھا۔ اس میں ایک بڑے میاں اپنی بڑی بی کے ساتھ عافیت اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیلیٰ کو تو ان کے ہاں جانے کا کوئی اتفاق نہیں ہوا البتہ وہ کبھی کبھی منذر کے پاس تشریف لے آتے تھے۔ اور گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ لیلیٰ نے سوچا۔ ان بڑے میاں سے جن کا نام میمون بن یونس تھا۔ دریافت کرے۔ ابا جان مسجد سے کہاں غائب ہو گئے۔ اگرچہ رات زیادہ آ چکی تھی اور محلہ میں سوتا پڑ چکا تھا۔ لیکن چادر اوڑھ کر باہر نکلی۔ اور بڑے میاں کے دروازے پر دستک دینی شروع کی۔ وہ بھی شاید خواب خرگوش میں مبتلا تھے کئی دستکوں کے بعد آنکھیں ملتے ایک شمع ہاتھ میں لئے برآمد ہوئے۔ لیلیٰ کو دیکھا تو چکرا گئے۔ بڑے اشتیاق اور اپنائیت کے ساتھ فرمایا:۔

"ارے بیٹی! تو اس وقت کہاں آ گئی، خیریت تو ہے؟"

وہ چادر سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بڑے میاں جب دروازہ بند کر کے پھر اس کی طرف مڑے تو اس نے کہا:۔

"ابا جان مغرب کی نماز پڑھنے مسجد گئے تھے۔ مگر اب تک نہیں آئے۔ آپ سے یہی پوچھنے آئی تھی وہ کہاں رہ گئے۔ آپ تو ہر وقت کی نماز مسجد ہی میں پڑھتے ہیں۔ ضرور ان سے ملاقات ہوئی ہوگی؟"

بڑے میاں نے اپنے اوپر حیرت کی کیفیت طاری کرتے ہوئے فرمایا:۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے تو لڑکی؟ منذر کو تو میں نے آج عصر کے وقت سے نہیں دیکھا ظہر کی نماز تو بے شک ہم نے ایک ساتھ پڑھی تھی۔ لیکن پھر نہ وہ عصر کے وقت مسجد میں دکھائی دیئے نہ مغرب کے وقت نہ عشاء کے وقت۔"

یہ سن کر لیلیٰ پر سناٹا چھا گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ طرح طرح کے وسوسے اور واہمے پریشان کرنے لگے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بڑی حسرت کے ساتھ پوچھا:۔

"کیا واقعی آپ نے نہیں دیکھا؟"

وہ نیند کے غلبہ سے جمائیوں پر جمائیاں لے رہے تھے۔ لیکن اس بات پر ہنسی نہ ضبط کر سکے، ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں بیٹی؟"

لیلیٰ:۔ "پھر کہاں چلے گئے؟"

بڑے میاں:۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں کہاں گئے؟"

لیلیٰ:۔ "کسی دشمن کے ہاتھ تو نہیں آ گئے؟"

بڑے میاں:۔ "بھلا منذر جیسے فرشتہ صفت اور درویش صورت آدمی کا دشمن کوئی ہو سکتا ہے؟ ——— لیکن اب تک گھر سے غائب رہنا کچھ معنیٰ ضرور رکھتا ہے۔ کہیں خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو بیچارے کو؟"

"یہی تو مجھے ڈر ہے۔ ورنہ عشاء کی نماز پڑھتے ہی گھر آجایا کرتے تھے۔"

اور یہ کہتے کہتے رونے لگی۔ لیکن رات کا وقت تھا، اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بڑے میاں اس وقت تک رونے کا اندازہ نہیں لگا سکے جب تک سسکیاں نہ سن لیں سسکی کی آواز سن کر گھبرائے۔ انہوں نے کہا :-

"ہو سکتا ہے شہر میں کسی دوست سے ملنے گئے ہوں"

لیلے :- "آپ کے سوا اس شہر میں نہ ان کا کوئی دوست ہے نہ واقف کار اور شناسا"

بڑے میاں :- "اچھا تم بیٹھو میں جاتا ہوں۔ جب تک نہ آجاؤں میرا انتظار کرو"

یہ کہہ کر بڑے میاں نے عصا سنبھالا۔ بڑی بی کو خوابِ راحت سے بیدار کیا اور خود منذر کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔

بڑی بی کو کچی نیند سے اٹھنا بہت ناگوار گزرا۔ لیکن شوہر کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور تھیں۔ وہ تو منذر کو تلاش کرنے چلے گئے۔ اور یہ لیلے سے محض وقت گزاری کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ لیلیٰ اتنی پریشانی میں مبتلا تھی۔ ان کے سوالات کا جواب تو کیا دیتی؟ ہاں ہوں کر کے ٹالتی رہی۔

یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ فجر کی اذان ہو گئی۔ لوگ نماز پڑھ پڑھ کر اپنے اپنے گھر واپس آ گئے۔ دھوپ نکل آئی۔ لیکن نہ منذر کا پتہ چلا نہ بڑے میاں واپس آئے۔

اب تو بڑی بی بھی پریشان ہوئیں ——— انہیں جب اور کچھ نہ سوجھا تو لیلے پر طنز کا تیر پھینکا :-

"نہ جانے کہاں بیٹھ رہے جا کر، آخر انہیں بھیج کر تمہیں کیا مل گیا؟ منذر کا تو پتہ چلا نہیں، وہ خود بھی گم ہو گئے"

" لیلے نے دل دہی کرتے ہوئے کہا :-

"کہاں جا سکتے ہیں؟ اب آتے ہی ہوں گے"

بڑی بی کو اس بات سے تشفی نہیں ہوئی۔ بولیں :-

"آتے ہی ہوں گے۔ نہ جانے کب آئیں گے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔

سچ کہے دیتی ہوں۔ اگر ان کا پتہ نہ چلا تو تمہارا دامن پکڑ لوں گی۔ ہاں!"

لیلیٰ اس بات کا کیا جواب دیتی۔ خاموش ہو گئی۔ بڑی بی اتنی ذرا سی دیر میں اس سے اتنی متنفر ہو گئی تھیں کہ اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئیں۔ کہ اس منحوس لڑکی کی صورت اگر دیکھتی رہیں تو نہ جانے اور کون سی آفت آجائے!

بڑی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اب تو لیلےٰ بھی گھبرانے لگی کہ آخر معاملہ کیا ہے! لیکن بڑی بی کے ڈر سے وہ منہ سے کچھ کہہ نہ سکی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

یکایک دروازہ کھلا۔ اور بڑے میاں ہانپتے کانپتے داخل ہوئے۔ اس وقت ان کی حالت کچھ عجیب طرح کی ہو رہی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا، بال پریشان، حواس برہم۔

بڑی بی تو اپنے یوسف کو پا کر اتنی خوش ہوئیں کہ وفورِ مسرت سے بند قبا ٹوٹنے لگے۔ لیکن لیلےٰ نے اس حالت میں جو انہیں دیکھا تو گھبرا گئی۔ یارا نہ پڑا کہ منذر کے بارے میں کچھ دریافت کرے۔ وہ صورت سوال بن کر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔ پھر ایک آہ سرد بھر کر کہا:-

"منذر گرفتار ہو گئے!"

یہ سن کر لیلےٰ پر بجلی گر پڑی۔ اس نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا:-

"کس نے گرفتار کیا انہیں؟ کس جرم میں گرفتار کئے گئے؟"

بڑے میاں نے جواب دیا:-

"مسلم بن عقیل گرفتار ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھ چند اور لوگ بھی پکڑے گئے ہیں۔ انہیں میں منذر بھی ہیں —— سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ وہاں کس طرح پہنچ گئے۔ بہر حال آج یا کل ان کی اور ان کے ساتھیوں کی ابن زیاد کے سامنے پیشی ہو گی۔ بڑا ظالم آدمی ہے یہ کمبخت ابن زیاد۔ دیکھئے کیا گزرتی ہے —— اور بیٹی! مجھے تو اب تمہاری خیر بھی نظر نہیں آتی۔ ابن زیاد کا یہ اصول ہے کہ وہ مجرم کے ساتھ اس کے متعلقین کو بھی سزا دیتا ہے۔ جب سے آیا ہے یہی کر رہا ہے۔ میری رائے تو یہ ہے

کہ کسی دوسرے شہر میں چلی جاؤ۔"

بڑی بی اس وقت تک خاموشی سے سب کچھ سنتی رہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ:۔

"کسی اور شہر میں جاؤ یا نہ جاؤ۔ لیکن اس گھر سے تو ابھی نکل جاؤ۔ ایسا نہ ہو ہم بھی تمہاری وجہ سے لپیٹ میں آجائیں۔ وہی بات ہوئی۔ کرتو کر۔ نہیں تو خدا کے غضب سے ڈر۔!"

باب ۶۲

.... تیرا ارادہ کدھر ہے آج ؟

لیلےٰ چپ چاپ اٹھی اور اپنے گھر چلی آئی۔ دروازہ بند کیا اور کمرے میں پہنچ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے!

اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے؟ یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ ابھی تک ابن زیاد کے سامنے مسلم بن عقیل اور ان کے ساتھیوں کی پیشی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن آج یا کل ضرور ہوگی۔ وہ منذر کو دیکھتے ہی پہچان لے گا اور مسلم بن عقیل سے پہلے اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گا۔ ممکن نہیں کہ منذر کو دیکھے اور اسے میں یاد آجاؤں۔ ضرور وہ میرے بارے میں پوچھ کرے گا۔ آبا جان نہ بتائیں تو بھی یہ معلوم کر لینے میں دیر نہیں لگے گی کہ یہیں اسی شہر میں ہوں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ منذر کا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے نہ طلب کرے؟ اس کے سپاہی جب مجھے پکڑنے آئیں گے۔ تو کیا کروں گی؟ کیا مزاحمت کر سکوں گی؟ کیا میرے لئے یہ ممکن ہو گا کہ ان سے مقابلہ کر سکوں؟

پھر اب کہاں جاؤں؟

کس سے امداد و اعانت اور دستگیری کی امید کروں؟!

اس شہر میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو میری مدد کرے، جو میرا ساتھ دے، جو مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے۔ دمشق کے دروازے مجھ پر پہلے ہی بند ہو چکے ہیں۔ اب کوفے سے بھی مجھے دلیس نکالا مل رہا ہے۔

سارا دن یہی باتیں سوچتے سوچتے گزر گیا۔ اب رات کا اندھیرا شروع ہو چکا تھا۔ اسی فکر میں مستغرق بیٹھی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

جب تک مصیبت واقع نہیں ہوتی۔ آدمی ڈرتا رہتا ہے۔ لیکن جب آ پڑتی ہے تو دہشت اور سراسیمگی ختم ہو جاتی ہے۔ مصیبت کا مقابلہ کرنے کی ہمّت اور سکت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حالت اس وقت لیلیٰ کی ہوئی اب تک وہ ابنِ زیاد کی قہاری سے اس کے ظلم و ستم سے، اس کی سفّاکی اور شقاوت سے ڈر رہی تھی۔ لیکن جب یقین ہو گیا کہ اب نجات و فرار کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو اس کا مضطرب دل ٹھہر گیا۔ اس کی دہشت دور ہو گئی۔ وہ استقلال و عزیمت کے ساتھ مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھی اور دروازے پر پہنچ گئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا۔ بڑے میاں سامنے کھڑے ہیں۔ وہ بولی :-

"اتنے ناوقت یہاں آنے کی زحمت کیوں گوارا فرمائی؟"

بڑے میاں نے تقریباً روتے ہوئے کہا :-

"بیٹی تو سچ کہتی ہے۔ خطرہ تیرے اوپر بھی منڈلا رہا ہے اور میرے اوپر بھی لیکن آخر مرد ہوں۔ اتنا بزدل تو نہیں ہو سکتا کہ تجھے یوں تنہا چھوڑ دوں"

لیلیٰ :- "اس مہربانی کا شکریہ۔ لیکن آپ میری تنہائی کس طرح دُور کر سکتے ہیں؟ آپ کے گھر تو میں کسی طرح نہیں جا سکتی۔ میرے اندر بھی کچھ غیرت ہے"

بڑے میاں :- "بے شک، کہاں تک غیرت نہ ہو گی، تیرے اندر آخر کس باپ کی بیٹی ہے۔ لیکن میری بیٹی! اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنا عقلمندی نہیں ہے"

لیلیٰ :- "لیکن یہ بھی بتایئے کروں کیا ــ؟"

بڑے میاں :- "میرے ساتھ چل۔ میں تجھے امن و عافیت کی جگہ پہنچا دوں گا!"

لیلیٰ :- "کہاں لے جانا چاہتے ہیں مجھے آپ؟"

بڑے میاں :- "اپنے ایک دور افتادہ عزیز کے ہاں۔ تجھے لے جاؤں گا۔ ابنِ زیاد منذر کو چاہے قتل کر دے لیکن تیرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا"

لیلیٰ :- "ممکن ہے وہ بھی ابن زیاد سے اتنا ہی ڈرتے ہوں۔ جتنا آپ ڈرتے ہیں یا آپ کی اہلیہ محترمہ ڈرتی ہیں۔ اور وہ بھی اپنے گھر سے نکال دیں۔ پھر میں کہاں جاؤں گی ؟"

بڑے میاں :- "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کو جانتا ہوں وہ بڑے مخلص اور کھرے لوگ ہیں۔ یا تو کسی کو پناہ نہیں دیتے اور اگر دیتے ہیں تو اس کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ میں نے ایک تیز رفتار سانڈنی کا انتظام کر لیا ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ تجھے پہنچا کر میں واپس آجاؤں گا۔"

لیلیٰ :- "اس بزرگانہ شفقت کا بھر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ لیکن میں نہیں جاؤں گی۔ اپنے حال میں مگن ہوں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔"

بڑے میاں :- "بیٹی! ضد نہ کرو۔ میرا کہا مان لو۔ میں نے چپکے چپکے حالات معلوم کئے آج وہ لوگ ابن زیاد کے سامنے پیش نہیں کئے گئے۔ کل اس نے دربار عام میں مسلم بن عقیل اور ان کے ساتھیوں کو طلب کیا ہے۔ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہتا ہوں۔ منذر کی تو خیر نہیں۔ اسے خدا کے سپرد کرو۔ اپنی فکر کرو۔ اپنی جان بچاؤ۔ صرف آج کی رات تمہارے پاس ہے۔ یہ اگر رائیگاں گئی تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اس کے پنجۂ ظلم سے نہیں بچا سکے گی۔"

لیلیٰ :- "اگر مجھ پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ تو ایک بات کیجئے !"

بڑے میاں :- "بتاؤ، بتاؤ۔ میں سب کچھ کرنے پر تیار ہوں۔ جو میرے امکان میں ہو !"

لیلیٰ :- "اپنی سانڈنی مجھے دے دیجئے ——!"

بڑے میاں :- "وہ حاضر ہے۔ لایا تمہارے ہی لئے ہوں۔ لیکن ایک طرف تو تم میرے عزیز کے ہاں جانے سے انکار کر رہی ہو۔ دوسری طرف سانڈنی مانگ رہی ہو۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے ؟"

لیلیٰ :۔ "بس وہ سانڈنی مجھے دے دیجئے۔ میں چلی جاؤں گی۔ میرا جہاں جی چاہے گا"

بڑے میاں :۔ "تو یوں کہو۔ تم کسی دوسرے شہر میں اپنے کسی عزیز کے ہاں جانا چاہتی ہو؟"

لیلیٰ :۔ "جی ہاں، یہی بات ہے"

بڑے میاں :۔ "تو شوق سے سانڈنی لے جاؤ ——— لیکن کیا اکیلی جاؤ گی؟ میں، ان عزیز کے علاوہ کہیں اور نہیں جا سکتا۔ نہ میرے پاس کوئی خادم یا غلام ہے۔ جسے تمہارے ساتھ بھیج دوں"

لیلیٰ :۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ میں آپ چلی جاؤں گی۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں تلوار چلانا جانتی ہوں۔ میرے پاس خنجر بھی ہے۔ میں اپنی حفاظت کر لوں گی"

بڑے میاں :۔ "مسجد تو تم جانتی ہو؟"

لیلیٰ :۔ "جی بہت اچھی طرح"

بڑے میاں :۔ "تو مسجد کے داہنی طرف جو گلی چلی گئی ہے۔ اس میں داخل ہو جاؤ۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک کھجور کا درخت ہے۔ اس سے بندھی ہوئی ایک سانڈنی ملے گی۔ بڑی سیدھی اور بڑی تیز رفتار۔ اس پر بیٹھ کر جہاں جانا ہو چلی جاؤ"

لیلیٰ :۔ "بہت خوب! بس میں اتنا ہی چاہتی تھی ——— یہ گھر آپ کے سپرد ہے۔ اس مکان میں جو ساز و سامان ہے۔ وہ آپ کو دیتی ہوں سانڈنی کی قیمت تو اس وقت پیش نہیں کر سکتی۔ یہی ٹوٹا پھوٹا سامان ہے۔ اگر آپ نے قبول نہ کیا تو سانڈنی لینے سے انکار کر دوں گی۔ اور قسمت پر شاکر ہو کر اسی گھر میں بیٹھی رہوں گی"

بڑے میاں، لیلیٰ کی اس پیشکش سے خوش تو بہت ہوئے۔ اس لئے کہ سانڈنی کے عوض میں انہیں جو ساز و سامان مل رہا تھا وہ اس کی قیمت سے کئی گنا زیادہ تھا۔ لیکن انہوں نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے کہا :۔

"اچھا تو نہیں مانتی تو میں مانے لیتا ہوں ——— یہ ساز و سامان احتیاط سے رکھ لوں گا۔ جب تو آئے گی۔ تو واپس کر دوں گا۔ لیکن بیٹی اب دیر نہ کرو۔"

لیلیٰ وہی چادر اوڑھے چپکے سے باہر نکل گئی۔

باب ۳۶

آتشِ نمرود

لیلےٰ مکہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کے لئے اس کے سوا اب کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہ گیا تھا کہ کوفہ سے نکل کر ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے۔ جو ابن زیاد کی دسترس سے باہر ہو۔

منذر کا واقعہ یوں تھا کہ وہ گھر سے مغرب کی نماز پڑھنے کے لئے نکلا۔ ابھی مسجد تک نہیں پہنچا تھا کہ ایک بھیڑ دیکھی۔ بہت سے آدمیوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ اور ایک شخص ان کے بیچ میں کھڑا کہہ رہا تھا:۔

مسلمانو!

کیا تمہارے لئے اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرم کی بات ہو سکتی ہے کہ تم خود سبطِ رسولؐ کو دعوت دو۔ ان کی خدمت میں التجائیں پیش کرو۔ انہیں امارت و خلافت کی دعوت دو۔ ان کے حضور میں وفود بھیجو یزید اور اس کے طرزِ عمل سے بیزاری کا اظہار کرو۔ اور پھر جب امام ہمام اپنا قاصد تمہارے پاس بھیجیں۔ تو اس کی پذیرائی کرو۔ جوش و خروش کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرو۔ اس کے ہاتھ پر سمع و اطاعت کی بیعت کرو۔ لیکن جب ابن زیاد جیسا سفاک اور دغا صفت خود ساختہ امیر بن کر تمہارے اوپر مسلط ہو۔ اور سختیاں شروع کرے تو اپنی جان بچانے کے لئے گردن جھکا دو۔ اور سبطِ رسولؐ کے

کا وقت نہیں ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

" خدا پر بھروسہ کرو۔ آؤ۔ راہِ حق میں جہاد کر کے ثابت کر دو، کہ مسلمان کسی قیمت پر بھی غیر اسلامی نظام کو برداشت نہیں کر سکتے ——— کیا مجھ بوڑھے کو دیکھ کر بھی تم میں غیرت پیدا نہیں ہوئی ؟——— ہاں، میں سمجھا۔ تم سوچ رہے ہو۔ تمہارے بعد تمہارے متعلقین کا کیا حشر ہو گا ! فرزندوں پر کیا گزرے گی ؟ دوستو اور عزیزو ! یہ سوال میرے سامنے بھی ہے۔ اور تم سے نازک صورت میں۔ میں ایک جوان اور ناکتخدا لڑکی کا باپ ہوں۔ میں ہی اس کا سہارا ہوں۔ میں ہی اس کا رکھوالا ہوں۔ گھر پر ایک پائی بھی نہیں چھوڑ آیا، نہیں جانتا میرے بعد وہ کیا کرے گی ——— ؟ کس طرح زندگی بسر کرے گی ؟ پھر بھی میرا دل مطمئن ہے۔ اور میں انشراحِ قلب کے ساتھ راہِ حق و صداقت میں گردن کٹا دینے کو تیار ہوں "

یہ تھا منذر ! ———

منذر کی اس تقریر نے حاضرین میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ اور واقعی جو لوگ فکر و تردد میں مبتلا تھے۔ وہ ایک جوش اور جذبہ کے عالم میں کٹ مرنے اور اپنی جان قربان کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ پُر زور اور پُر جوش نعرے لگنے لگے ——— مختلف گوشوں سے آوازیں آنے لگیں :-

" ہم یزید کی حکومت برداشت نہیں کر سکتے "

" ہم کسی ایسے امیر کی ماتحتی میں زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ جو شریعت اسلامیہ کی توہین اور خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہو "

" ابن زیاد، ظالم، بدخو اور سفاک ہے۔ وہ ہمارا امیر نہیں ہو سکتا "

بھیجے ہوئے قاصد مسلم بن عقیل کو گرفتار کرا دو ۔ اور ان کی امداد اعانت سے دست کشی اختیار کر لو ۔

کوفہ کے مسلمانو !

تمہاری کم ہمتی اور بزدلی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلم بن عقیل گرفتار ہو چکے ہیں، مگر تم میں کوئی جرأت نہیں، کوئی جوش نہیں، کوئی ولولہ نہیں، کوئی جذبہ نہیں، چاہیئے تو یہ تھا کہ تم خون کی ندیاں بہا دیتے ۔ اپنی گردنیں کٹا دیتے ، اپنی جان دے دیتے ۔ مگر اپنی آن اور شان پر آنچ نہ آنے دیتے مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ تم کچھ نہ کر سکے ۔

" اب بھی وقت ہے ، ہمت کرو ۔ آؤ آگے بڑھو ۔ ابن زیاد کے قصر کا محاصرہ کر لو ۔ اور اسے مجبور کرو کہ یہاں سے بھاگ جائے ——— چلو ، جیل کی چار دیواری پر حملہ کردو ۔ ثابت کر دو کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں "

دفعتہً مجمع میں ایک حرکت پیدا ہوئی ۔ ایک بوڑھا شخص لوگوں کو چیرتا آگے بڑھا ۔ اور اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا :۔

" اے شخص تو سچ کہتا ہے ۔ واقعی یہ ہماری ——— پشت فطرتی ہے کہ مسلم بن عقیل گرفتار ہو جائیں ۔ اور ہم آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے عیش عشرت کی زندگی بسر کرتے رہیں ۔ میں اپنے آپ کو ہر قربانی کے لئے پیش کرتا ہوں ۔ بیمار اور نحیف ہوں ۔ لیکن اتنا حوصلہ رکھتا ہوں کہ اسلام کے راستہ میں اپنی جان قربان کر دوں ۔ اور جو شخص میرے راستہ میں حائل ہونے کی کوشش کرے ۔ اس کی جان لے لوں ۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا شخص کیوں نہ ہو "

دوستو ، بھائیو ، عزیزو !

بیر سوچنے ، غور کرنے اور نشیب و فراز کے پہلوؤں پر رائے قائم کرنے

"یزید کی خلافت غاصبانہ ہے۔ ہم اسے کسی قیمت پر تسلیم نہیں کر سکتے۔"

"آؤ، ایک نئی حکومت بنائیں۔ جو قرآن اور سنتِ رسول کریمؐ پر مبنی ہو۔"

ان آوازوں اور نعروں نے ایسی صورتِ حالات پیدا کر دی۔ کہ معلوم ہوتا تھا ایک سیلِ رواں ابن زیاد کے دارالامارۃ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور وہ خس و خاشاک کی طرح ابن زیاد کو، اس کی ہیبت و جبروت کو، یزید کو اور اس کی خلافت کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔

دفعتہً فوج اور پولیس کے سواروں کا ایک بہت بڑا دستہ آیا۔ جو ہر طرح کے آلات سے مسلح تھا۔ اس نے آتے ہی مجمع کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کا سردار آگے بڑھا اور اس نے اعلان کیا:-

"تم لوگ باغی ہو۔ اور باغی کی سزا قتل ہے۔ تمہیں دو بوڑھے آدمیوں نے بھڑکایا۔ اور تم مشتعل ہو گئے۔ اب تم سب کی زندگی میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر امیر ابن زیاد تک تم لوگ پہنچ گئے۔ تو ایک کی جان بھی نہ بچ سکے گی۔ مجھے تم پر رحم آتا ہے۔ ایک موقع دیتا ہوں۔ یہ گھیرا ایک طرف سے ہٹائے لیتا ہوں۔ جو اپنی زندگی عزیز رکھتا ہو وہ چلا جائے۔ اس سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کروں گا۔ لیکن جو واقعی جنگ کرنا چاہتا ہے، بغاوت پر آمادہ ہے۔ امیرالمومنین کی خلافت کو اور امیر ابن زیاد کی امارت کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کھڑا رہے۔ ہم اسے وہ دیں گے جو وہ چاہتا ہے۔ یعنی موت ——!

اس تقریر نے وہ سارا جوش و خروش ختم کر دیا۔ جس کی آواز سے بام و در گونج رہے تھے۔ جس نے حاضرین کو مرنے مارنے اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جوش و خروش ابھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں نہیں کہیں اور جلوہ گر ہوا تھا۔ جیل کو توڑنے

اور قصرِ امارت کو ڈھا دینے کے نعرے یہاں نہیں کہیں اور لگ رہے تھے۔

سپاہیوں کے افسر نے جو کچھ کہا تھا۔ اس پر عمل کیا۔ اس نے ایک طرف سے گھیرا اٹھا لیا اور چند ہی لمحوں میں سارا مجمع صاف ہوگیا۔

وہ تمام لوگ جو بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہے اور تقریریں کر رہے تھے۔ غائب ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ وہ شخص بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جس کی تقریر سے متاثر ہو کر منذر نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا۔

اب تمام لوگ غائب ہو چکے تھے۔ ایک اکیلا منذر اپنی جگہ پر تھا، جیسے اس کے پاؤں زمین نے پکڑ لئے ہوں۔ جیسے اس کے ہوش و حواس غائب ہو چکے ہوں۔ جیسے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہو۔

افسر مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے منذر سے کہا:۔

"آپ کیوں اب تک کھڑے ہیں۔ آپ کے سارے ساتھی چلے گئے نہ صرف چلے گئے بلکہ غائب ہو کر گئے ہیں۔ وہ اپنی جانیں نہیں دے سکتے۔ آپ وہی مانگتے تھے۔ وہ تکلیف نہیں اٹھا سکتے۔ آپ اسی راستہ پر انہیں لے جانا چاہتے تھے۔ وہ کسی قربانی کے لئے تیار نہیں ہیں اور آپ انہیں قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے۔ مجھے ان لوگوں سے زیادہ آپ پر رحم آتا ہے۔ جائیے تشریف لے جائیے۔ کوئی آپ سے تعرض نہیں کرے گا!"

منذر نے آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے جنبش کی۔ افسر نے کہا:۔

"لیکن یہ سن لیجئے کہ معافی بار بار نہیں ملتی۔ آئندہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ ہو!"

منذر جاتے جاتے رک گیا۔ اس نے کہا:۔

"اس کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ جب بھی موقع ملے گا۔ بغاوت کروں گا۔ اس خلافت کو امارت کو، اس نظامِ حکومت کو، نہ تسلیم کرتا ہوں نہ اس سے تعاون

باب ۴۶

ابنِ زیاد کے سامنے

ابنِ زیاد اپنے دارالامارۃ میں بیٹھا ہے۔ خاص خاص سردار اور امراء حضور میں حاضر ہیں۔ چتون چڑھی ہوئی ہے۔ غصہ کے آثار ہویدا ہیں۔ تلوار میان سے نکال کر سامنے رکھی ہے۔ خنجر ہاتھ میں ہے۔ اور وہ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے کچھ سوچ رہا ہے۔ حاضرین میں سے کسی کی مجال نہیں کہ بات کر سکے۔ یا آپس میں سلسلۂ گفتگو شروع کر سکے۔ سب پر ایک ہیبت سی چھائی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ابن زیاد نے ایک شخص کی طرف دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا۔ جس نے کل رات منذر کو گرفتار کیا تھا۔ استمالت کے لہجہ میں کہا:۔

"جابر! ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ تم نے وہ کام کیا جو کوئی اور اب تک نہیں کر سکا تھا۔ مسلم بن عقیل کو گرفتار کر کے تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس پر ہم بھی تمہیں انعام دیں گے۔ اور امیر المومنین یزید سے بھی انعام دلوائیں گے ——— مسلم بن عقیل ہمارے لئے بڑی کوفت کا سبب بن گیا تھا۔ اس نے سارے کوفہ کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اور اتنی تنظیم کے ساتھ کہ اس کی جائے قیام کا سراغ لگانا ناممکن ہو گیا تھا۔ مگر شکر ہے۔ تم نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے یہ مہم سر کر لی!"

جابر نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"لیکن کل میں نے مسلم بن عقیل کے علاوہ ایک اور دشمن کو گرفتار کیا ہے۔ اور

کر سکتا ہوں۔ نہ اسے تباہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دوں گا۔"

یہ سن کر افسر کا چہرہ فرطِ غضب سے تمتما اٹھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا:۔

"اس بڈھے کو گرفتار کر لو۔ یہ موت سے نہیں ڈرتا؟"

اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔

کے لہجہ میں کہا:۔

"بھگوڑے۔ تو نے پناہ بھی لی تو کہاں؟ کوفہ میں؛ تو نے بغاوت کی تیاری بھی کی تو کہاں؟ میرے شہر میں؛ تیرے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔ جابر نے تیرے جو حالات بتائے ہیں وہ غلط ہوں تو بھی تیری گردن سلامت نہیں رہ سکتی۔ تو اتنا بڑا مجرم ہے کہ موت بھی جس کے لئے بہت ہلکی سزا ہے۔"

منذر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے ٹکٹکی لگائے ابن زیاد کو دیکھتا رہا۔ اس خاموشی سے ابن زیاد کا غصہ اور بڑھ گیا اس نے کہا:۔

"تو بد باطن ہے۔ نمک حرام ہے، احسان فراموش ہے۔ جی چاہتا ہے، ابھی حکم دوں کہ تیری گردن اڑا دی جائے۔"

منذر کے لب ہلے اس نے کہا:۔

"پھر کیا دیر ہے؟ یہ گردن خود میرے لئے بھی بارگراں بن گئی ہے اب تو!"

ابن زیاد:۔ "تیری یہ حسرت ضرور پوری ہو گی ——— لیلےٰ کہاں ہے؟"

منذر:۔ "میں نہیں جانتا۔"

ابن زیاد:۔ "تو نہیں جانتا تو اور کون جانتا ہے؟"

منذر:۔ "جانتا ہوں لیکن نہیں بتاؤں گا۔"

ابن زیاد:۔ (جابر سے مخاطب ہو کر) "یہ کہاں ٹھہرا تھا؟"

جابر:۔ "یا امیر! میں نے بہت سراغ لگایا۔ مگر اب تک پتہ نہ چل سکا کہ یہ کہاں اور کس محلہ میں ٹھہرا تھا؟ میں نے جاسوسوں کو اس کام پر مامور کر دیا ہے امید ہے جلد ہی پتہ چل جائے گا ———!"

ابن زیاد:۔ "اس سے زیادہ خطرناک اس کی لڑکی لیلےٰ ہے وہ اگر گرفتار نہ ہوئی تو اس بوڑھے کی گرفتاری بھی بے اثر اور بے نتیجہ ہے ———!"

جابر:۔ "بجا ارشاد ہوا۔ یہ اپنی تقریر میں کہہ رہا تھا کہ میں ایک جوان اور ناکتخدا لڑکی کا باپ ہوں۔ میں ہی اسی کا سہارا ہوں۔ میں ہی اس کا وسیلہ ہوں، لیکن راہِ حق

میرا خیال ہے کہ وہ مسلم بن عقیل سے کہیں زیادہ ہمارے لئے خطرناک تھا۔"

ابن زیاد :۔ (حیرت سے) "اچھا! لیکن ہم نے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا!"

جابر :۔ "جی ہاں، وہ دفعتاً نمودار ہوا، اور اس نے ایسی صورت حالات پیدا کردی کہ اگر چند لمحوں کی تاخیر سے موقع واردات پر پہنچتا تو نہ جانے کیسی قیامت برپا ہو جاتی۔ بہت ممکن تھا۔ آج یہ دارالامارۃ سُونا پڑا ہوتا۔ اور ہم جیسے جاں نثار اپنے امیر یعنی آپ پر فدا ہو چکے ہوتے۔"

ابن زیاد :۔ (بہت زیادہ متحیر ہو کر) "یہ تم کیا کہہ رہے ہو! کیا یہ واقعہ ہے؟"

جابر :۔ "یا امیر! یہ ایک حقیقت ہے۔ وہ تو صرف آپ کا اقبال تھا کہ میں اپنے سواروں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ اور ایک لمحہ کی بھی تاخیر کئے بغیر اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے جہاد کی دعوت دے کر ایسی ہولناک فضا پیدا کر دی تھی کہ لوگ جوش سے بے قابو ہو چکے تھے۔ وہ بیتابانہ، ایک مجنونانہ عزم کے ساتھ دارالامارۃ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔"

ابن زیاد :۔ (بہت زیادہ برہم ہو کر) "کون تھا وہ شخص؟"

جابر :۔ "نام نہیں جانتا۔ اس لئے کہ جب سے وہ گرفتار ہوا ہے۔ بالکل خاموش ہے۔ لیکن اس کے انتہائی خطرناک ہونے میں شبہ نہیں۔"

ابن زیاد :۔ اسے ہمارے حضور میں پیش کرو۔"

جابر :۔ لیتا آیا ہوں۔ باہر سپاہیوں کے پہرہ میں کھڑا ہے۔"

ابن زیاد :۔ (چیخ کر) پیش کرو ہمارے سامنے۔"

ذرا دیر میں کئی سپاہیوں کے محاصرہ میں منذر نمودار ہوا۔ منذر کو دیکھ کر ابن زیاد کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ بھونچکا ہو گیا۔ حیرت، استعجاب، غصہ، برہمی، نفرت، اشتیاق اور اضطراب کی کیفیتیں اس پر طاری ہو رہی تھیں۔

ابن زیاد نے منذر کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر برہمی اور غضب

میں قربان ہونے کی تمنا نے مجھے اس سے بھی بے پرواہ کر دیا ہے۔ میں اسے خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ آؤ دوستو! چلو، بڑھو، ہمت کرو۔ اور ابن زیاد کا قصرِ امارت ڈھا دو۔ یزید کی خلافت ختم کر دو۔"

ابن زیاد:۔ "اچھا، بڑے میاں یہ فرما رہے تھے!"

جابر:۔ جی ہاں ــــــ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ جسے دہرانا بے ادبی سمجھتا ہوں۔"

ابن زیاد:۔ "اصل فتنہ یہ بڈھا نہیں ہے۔ اس کی بیٹی لیلیٰ ہے۔ جس طرح بنے اسے گرفتار کرو۔"

جابر:۔ (سرِ تسلیم خم کر کے) "انشاء اللہ حکم والا کی تعمیل بہت جلد ہوگی۔"

ابن زیاد:۔ "بہت جلد کے کوئی معنی نہیں۔ ہم تمہیں چوبیس گھنٹہ کی مہلت دیتے ہیں۔ اس اثناء میں وہ گرفتار ہو جانی چاہئے۔ اگر ناکام رہے تو انعام کی بجائے سزا ملے گی۔ کم سے کم وہی سزا جو اس بڈھے منذر کو دی جائے گی۔"

یہ سن کر جابر لرز اٹھا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

"عالیجاہ! میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا۔ لیکن جو مہلت دی گئی ہے۔ وہ تو بہت کم ہے، بہت کم!"

ابن زیاد:۔ "نہیں بہت زیادہ ــــــ یہ مدت گھٹائی جا سکتی ہے بڑھائی نہیں جا سکتی۔"

جابر:۔ "عالی جاہ ــــــ!"

ابن زیاد:۔ "عالی جاہ کے بچے، بک بک مت کرو کام کرو۔ جاؤ سارے شہر کی ناکہ بندی کر لو۔ ہر محلہ کا محاصرہ کر لو۔ کوئی گھر ایسا نہ ہو۔ جس کی تلاشی نہ لی جائے لیلیٰ بھی چند گھنٹوں کے اندر گرفتار ہو جائے گی۔ وہ ایک عورت ہے ایسی عورت جو کوفہ کی گلیوں، کوچوں اور راستوں سے ناواقف ہے۔ وہ ایک الھڑ اور نادان لڑکی ہے۔ وہ جادوگرنی نہیں ہے کہ غائب ہو جائے۔ وہ ہوا نہیں ہے کہ مثل بوئے گل نکل جائے۔ اور مہکتی ہوئی گزر جائے۔ وہ گوشت پوست

رکھنے والا ایک جسم ہے۔ اسے جانے کے لئے سواری چاہیئے۔ ساتھی اور رفیق چاہیئے۔ اگر شہر کی ناکہ بندی کر لو۔ محلوں کا محاصرہ کر لو۔ گھروں کی تلاشی لو۔ تو وہ کہاں جائے گی؟ یہ کام تمہیں اسی وقت کرنا چاہیئے تھا۔ جب اس بوڑھے کو گرفتار کیا تھا۔ جتنی دیر کروگے۔ اتنے ہی اس کی گرفتاری کے امکانات معدوم ہوتے جائیں گے۔"

جابر:۔"بے شک، امیر نے جو کچھ فرمایا وہ بجا اور درست ہے!"

ابن زیاد:۔"میں تم سے اپنی تدبیروں کی داد نہیں چاہتا ——— تمہاری کوششوں کے نتائج دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو۔"

جابر بہت خوب کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ابن زیاد نے پھر ٹوکا:۔

"دیکھو جابر! اس حقیقت کو پیش نظر رکھو کہ تمہارے مستقبل کا انحصار صرف لیلیٰ کی گرفتاری پر ہے!"

منذر یہ سن کر ہنسنے لگا۔ ابن زیاد نے گھورا اور کہا:۔

"تو ہنستا کیوں ہے بدتمیز ——— ؟"

منذر نے جواب دیا:۔

"مجھے اس بے وقوف شخص جابر پر ہنسی آگئی یہ زندگی کو غیر فانی سمجھتا تھا۔ یہ مجھے موت سے ڈرا رہا تھا۔ اب موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ ہو سکتا ہے مجھ سے پہلے ہی فی النار والسقر ہو جائے۔"

پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

ابن زیاد:۔"گستاخ، بدتمیز ——— خاموش!"

جابر:۔"اجازت دی جائے کہ اس کی گردن ابھی اڑا دوں۔"

ابن زیاد:۔"یہ کام تم سے ہی لیا جائے گا۔ لیکن پہلے اپنا حق ادا کرو ——— جاؤ! جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کرو۔"

جابر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور لیلیٰ کی تلاش میں باہر چلا گیا۔

جابر کے جانے کے بعد ابن زیاد پھر منذر سے مخاطب ہوا:۔

"تمہارے لئے بہتر اور مناسب یہی ہے کہ لیلیٰ کا پتہ بتا دو۔ وعدہ کرتا ہوں۔ اسے کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ بلکہ تم بھی ہر مصیبت سے محفوظ رہو گے۔ ایک مرتبہ پھر تمہیں اور لیلیٰ کو ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ تم دونوں کی خطا معاف کر دوں گا ___ اور موقع دوں گا کہ اپنا رویہ درست کر کے وہ زندگی بسر کرو۔ جو تمہیں بسر کرنی چاہیئے ___ کیوں منذر، کیا اس کے لئے تیار ہو؟"

منذر نے بے پرواہی کے ساتھ کہا:۔

"آپ کی اس نوازش کا شکریہ، لیکن میرا جواب انکار میں ہے۔"

ابن زیاد کے حکم سے منذر جیل پہنچا دیا گیا۔

باب ۶۵

مسلم بن عقیلؓ کی شہادت

مسلم بن عقیلؓ ہانی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ ان سے پہلے گرفتار کر لیا گیا۔ مسلم کی جب باری آئی تو گو وہ تن تنہا تھے۔ کوئی یار و مددگار نہیں تھا۔ لیکن غیرت نے گوارا نہ کیا کہ سپاہیوں کا ایک جم غفیر دیکھ کر مرعوب ہو جائیں اور گرفتار ہو جائیں۔ انہوں نے ہتھیار ڈالنے اور اپنے آپ کو جابر کی سپاہ کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ نوبت مقابلہ تک پہنچی۔ وہ ایک تھے اور سامنے مسلح اور خون آشام سپاہیوں کا ایک انبوہ۔ لیکن وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ تلوار سونت لی اور مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ وہ زخمی ہوئے۔ سارا بدن زخموں سے چور اور لہولہان ہو گیا۔ لیکن ان کے تیور میں فرق نہ آیا۔ ان کی تلوار بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ جرأت اور دلیری کے ساتھ حملوں کو روک رہے تھے۔ ان کی تلوار نے کئی آدمیوں کو زخمی کیا اور کئی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ صورت حالات دیکھ کر جابر نے ابن اشعث سے کہا:۔

"کوئی تدبیر کرو۔ ورنہ کام بگڑ جائے گا۔"

ابن اشعث نے مسلم سے کہا:۔

"کیوں اپنی جان ہلکان کر رہے ہیں آپ؟ ہم میں سے کسی کا یہ مقصد نہیں کہ آپ کا خون بہایا جائے۔ نہ ہم آپ کی جان لینا چاہتے ہیں۔ نہ آپ کو کسی طرح کی تکلیف پہنچانا چاہتے ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں۔ کہ ابن زیاد کے پاس چلے چلیں اس

سے گفتگو کریں۔ تبادلۂ خیالات کے بعد جو رائے قائم ہو اس پر عمل کیجئے ـــــــ ہو سکتا ہے کہ ابن زیاد آپ کو قائل کرے اور آپ اس کے ہمنوا بن جائیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ابن زیاد کو قائل کر لیں اور وہ آپ کا ہمنوا بن جائے۔"

مسلم نے تلوار روک لی۔ ابن اشعث نے پھر کہا:۔

"میں آپ کو اپنی طرف سے، جابر کی طرف سے اور ابن زیاد کی طرف سے امان دیتا ہوں۔"

مسلم نے لڑائی بند کر دی۔ تلوار میاں میں کر لی ـــــــ اور اپنے آپ کو ابن اشعث اور جابر کے حوالہ کر دیا۔ جابر کے حکم سے ایک خچر لایا گیا۔ جس پر وہ سوار ہو گئے جب وہ سوار ہو گئے تو چند لوگوں نے جلدی سے تلوار ان کی کمر سے اتار لی۔ مسلم نے ابن اشعث کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"کیا یہ دھوکہ نہیں ہے؟"

ابن اشعث نے جواب دیا:۔

"تلوار کی ضرورت بھی کیا ہے آپ کو؟ نہ ہم لڑ رہے ہیں، نہ آپ۔ میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں۔ کہ مقصد نہ آپ کی جان لینا ہے نہ آپ کو اذیت پہنچانا۔"

مسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور وہ ذرا دیر میں جیل کے اندر پہنچا دیئے گئے دوسرے روز ابن زیاد نے ابن اشعث کو حکم دیا کہ مسلم بن عقیل حاضر کئے جائیں۔ ابن اشعث نے کہا:۔

"وہ ابھی حاضر ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بات عرض کر دوں کہ انہیں اپنی اور آپ کی طرف سے امان دے چکا ہوں۔"[1]

یہ سن کر ابن زیاد جھلا گیا۔ اس نے کہا:۔

---

[1] امان دینے کا اسلام میں ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ اس لئے کہ اسلام خاطیوں کی جان بچانے کے بھی حق میں ہے۔

"تم امان دینے والے کون ہوتے ہو؟ میں نے تمہیں اپنا مختار نہیں بنایا تھا تم نے مجھ سے امان دینے کا حق حاصل نہیں کیا تھا۔"

ابنِ اشعث نے کہا:۔

"یہ تو صحیح ہے کہ نہ میں آپ کا وکیل تھا نہ آپ سے میں نے یہ حق حاصل کیا تھا۔ لیکن یہ جابر موجود ہیں۔ میں نے جو کچھ کیا تھا۔ ان کی مرضی سے کیا تھا۔"

ابن زیاد کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس نے تند اور تلخ لہجہ میں کہا:۔

"جابر کو بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ بہرحال جو میرا جی چاہے گا کروں گا۔ مسلم کو میرے سامنے پیش کرو۔"

ذرا دیر میں مسلم پابجولاں حاضر کر دیئے گئے۔ اس نے انہیں گھور کر دیکھا اور برہمی کے عالم میں پوچھا:۔

"کیا تم ہی مسلم بن عقیلؓ ہو؟"

مسلم بن عقیلؓ:۔ "ہاں میرا نام یہی ہے۔"

ابن زیاد:۔ "کیا تم یہاں اس لئے نہیں آئے ہو کہ حسینؓ ابن علیؓ کے لئے لوگوں سے بیعت لو؟"

مسلم بن عقیل:۔ "ظاہر ہے۔ میرے آنے کا یہی مقصد ہے۔"

ابن زیاد:۔ "تو سن لو۔ اب یہاں سے زندہ اور سلامت واپس نہیں جا سکتے۔"

مسلم بن عقیل:۔ "مجھے موت کا ڈر اور زندگی کا لالچ نہ دو۔ اگر یہ فیصلہ کر چکے ہو کہ امان شکنی کرو۔ اور مجھے قتل کر دو۔ تو تمہارا ہاتھ کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

ابن زیاد:۔ "خدا کی قسم، میں تجھے قتل کر کے رہوں گا۔"

مسلم بن عقیل:۔ "ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر مسرت کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کے راستہ میں شہید کیا جائے۔"

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

میں تمہارے فیصلہ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ جلاد کو بلاؤ۔ اور حکم دو، کہ میری گردن اڑا دے۔"

ابن زیاد :- "تمہاری یہ آرزو بہت جلد پوری ہوگی۔ لیکن اے ابن عقیل! میرے ایک سوال کا جواب دو۔"

مسلم بن عقیل :- "اگر سوال اس قابل ہوا کہ جواب دیا جائے۔ تو ضرور جواب ملے گا۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ابن زیاد :- "کوفہ کے لوگ آپس میں متحد اور متفق تھے۔ تم نے آکر لوگوں میں تفرقہ ڈالا بھائی کو بھائی سے۔ دوست کو دوست سے، عزیز کو عزیز سے جُدا کر دیا۔"

مسلم بن عقیل :- "تمہارا یہ خیال صحیح نہیں۔ وہ کوفہ ہی کے لوگ تھے۔ جنہوں نے از خود ہمیں خطوط لکھے اور ہمارے گھر کو اپنے خطوں سے پاٹ دیا۔ انہوں نے ہمارے پاس اپنے وفود بھیجے اور دھول لے لی ہمارے دروازے کی۔ انہوں نے ہم سے کہا تھا کہ نہ وہ یزید کی خلافت کو قبول کرتے ہیں۔ نہ اس نظام کو مانتے ہیں جو شرع اسلام سے کوئی مناسبت اور تعلق نہیں رکھتا۔ ہم نے ان کی دعوت قبول کر لی اور چلے آئے۔"

ابن زیاد :- "لیکن آنے کا مقصد بھی تو ہوگا کچھ؟"

مسلم بن عقیل :- "اگر تم وہ مقصد نہیں جانتے۔ تو کچھ نہیں جانتے۔"

ابن زیاد :- "لیکن بتا کیوں نہیں دیتے؟"

مسلم بن عقیل :- "تم نے لوگوں کا خون بہا کر یہ حکومت قائم کی ہے۔ یزید نے لوگوں کو لالچ دے کر یا ڈرا دھمکا کر خلافت کی مسند پر قبضہ کیا ہے۔"

ابن زیاد :- "یہی سہی۔ لیکن بنے بنائے نظام میں رخنہ ڈالنا کون سی خدمت اسلام ہے؟"

مسلم بن عقیل :- "ٹھیک ـــــــــ اگر تم راہ راست پر چلتے، اگر یزید نے قرآن و سنت نبوی کی راہنمائی میں حکومت کا کاروبار شروع کیا ہوتا تو ہم میں سے ہر

ایک سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ ہم تمہاری حکومت مان لیتے اور یزید کی خلافت تسلیم کر لیتے۔"

ابن زیاد:۔ "تو کیا ایسا نہیں ہے؟"

مسلم بن عقیل:۔ "بالکل نہیں ——— تم احکام شرع کو پامال کر رہے ہو۔ تم نے قرآن کے شعار فراموش کر دیئے ہیں۔ تم نے سنتِ نبویؐ کو بھلا دیا ہے۔ ہم اس لئے آئے ہیں کہ خلافت تم سے چھین لیں۔ اور وہ نظام قائم کریں۔ جو صرف قرآن و سنت پر مبنی ہو۔"

ابن زیاد:۔ (زہر خند کے ساتھ) "تم اسلام کی دعوت دو گے؟ قرآن و سنت کی طرف ہمیں بلاؤ گے؟ ——— خدا کی قسم! میں تمہیں اس طرح قتل کروں گا کہ آج تک زمانۂ اسلام میں کسی اور کو اس طرح قتل نہ کیا گیا ہوگا۔"

مسلم بن عقیل:۔ "بلاشبہ اسلام میں بدعتیں رائج کرنے میں تمہارا کوئی ثانی نہیں۔ تم اسی لئے مسندِ حکومت پر بیٹھے ہو کہ اسلام کو رسوا کرو۔ اور شریعت اسلامی کی توہین کرو۔ تم سے کچھ بھی بعید نہیں ہے تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

ابن زیاد:۔ "اب دیکھ لوگے کہ میں باغیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں!"

مسلم بن عقیل:۔ "یہ زمانہ کا انقلاب ہے کہ تم ہمیں باغی کہہ رہے ہو۔ ہم اگر باغی بھی ہیں۔ تو تمہارے ایک شخص کے۔ ایک ایسے شخص کے۔ جو اسلام کے احکام سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ لیکن تم اسلام کے باغی ہو۔ خدا کے باغی ہو۔ سنتِ نبویؐ کے باغی ہو۔ تم اس کے مستحق ہو کہ تمہاری گردن اڑا دی جائے۔ تم اس کے سزاوار ہو کہ تمہیں زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ تم حکومت، امارت، امامت اور خلافت کے ہرگز اہل نہیں ہو۔ تم خلقِ خدا پر اپنی تلوار کے بل پر مسلط ہو گئے ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ یہ تلوار ہمیشہ تمہارا ساتھ نہیں دے گی، یہ چھین لی جائے گی، یہ توڑ دی جائے گی۔ یہ نکمی ہو جائے گی۔ تم سے پہلے بھی ایسے لوگ نمودار ہوئے ہیں جنہوں نے خدا سے بغاوت کی۔ لیکن ان کا جو انجام ہوا وہ تمہیں معلوم ہے اور

میں بتاتا ہوں کہ تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو ان کا ہوا تھا۔"

ابن زیاد۔ (ہنس کر) میں تمہاری اس پیش گوئی کا منتظر ہوں۔ فی الحال تم میرے اقوال کو عملی جامعہ پہنتے دیکھو لو۔"

پھر ابن زیاد نے بکیر بن عمران کو حکم دیا:۔

"مسلم کو محل کی چھت پر لے جاؤ۔ وہاں ان کی گردن اڑا دو۔"

بکیر بن عمران نے مسلم کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا:۔

"آؤ چلو۔ شہادت کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ تمہیں شہادت کے مرتبے تک پہنچا دیں۔"

مسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ہو لئے۔ یکایک ان کی نظر عمر بن سعد پر پڑی۔ اس سے انہوں نے کہا:۔

تم میرے قرابتدار ہو۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ حضرت امام حسینؓ کو یہاں کے حالات سے مطلع کر دینا۔"

عمر بن سعد نے وعدہ کر لیا کہ یہ پیغام حضرت امام حسینؓ تک پہنچا دے گا۔

اس کے بعد مسلم استغفار کرتے اور درود پڑھتے بکیر بن عمران کے ساتھ قصر کی چھت پر چڑھ گئے۔ وہ کہہ رہے تھے:۔

"یا الہی! ہمارے اور اس قوم کے درمیان تو ہی فیصلہ فرما —— انہوں نے ہمیں دھوکہ دیا۔ ہمیں جھٹلایا۔ ہم سے دغا کی۔"

بکیر نے مسلم کی گردن اڑا دی۔ سر کو ایک رومال میں باندھا اور لا کر ابن زیاد کے سامنے رکھ دیا۔!

باب ۲۶

سر ایک طرف دھڑ ایک طرف

مسلم بن عقیل کا کٹا ہوا سر دیکھ کر ابنِ زیاد بہت خوش ہوا۔ اس نے رومال کھولا۔ اور سر پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے کہا:۔

"مجرم کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔ خدا کی قسم، میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کروں گا۔"

یہ کہہ اس نے زبیر بن الاروح کو طلب کیا۔ اور اس سے کہا:۔

"یہ سر لے کر دمشق جاؤ۔ امیر المومنین کی خدمت میں یہ کٹی ہوئی گردن پیش کرو۔ اور میرا عریضہ بھی ———!"

پھر وہ کاتب کی طرف متوجہ ہوا اور حسبِ ذیل خط لکھوایا:۔

"امیر المومنین یزید کی خدمت میں!

خدا کا شکر ہے۔ جس نے امیر المومنین کے حق کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ اور ان کے دشمنوں کو ہلاک اور برباد کر دیا۔ مسلم بن عقیل نے سازش کا بازار گرم کر دیا تھا۔ کوفہ کے لوگ اس کی سحر بیانی سے متاثر ہو کر بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن میں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے اسے گرفتار کیا۔ اور اس کی گردن اڑا دی۔ ہانی اس کا سب سے بڑا حامی و مددگار تھا۔ اس کا سر بھی قلم کر دیا۔ امیر المومنین کی خدمت میں مسلم بن عقیل اور ہانی کی کٹی ہوئی گردنیں ارسال کرتا ہوں۔ مزید حالات قاصد سے دریافت فرمائے جا سکتے ہیں!"

اتنے میں جابر آتا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ابن زیاد بے تاب ہوگیا۔

ابن زیاد :۔ "جابر! تم آ گئے! ہم کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ کہاں رہ گئے تھے تم؟ لیلیٰ گرفتار ہوئی؟"

جابر :۔ "یا امیر! میں نے ہر جتن کر ڈالا۔ سارے شہر کی ناکہ بندی کر لی۔ ہر محلہ کا محاصرہ کر لیا۔ ہر گھر کی بڑی سختی سے تلاشی لی۔ لیکن"

ابن زیاد :۔ "لیکن کیا؟ ——— کیا لیلیٰ گرفتار نہیں ہوئی؟"

جابر :۔ یا امیر نہیں ——— کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا لیکن بہر حال وہ کوفہ میں نہیں ہے ——— ورنہ ممکن نہ تھا کہ گرفتار نہ ہو جاتی۔"

ابن زیاد :۔ "(برہم ہو کر) وہ کوفہ ہی میں نہیں ہے؟"

جابر :۔ "یا امیر! قطعاً نہیں ہے۔ اس شہر کا کونہ کونہ اور چپہ چپہ میں نے اور میرے جاسوسوں نے چھان مارا۔"

ابن زیاد :۔ "پھر کہاں چلی گئی وہ؟"

جابر :۔ "یہی تو پتہ نہیں چلتا۔"

ابن زیاد :۔ تم جھوٹے ہو۔ وہ یہیں ہے۔ وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی۔ اسے لاؤ۔

جابر :۔ "کاش غلام، امیر کے حکم کی تعمیل کر سکتا۔"

ابن زیاد :۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

جابر :۔ "میں نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔"

ابن زیاد :۔ "یہ جھوٹ نہیں ہے کہ لیلیٰ کوفہ میں نہیں ہے؟ صاف جھوٹ ہے۔ سفید جھوٹ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم نے اسے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہو۔"

جابر :۔ (بیقرار ہو کر) میں نے؟ امیر کے غلام نے؟"

ابن زیاد :۔ "ہاں وہ بہت زیادہ خوبصورت ہے۔ تم نے اسے دیکھا اور دل دے بیٹھے۔ لیکن یاد رکھو۔ وہ تمہیں نہیں مل سکتی۔ وہ تمہاری نہیں ہو سکتی۔ اسے چھپا کر تم اپنی جان سے کھیل رہے ہو۔"

زبیر یہ خط اور ہانی و مسلم کی کٹی ہوئی گردنیں لے کر دمشق کی طرف ایک تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ ابن زیاد بہت خوش تھا۔ اس نے ایک بہت بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔ حاضرین دربار سے خوش طبعی کی باتیں کر رہا تھا۔ یکایک خاموش ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ گویا نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر ابن اشعث سے کہا:-

"وہ بوڑھا منذر کہاں ہے؟"

ابن اشعث نے جواب دیا:-

"جیل خانہ میں محبوس اور مقید ہے۔"

ابنِ زیاد نے حکم دیا:-

"ہماری خدمت میں حاضر کرو۔ ہم چاہتے ہیں۔ آج اس کا بھی فیصلہ کر دیں۔" حکم کی فوری تعمیل ہوئی۔ منذر لایا گیا۔ اور اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

ابن زیاد:- "کیوں اے پیر فرتوت! تو نے کیا سوچا؟"

منذر:- "کوئی نئی بات نہ تھی جس پر غور کرتا۔"

ابن زیاد:- "ہم نے جو مہلت دی تھی۔ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا؟"

منذر:- "صرف ایک فائدہ اٹھایا۔ اب تک زندہ ہوں۔ لیکن زیادہ عرصہ تک یہ فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ میں نے سنا ہے تو نے مسلم بن عقیل کو شہید کر دیا ہے۔ میری روح ان کی خدمت میں جانے کے لئے بیتاب ہے۔ میرے بارے میں بھی جلاد کو حکم دے کہ سر قلم کر دے۔"

ابن زیاد:- "تیری یہ تمنا ابھی پوری ہو گی۔ جابر آتا ہی ہو گا۔ وہ لیلےٰ کو لے کر آئے گا۔ تیرا سر لیلیٰ کی موجودگی میں قلم کیا جائے گا۔ بلکہ تلوار اس کے ہاتھ میں دی جائے گی کہ وہ تیرا سر قلم کرے ــــ تلوار چلانا تو وہ جانتی ہے؟"

منذر:- "ہاں جانتی ہے۔ بہت اچھی طرح۔"

ابن زیاد:- "بس تو یہ کارنامہ اس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ لڑکی باپ کو قتل کرے گی۔ باپ اپنی لڑکی کے ہاتھوں قتل ہو گا!"

جابر :۔ "میں خدائے واحد و قیوم کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

ابن زیاد :۔ "خاموش ——— جو جھوٹ بول سکتا ہے وہ جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے۔"

جابر خاموش ہو گیا۔ منذر مسکرانے لگا۔

ابن زیاد :۔ "دیکھو، میں نہ کہتا تھا۔ کچھ دال میں کالا ہے۔ منذر مسکرا رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ میری ناکامی پر طنز کر رہا ہے۔ اس کا تبسم اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ تم اس کے محرم راز ہو۔ تم نے اس سے لیلےٰ کا پتہ دریافت کر لیا۔ اور اب وہ تمہارے قبضہ میں ہے۔"

جابر :۔ (بے بسی کے ساتھ) "یا امیر یہ بات غلط ہے۔"

ابن زیاد :۔ "تم جھوٹ نہیں بولتے۔ تم نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔ لیکن ہم جھوٹ بولتے ہیں۔ ہم ہمیشہ سے جھوٹ بولتے آئے ہیں۔"

جابر :۔ "غلام کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ غلام کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔"

ابن زیاد :۔ "تمہیں یاد ہے۔ ہم نے کل تم سے کچھ کہا تھا؟"

جابر :۔ "امیر نے بہت کچھ فرمایا تھا۔ اور جو کچھ فرمایا تھا وہ غلام کو اچھی طرح سے یاد ہے۔"

ابن زیاد :۔ "ہم نے کہا تھا اگر تم لیلیٰ کا سراغ نہ لگا سکے۔ تو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا ——— کہا تھا؟"

جابر :۔ "جی ہاں فرمایا تھا۔"

ابن زیاد :۔ "تم لیلےٰ کا سراغ نہیں لگا سکے۔ مانتے ہو؟"

جابر :۔ "جی ہاں، غلام کو اپنی اس خطا کا اعتراف ہے۔"

ابن زیاد :۔ "تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

جابر :۔ "میری جان لینے سے امیر کو کیا فائدہ پہنچے گا؟"

ابن زیاد :۔ "ایک فرض ناشناس افسر کم ہو جائے گا۔"

جابر :۔ "میں نے ساری زندگی اپنے امیر اور آقا کی خدمت میں بسر کر دی۔ کیا اس

کا صلہ یہی ہونا چاہیئے ؟"

ابن زیاد :" یہ ہم جانتے ہیں کہ کس کو کیا صلہ دیں ۔"

پھر وہ بکیر بن حمران کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سے کہا :۔

"جاؤ، منذر اور جابر کی گردنیں ایک ہی وار میں قلم کر دو ۔"

منذر :" میں امیر کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔"

جابر :" مجھ پر رحم فرمایئے ۔ مجھے ایک دن کی مہلت اور دیجئے ۔ وعدہ کرتا ہوں کہ لیلیٰ کو ڈھونڈ لاؤں گا۔ اگر وہ تحت الثرای میں ہوگی تو اسے پکڑ کر لاؤں گا۔ اگر وہ فلک الافلاک پر ہوگی تو بھی میری دسترس سے نہیں بچ سکتی ۔ وہ آئے گی اور امیر کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی خطاؤں کی معافی چاہے گی ۔"

ابن زیاد :" لیکن یہ سب کچھ اب تک کیوں نہیں ہوا ــــــ ؟ گویا خود اقرار کر رہے ہو کہ تم نے اپنا فرض بجا لانے میں کوتاہی کی ؟"

"نہیں ، یہ بات تو نہیں ہے ۔"

"نہ یہ بات ہے ، نہ وہ بات ہے ۔ بات صرف یہ ہے کہ تم قتل کے مستحق ہو ــــــ بکیر کھڑے کیا سن رہے ہو ؟ جاؤ اپنا کام کرو ۔"

بکیر نے سر تسلیم خم کیا ۔ منذر اور جابر کو لے کر باہر نکلا ۔ منذر اب تک مسکرا رہا تھا ۔ جابر کا رنگ فق تھا ۔ منذر نے جابر سے پوچھا :۔

" دیکھا تم نے ــــــ میں نے کیا کہا تھا ؟ جب تم مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے تھے ۔ میں نے کہا تھا خدا اس پر بھی قادر ہے ۔ کہ مجھ سے پہلے تمہاری زندگی ختم ہو جائے ۔ بکیر کے تیور کہہ رہے ہیں ، کہ مجھ سے پہلے وہ تمہاری گردن اڑائے گا ۔ میرا نمبر تمہارے بعد آئے گا ۔ بس اسی مختصر سی زندگی کے لئے یہ ظلم آرائیاں اور جفاکاریاں ہو رہی ہیں ؟ اس احسان فراموش آقا ابن زیاد کے لئے تم نے اپنی آخرت بیچ کر دنیا خریدی تھی ؟ افسوس ، آخرت تو گئی ۔ لیکن دنیا بھی نہ ملی ۔ جاؤ میرے ــــــ دوست الوداع ! ۔ تھوڑی دیر بعد عرش معلیٰ پر ملاقات ہوگی ۔ وہاں بھی تم سزا سے

نہ بچ سکو گے!"

جابر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بکیر کی تلوار نے اسے مرغِ بسمل بنا دیا۔ سر ایک طرف دھڑ ایک طرف۔ اور اس کے بعد منذر بھی مسکراتا ہوا تلوار کے ایک وار میں اس دنیا سے کلمۂ شہادت پڑھتا رخصت ہو گیا۔

باب ۶۷

انوکھی مصیبت

لیلیٰ مکہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی صبا رفتار سانڈنی ریت کے میدانوں، صحراؤں اور ٹیلوں کو پار کرتی رواں دواں منزلِ مقصود کی جانب بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

دوسرے دن صبح کو ایک نخلستان میں آرام کیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ دن کو روپوش رہے اور رات کو سفر جاری رکھے تاکہ کسی دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ یہ احتیاط بلائے جان بن گئی۔ دن گزار کر جب پھر روانہ ہوئی تو چند میل دور جا کر روشنی دیکھی۔ جس کے معنی یہ تھے کہ یہاں کوئی آبادی ہے۔ اب سوال پیدا ہوا، آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے نہیں معلوم یہ کون لوگ ہیں! دوست یا دشمن! اتنے میں محسوس کیا کوئی آ رہا ہے۔ گردن موڑ کر دیکھا تو چند سوار تھے۔ اس نے اپنی سانڈنی کی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ ان لوگوں نے آواز دی۔

"رک جاؤ، آگے بڑھنے کا ارادہ نہ کرو۔"

اس آواز نے دہشت اور سراسیمگی میں اضافہ کر دیا قبل اس کے کہ کوئی فیصلہ کر سکے۔ سوار قریب آ چکے تھے۔ خوش قسمتی سے مردانہ لباس میں تھی، اس لئے اوسان درست رکھتے ہوئے کہا:۔

"تم لوگ کون ہو؟ اور مجھے کیوں تم نے محاصرہ میں لے لیا ہے؟"

سواروں میں سے ایک شخص نے جو ان سب کا سردار معلوم ہوتا تھا کہا:۔

"ہمارے ساتھ چلو۔ وہاں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ اگر تعمیل کروگے، زندگی بچ جائے گی۔ مخالفت کا ارادہ کیا تو یہیں گردن تڑپتی پھڑکتی نظر آئے گی"

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ سوا اس کے کہ خاموشی کے ساتھ ان کے ہمراہ چلنے لگی ——

تھوڑی دیر کے بعد ایک ایسے مجمع میں پہنچی۔ جو خوش باش لوگوں کا مجمع معلوم ہوتا تھا۔ خیمے نصب تھے۔ آگ جل رہی تھی۔ اونٹ کا گوشت بھونا جا رہا تھا۔ لوگ ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی شعر و شاعری سے دل بہلا رہا تھا، کوئی داستان طرازی میں مصروف تھا۔ کسی کو مفاخر پر ناز تھا۔ اور وہ اپنے اسلاف کے سچے اور جھوٹے قصے بیان کر رہا تھا۔ لیکن ان لوگوں کو آتے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔

لیلےٰ، سردار کے خیمے میں پہنچا دی گئی۔ اس نے دیکھا کہ یہ شخص اگرچہ بوڑھا ہے۔ لیکن چہرے پر سختی اور درشتی کی علامتیں بتا رہی ہیں کہ تند مزاج اور سخت گیر قسم کا آدمی ہے۔ ایک عورت بھی موجود تھی۔ جس کی عمر چالیس سال سے کم نہ ہوگی۔ یہ غالباً اس کی بیوی تھی۔ سردار نے اس عورت سے کہا:۔

"سلمیٰ کہاں ہے؟"

وہ بولی:۔

"پاس کے خیمہ میں اپنی سہیلی زینت سے ملنے گئی ہے"

سردار نے ذرا تلخی کے ساتھ کہا:۔

"میں اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتا۔ وہ میری یعنی شیخ قبیلہ کی لڑکی ہے، اسے ادھر اُدھر جانے کی اجازت نہیں۔ جس کو ملنا ہو۔ یہاں آ کر ملے۔ وہ اگر کسی سے ملنا چاہے تو اسے بلایا جا سکتا ہے۔ کیا اس قبیلہ میں کوئی ایسی عورت یا لڑکی بھی ہے۔ جسے سلمیٰ بلائے اور وہ نہ آئے؟ مجھے بھوک لگ رہی ہے"

یہ کہہ کر وہ مسند پر بیٹھ گیا۔ لیلیٰ سے بھی اشارہ کیا کہ بیٹھ جائے۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔

سردار نے کہا:۔

"میرا نام نعیم ہے۔ یہ لوگ میرے ہم قبیلہ ہیں۔ میں ان کا سردار ہوں۔ یہ

عورت جس سے باتیں کر رہا تھا میری بیوی ہے۔ اس کا نام عائشہ ہے۔ سلمیٰ میری بیٹی کا نام ہے۔ ہم لوگ کسی ایک جگہ قیام نہیں کرتے۔ پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں ——— جہاں گھاٹ نظر آجاتا ہے، ڈیرا ڈال لیتے ہیں۔ چند روز وہیں رہتے ہیں۔ پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے دیکھا۔ یہ سب بہت دلیر، جنگجو، بہادر اور نڈر قسم کے لوگ ہیں۔ بڑی بڑی مہمیں سر کر چکے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ لڑیں اور اپنی بہادری کا سکہ جمائیں۔ میں نے سب کچھ بتا دیا۔ کوئی بات نہیں چھپائی اب اسی طرح تم بھی سچ سچ اپنا تعارف کرا دو۔ کون ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ کیا نام ہے؟ ——— اگر غلط بیانی کی تو پکڑے جاؤ گے۔ میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں۔ آدمی کے چہرے سے اور باتوں سے اس کے جھوٹ سچ کو تاڑ جاتا ہوں۔ اگر سچ سچ کہہ دیا تو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ تم مجھے ایک کھرا دوست اور مخلص ساتھی پاؤ گے۔"

یہ باتیں سن کر لیلے کا دم سوکھ گیا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کہہ نہ سکی۔

نعیم :۔ "سوچ کیا رہے ہو؟ کیا نہیں بتانا چاہتے، کون ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو؟"

لیلے :۔ میرا نام عامر ہے مکہ جا رہا ہوں۔"

نعیم :۔ "کہاں سے آ رہے ہو؟"

لیلے :۔ "کوفہ سے آ رہا ہوں۔"

نعیم :۔ "مکہ جانے کا مقصد؟"

لیلے :۔ "وہاں میرے عزیز رہتے ہیں ——— اور ایک سرکاری کام بھی ہے۔"

نعیم :۔ سرکاری کام؟ کیا مطلب؟"

لیلے :۔ "میں ابن زیاد کے لشکر کا ایک سپاہی ہوں۔"

نعیم :۔ (قہقہہ لگا کر) "میں سمجھا تم ملازمت سے بھاگ کر جا رہے ہو؟"

لیلےٰ :- (گھبرا کر) "جی نہیں۔ یہ بات تو نہیں"

نعیم :- "پھر کیا بات ہے؟"

لیلےٰ :- مجھے کام ہے۔ میں ضرورت سے جا رہا ہوں"

نعیم :- "نہیں۔ تم غلط کہتے ہو ——— بہر حال تمہیں چند روز ہمارے پاس رہنا پڑے گا"

لیلےٰ :- (بدحواس ہو کر) "کیا فرمایا مجھے چند روز یہاں رہنا پڑے گا! میرے لئے تو ایک ایک منٹ ایک ایک سال ہو رہا ہے۔ مجھے فوراً وہاں پہنچ جانا چاہئیے"

نعیم :- (مسکرا کر) "تم ہمیں ایک ہونہار نوجوان نظر آتے ہو؟"

لیلےٰ :- "جی ——— !"

نعیم :- "کیا تم شہسواری جانتے ہو۔ گھوڑے پر چڑھ لیتے ہو؟"

لیلےٰ :- "جی ہاں۔ یہ فن مجھے آتا ہے"

نعیم :- "یہ سپہ گری کا فن بھی ضرور آتا ہوگا۔ یہ کمر سے لٹکی ہوئی تلوار بتا رہی ہے کہ واقعی سپاہی ہو"

لیلےٰ :- "جی ہاں، کچھ تھوڑا بہت یہ فن بھی آتا ہے۔ محض حفاظت خود اختیاری کے لئے"

نعیم :- "ہمیں تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ ہمارے جتھے میں شامل ہو جاؤ"

یہ سن کر لیلےٰ پر بجلی گر پڑی۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ نہ اقرار ممکن تھا، نہ انکار کی جرأت تھی۔

نعیم :- "سوچ کیا رہے ہو؟ میاں! یہی زمانہ ہے زندگی سے فائدہ اٹھانے کا مجھے دیکھو بوڑھا ہو گیا ہوں۔ لیکن دم خم وہ ہے کہ جوانوں کے کان کاٹتا ہوں۔ تم جوان ہو کر ڈرتے ہو"

لیلےٰ :- "جی نہیں، ڈرنے کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن ——— !"

نعیم :۔ لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تمہیں یہیں رہنا پڑے گا۔ تم میرے دستِ بازو بن کر رہو گے۔ یہ میرے اہلِ قبیلہ تمہارا بھی اتنا ہی اعزاز و احترام کریں گے۔ جتنا میرا کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے میرا دل تمہاری طرف کھچ رہا ہے! میں تمہیں اپنی اولاد کی طرح رکھوں گا۔ آج کے تیسرے روز ہم ایک بڑی مہم پر جا رہے ہیں ــــــ تم ہمارے ساتھ چلو گے!"

یہ باتیں سن کر لیلے پر عجیب سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اتنے میں سلمیٰ آگئی۔ وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اگرچہ حسین و جمیل نہیں تھی۔ تو بدصورت بھی نہیں تھی۔ لیکن شباب کی آمد آمد نے چہرے پر رعنائی کا غازہ مل دیا تھا۔ اسے دیکھ کر نعیم نے لیلے سے کہا :۔

"یہ ہے میری لڑکی سلمیٰ، یہ بھی فن سپہ گری سے خوب واقف ہے۔ اور میں اسی لئے اسے بہت چاہتا ہوں"

پھر سلمیٰ سے کہا :۔

"بیٹی! یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی خاطر داشت میں کوئی کمی نہ ہونی چاہیئے۔ پاس کے خیمہ میں ان کے رہنے کا انتظام کر دو۔ یہ اب ہمارے پاس رہا کریں گے"

سلمیٰ نے لیلیٰ پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور چپ چاپ پاس کے خیمہ میں اس نئے مہمان کی راحت و آسائش کا بندوبست کرنے چلی گئی۔

اتنی دیر میں سلمیٰ کی ماں عائشہ کھانا لے کر آگئی۔ نعیم نے لیلیٰ سے کہا :۔

"آؤ بیٹے کھانا کھا لو۔ بھوک تو تمہیں بھی خوب لگ رہی ہوگی۔ میرا تو آج برا حال ہے۔ صبح کا نکلا اب لوٹا ہوں ــــــ آؤ"

یہ کہہ کر وہ بڑے بڑے لقمے توڑنے لگا۔

لیلیٰ کی بھوک اگرچہ اس مصیبت میں پھنسنے کے بعد مر چکی تھی۔ لیکن چار و ناچار اسے بھی نعیم کا ساتھ دینا پڑا۔ نعیم بار بار ٹوکتا۔ اور زبردستی کھانے کی چیزیں اس کی

طرف بڑھاتا تھا۔ یہ کھاؤ۔ یہ چکھو“

کھانے کے بعد نعیم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا:۔

”شب بخیر ——— انشاءاللہ صبح ملاقات ہوگی ——— بیٹی سلمیٰ! مہمان کو اس کے خیمہ میں پہنچا دو“

باب ۶۸

لگاوٹ کی باتیں

لیلے، سلمیٰ کے ساتھ اپنے قید خانے یعنی نعیم کی مہمان سرا میں پہنچی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا۔ چھوٹا سا خیمہ ہے۔ لیکن بہت صاف شفاف اور آراستہ پیراستہ، ایک کونے میں بستر لگا تھا۔ دوسری طرف ایک ٹھلیا میں پانی رکھا تھا۔ سلمیٰ نے کہا:۔

"یہ ہے آپ کا خیمہ، اب آپ آرام فرمائیے۔"

لیلے نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:۔

"آپ نے تو اتنی ذراسی دیر میں اس خیمہ کو اچھا خاصا گھر بنا دیا۔"

سلمیٰ مسکرانے لگی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

لیلیٰ کو اپنی گرفتاری کا بڑا دکھ ہوا۔ کچھ ہنسی آرہی تھی، کچھ رونا ــــ ایسے گرداب میں پھنسی تھی۔ جس سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ ایک طرف یہ اندیشہ کہ کہیں ان لوگوں کو شبہ نہ ہو جائے کہ میں مرد نہیں عورت ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو نعیم کی ساری شفقتیں، برہمی اور نفرت میں بدل جائیں گی۔ دوسری طرف یہ دشواری کہ میرا عورت ہونا نہ معلوم ہو تو بھی، یہاں کب تک رہنا پڑے گا؟ اور یہاں رہ کر میں کیا کروں گی؟ میں جلد از جلد مکہ پہنچنا چاہتی ہوں کہ امام حسینؑ کو کوفہ کے حالات سے باخبر کروں۔ ربیع کو ابن زیاد کی حرکتوں سے واقف کروں۔ اور یہاں نعیم صاحب مجھے بیٹوں کی طرح پالنے پوسنے پر تیار ہیں ــــ آخر اس نوازش کا

انجام کیا ہوگا؟"

یہی باتیں سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو سلمیٰ اونٹنی کے دودھ کا پیالہ اور کچھ کھجوریں لئے موجود تھی۔ سلمیٰ نے تبسّم کی بجلیاں گراتے ہوئے کہا:۔

"شاید رات آپ دیر میں سوئے تھے؟"

لیلےٰ:۔ "ہاں نئی جگہ تھی۔ اس لیئے دیر میں نیند آئی ---!"

سلمیٰ:۔ "میں تو بہت سویرے اٹھ جاتی ہوں۔ یہ میرا تمیز اچکرہے اور اس مرتبہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آپ کو بیدار کرکے رہوں گی۔"

لیلےٰ:۔ "لیکن قبل اس کے تم یہ زحمت کرتیں، میں خود اٹھ بیٹھا ---------- اچھا میں ابھی آیا۔"

پھر باہر جاکر اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ اور واپس آکر سلمیٰ کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لیتے ہوئے کہا:۔

"سردار نعیم بھی تو بیدار ہو چکے ہوں گے؟"

سلمیٰ:۔ "کب کے ---- وہ تو اس وقت بارہ کوس نکل بھی گئے ہوں گے۔"

لیلےٰ:۔ "کیا وہ کہیں تشریف لے گئے ہیں؟"

سلمیٰ:۔ "ہاں، کسی مہم پر گئے ہیں اپنے ساتھیوں کو لے کر، وہ تو آپ کو بھی ساتھ لے جانے والے تھے۔ لیکن میں نے کہا وہ گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ تو ہنسنے لگے۔ اماں نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت تھکا ہوا ہے۔ اس پر کہنے لگے۔ ٹھیک ہے۔ اسے سونے دو۔ اب تو وہ ہمارے پاس ہی رہے گا۔

پھر کسی دن لے جائیں گے اسے۔"

لیلیٰ بڑے غور سے سلمیٰ کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے جیسے خواب سے چونکتے ہوئے دریافت کیا:۔

۔ تو سردار نعیم اپنی مہم پر چلے گئے ۔ اور ہمیں چھوڑ گئے ؟ میں ان سے شکایت کروں گا ۔"

سلمیٰ :۔" شکر گزار ہونے کے بجائے الٹی شکایت کریں گے ؛ واہ یہ بھی اچھی رہی !"

لیلےٰ :۔" شکر گزار کیوں ؟ میں بھی بڑا مہم پسند ہوں ۔ اپنی محرومی پر مجھے افسوس ہو رہا ہے ۔"

سلمیٰ :۔" تو کیا ہوا ۔ اگر آج نہ گئے ۔ پھر کبھی چلے جایئے گا ۔ ایسی مہمیں تو روز پیش آیا کرتی ہیں ۔"

لیلےٰ :۔" مہم سے کیا مطلب ؟ کیا ڈاکہ —— ؟"

سلمیٰ :۔" ہاں اور کیا ؟ خانہ بدوش لوگ یہی تو کرتے ہیں ۔ دُور دُور ہمارے ابّا کی دھاک بیٹھی ہے ۔ خلقت ان کا نام سن کر تھرا جاتی ہے ۔"

لیلےٰ :۔ (دل میں بہت زیادہ سہم کر) " یہ تو میں بھی جانتا ہوں ۔ کون ہے جو نعیم کی بہادری اور دلاوری کا کلمہ نہ پڑھتا ہو ۔"

سلمیٰ :۔" اور کیا —— کیا اب آپ نہیں رہیں گے ؟"

لیلےٰ :۔ ہاں بھئی ! رہنا ہی پڑے گا ۔ پہلے تو ارادہ نہیں تھا ۔ لیکن اب تو دِل لگتا جا رہا ہے !"

سلمیٰ :۔" (کچھ کچھ مفہوم سمجھتے ہوئے) پہلے کیوں ارادہ نہیں تھا ۔ اور اب جی کیوں لگتا جا رہا ہے ؟"

لیلےٰ :۔" پہلے ارادہ اس لئے نہیں تھا ۔ کہ لوٹ مار کے کام سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی ۔ اور اب جی یوں لگنے لگا ہے ۔ کہ تمہاری یہ سادہ اور اثر انگیز ۔ باتیں دل کو بھا گئی ہیں ۔"

سلمیٰ شرما گئی ۔

سلمیٰ :۔" لیکن وہ میرا ابن عم ، جمال تو کہتا ہے ۔ میں اسے ذرا بھی اچھی نہیں لگتی ۔"

لیلیٰ :۔ "وہ اندھا ہے۔ بے وقوف ہے، بدقسمت ہے۔"
سلمیٰ :۔ (مسکراتے ہوئے) "ایسا نہ کہیئے۔ اگر کہیں اس نے سن لیا۔ تو غضب ہو جائے گا ــــــ لیکن خیر، اس وقت تو وہ بھی مہم پر گیا ہے۔"
لیلیٰ :۔ "تم مجھے جمال کا نام دے کر ڈراتی ہو؟"
سلمیٰ :۔ "واقعی وہ ڈراونا آدمی ہے۔ نہ جانے کتنے قتل کر چکا ہے۔ غصہ ناک پڑھا رہتا ہے۔ بات بات پر لوگوں سے اُلجھ جاتا ہے۔"
لیلیٰ :۔ "اب تک کسی مرد سے پالا نہ پڑا ہو گا۔"
سلمیٰ :۔ "دانتوں تلے انگلی دبا کر، تو کیا آپ اس سے لڑیں گے؟"
لیلیٰ :۔ "ضرور لڑوں گا۔"
سلمیٰ :۔ "لیکن کیوں لڑیں گے؟ اس نے کیا بگاڑا ہے آپ کا؟"
لیلیٰ :۔ "اس نے تمہاری توہین کی ہے۔ اور میں کسی قیمت پر یہ جرم برداشت نہیں کر سکتا۔"
سلمیٰ :۔ "وہ تو بے مجھے چھیڑا کرتا، چڑایا کرتا ہے، ڈانٹا کرتا ہے۔ حکم چلاتا ہے مجھ پر۔"
لیلیٰ :۔ "پھر بھی میں اس سے نہ لڑوں؟ اب تو مجھے نفرت ہو گئی ہے اس سے۔"
سلمیٰ :۔ "میں خود نفرت کرتی ہوں اس سے!"
لیلیٰ :۔ "وہ ہے اسی قابل ــــــ سلمیٰ! ایک بات پوچھوں بتاؤ گی؟"
سلمیٰ :۔ "ہاں بتا دوں گی۔ پوچھئے، کیا پوچھتے ہیں؟"
لیلیٰ :۔ "تم مجھ سے تو نفرت نہیں کرتی؟ سچ سچ کہنا۔"
سلمیٰ :۔ "نہیں ــــــ آپ تو اچھے لگتے ہیں۔"
لیلیٰ :۔ "مجھے اپنی خوش نصیبی پر ناز ہے۔"
سلمیٰ :۔ "اب آپ بھی چڑانے لگے مجھے؟"
لیلیٰ :۔ "نہیں سلمیٰ، نہ جانے کیا بات ہے؟ تمہاری باتیں سن کر دل تمہاری طرف کھچتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ تم باتیں کرو اور میں سنتا رہوں۔ جی چاہتا ہے تم

پاس بیٹھی رہو اور گردش شام و سحر رک جائے ——— (آہ سرد بھر کر) لیکن
ایک پردیسی کو ایسی باتیں کرنے کا حق نہیں ——!"

سلمیٰ :- "آپ پردیسی کیوں ہونے لگے؟"

لیلےٰ :- "پھر کیا ہوں! ایک پردیسی تو ہوں۔"

سلمیٰ :- "اب تو آپ یہیں رہا کریں گے۔ ابا کہہ رہے تھے۔"

لیلےٰ :- "ہاں کہہ رہے تھے اور رہنے کا میرا جی چاہتا ہے۔ لیکن اس طرح رہنے
سے کیا فائدہ؟"

سلمیٰ :- "پھر کس طرح رہنا چاہتے ہیں آپ؟"

لیلےٰ :- "کاش اس طرح رہوں۔ کہ پھر کبھی نہ جا سکوں۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑ
جائیں۔"

سلمیٰ :- (ہنستے ہوئے) آپ چاہتے ہیں گرفتار کر لیا جائے آپ کو؟"

لیلےٰ :- "ہاں یہی چاہتا ہوں —— چاہتا ہوں۔ مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ اس طرح
کہ پھر کبھی رہائی نہ پا سکوں۔"

سلمیٰ :- (ہنستے ہوئے) "عجیب بات ہے —— اچھا ابا کو آ لینے دیجئے۔ ان سے
کہوں گی وہ کریں گے آپ کو۔"

لیلےٰ :- "وہ تو گرفتار کر چکے، لیکن میں تو کسی اور طرح کی گرفتاری چاہتا ہوں۔"

سلمیٰ :- "نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو خاک نہیں آتا۔"

لیلےٰ :- "اچھا یہ باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ جب تک میں یہاں ہوں، میرے پاس آتی
رہو گی؟"

سلمیٰ :- "دیکھ لیجئے۔ اتنی دیر سے بیٹھی جو ہوں۔ میرا خود جی نہیں چاہتا آپ کے
پاس سے جانے کا۔ آپ کی باتیں واقعی موہ لینے والی ہیں —— لیکن یہ
خیال کیوں پیدا ہوا آپ کے دل میں؟"

لیلےٰ :- "سچی بات تو یہ ہے سلمیٰ کہ اگر یہاں رہوں گا۔ تو صرف تمہارے لئے۔ تمہاری

باتیں سننے کے لئے۔ اگر یہ نعمت مجھے حاصل ہے تو ساری عمر اس در پر گزار دوں گا۔ اور اگر یہ نعمت نہیں ملتی تو پھر ایک دن بھی یہاں رہنا میرے لئے گناہ ہے۔"

سلمیٰ :۔ (ذرا شرماتے ہوئے) "ابا تو آپ سے بہت خوش ہیں۔ رات بڑی دیر تک اماں سے آپ کا ذکر کرتے رہے۔"

لیپلا :۔ "کیا کہتے رہے میرے بارے میں۔ مجھے بھی بتاؤ۔"

سلمیٰ :۔ (ذرا جھینپتے ہوئے) ہم نہیں جانتے۔ وہ خود بتا دیں گے۔"

یہ کہا اور بوئے گل کی طرح خیمہ سے باہر نکلی، چلی گئی۔

باب ۶۹

موقع مل گیا

لیلےٰ، عامر کے نام سے اب باقاعدہ نعیم کی قید میں تھی۔ وہ اس کا بہت زیادہ پاس و لحاظ کرتا تھا۔ لیکن نگرانی بھی اتنی سخت تھی کہ خیمہ سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اگر جاتا، تو یا سلمیٰ اس کے ساتھ ہوتی تھی یا قبیلہ کا کوئی اور شخص۔ نعیم کو اب تک یہ یقین نہیں آیا تھا کہ عامر (لیلیٰ) واقعی اس کے ساتھ رہنے اور اس کا ہاتھ بٹانے پر تیار ہے۔ وہ عامر (لیلےٰ) سے بہت متاثر تھا۔ اس کے حسنِ صورت اور حسنِ سیرت نے اس پر جادو کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ اسے رکنِ خاندان بنا لے۔ سلمیٰ کی اس سے شادی کر دے۔ اور جب اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو سرداری کا عمامہ بھی اس کے سر پر رکھ دے۔ کیونکہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ لے دے کے ایک لڑکی تھی۔ ظاہر ہے اسی کے شوہر کو لڑکا بنایا جا سکتا ہے۔

لیلےٰ نے اس بات کو پہلے ہی دن سے بھانپ لیا تھا۔ اسی لئے اس نے سلمیٰ سے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ سمجھتی تھی۔ جب تک سلمیٰ کی اعانت شریکِ حال نہ ہو۔ اس وقت تک اس جال سے رہائی نہیں مل سکتی اور اسے بہر حال جلد از جلد اس قیدِ بے میعاد سے رہا ہونا تھا۔

نعیم ہر دوسرے تیسرے دن اپنے ساتھیوں کو لے کر کسی مہم پر چلا جایا کرتا۔ اور وہاں سے واپسی میں درہم و دینار سے لدا پھندا واپس آتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد صرف عورتیں ہی عورتیں رہ جاتی تھیں۔ اور وہ بھی اپنے اپنے کام میں لگی رہتی

لیلےٰ :۔ "تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ یہی میں کہنے والا تھا۔ واقعی یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کریں گے؟ آؤ کہیں سیر کر آئیں چل کر۔"

سلمیٰ :۔ لیکن کہاں؟

لیلےٰ :۔ "جہاں تم کہو۔ میں تو یہاں کے راستوں سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں۔"

سلمیٰ :۔ "یہاں سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک اور نخلستان ہے۔ وہاں ایک قبیلہ رہتا ہے۔ اس کے شیخ سے آپ کے اور اس کی لڑکی سے میرے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ ہم دونوں بچپن میں ایک ساتھ کھیلے ہیں۔ چلئے وہاں چلیں۔ بہت دن ہو گئے۔ اس سے ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔"

لیلےٰ :۔ "بڑی اچھی تجویز ہے۔ شام تک واپس آجائیں گے؟"

سلمیٰ :۔ "ہاں، اور کیا۔ بس تھوڑی دیر تو بیٹھنا ہے وہاں۔"

لیلےٰ :۔ "لیکن چلیں گے کیسے؟"

سلمیٰ :۔ "یہ کیوں؟ آپ کے ساتھ جو سانڈنی آئی تھی وہ کیا ہوئی؟"

لیلےٰ :۔ میں کیا جانوں۔ میں تو جس دن سے آیا ہوں یہاں قید ہوں۔ وہ غریب بھی کہیں قید ہوگی۔ یا ممکن ہے سردار نعیم کے ساتھ گئی ہو۔"

سلمیٰ :۔ "نہیں وہ یہیں ہے اور مفت کا کھا کھا کر بہت موٹی ہوگئی ہے۔"

لیلےٰ :۔ "مفت کا تو میں بھی کھا رہا ہوں۔ کیا میں بھی موٹا ہوگیا ہوں؟"

سلمیٰ :۔ "مجھے آپ ویسے ہی نظر آتے ہیں جیسے تھے۔ ممکن ہے کچھ موٹے ہو گئے ہوں۔ لیکن اتنے زیادہ نہیں۔"

لیلےٰ :۔ "لیکن ہمارے یہاں سے باہر جانے پر کوئی اعتراض تو نہیں کرے گا؟"

سلمیٰ :۔ "اعتراض کرنے والا ہے کون؟ پھر بھی احتیاطاً ایک بڑی بی سے کہے دیتی ہوں کہ اپنی سہیلی خدیجہ سے ملنے نخلستان تک جا رہی ہوں۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔"

تھیں۔ ایک سلمیٰ تھی جس پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ اور وہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ عامر (لیلےٰ) کے خیمہ میں صرف کیا کرتی تھی۔ جمال اس کا چچازاد بھائی تھا۔ نہایت تندخو اور بدمزاج۔ اگر لیلےٰ نہ آجاتی تو شاید اس سے سلمیٰ کی شادی ہو جاتی۔ جمال کو سلمیٰ بالکل پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ اس پر حکم چلایا کرتا تھا۔ جلی کٹی بھی سنا دیتا تھا۔ اور کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا تھا۔ اس کے برعکس عامر (لیلیٰ) کا برتاؤ اس کے ساتھ وہ تھا۔ جو ایک عاشق کا اپنے محبوب کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر صورت شکل کے لحاظ سے بھی عامر (لیلےٰ) کو جمال پر کہیں زیادہ فوقیت حاصل تھی۔ لہٰذا لازماً سلمیٰ، جمال کے مقابلہ میں عامر کی طرف کھنچتی تھی۔

ایک روز حسب معمول نعیم اپنی مہم پر گیا ہوا تھا۔ قبیلہ کی عورتیں پانی لینے پاس کے گھاٹ پر، جو یہاں سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہوگا، گئی تھیں، صرف چند بڑی بوڑھی عورتیں رہ گئی تھیں۔ جو اپنے اپنے خیموں میں بیٹھی سوت کات رہی تھیں۔ سلمیٰ کی ماں عائشہ بھی گھاٹ پر گئی ہوئی تھی۔ ان سب کے جانے کے بعد وہ حسب معمول عامر (لیلےٰ) کے خیمہ میں آکر بیٹھ گئی۔ لیلیٰ نے اس سے باتیں شروع کر دیں :-

لیلےٰ :- "آج تو بہت اطمینان سے آرہی ہو۔ جیسے کوئی کام ہی نہیں ہے تمہیں؟"

سلمیٰ :- "بات تو یہی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام پر گئے ہیں۔ قبیلہ کی عورتیں بھی پانی لینے گھاٹ پر گئی ہیں۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا۔ اِدھر چلی آئی۔"

لیلےٰ :- "بہت اچھا کیا —— یہ لوگ کب تک واپس آئیں گے؟"

سلمیٰ :- "مرد تو رات گئے، ورنہ صبح واپس آئیں گے۔ اور عورتیں شام تک واپس آجائیں گی۔"

لیلےٰ :- "پھر اس سنسان جگہ بیٹھ کر ہم کیا کریں گے؟"

سلمیٰ :- "چلیے کہیں سیر کرلیں چل کر ——!"

سانڈنی پر لیلےٰ اور سلمیٰ بیٹھ گئیں۔ اور وہ نخلستان کی طرف ہوا سے باتیں کرتی روانہ ہو گئی۔

راستہ میں دونوں نے پھر باتیں شروع کر دیں ــــ لیلےٰ نے دریافت کیا:۔

لیلےٰ :۔ "یہ تو بتاؤ۔ ہمارے بارے میں تمہارے ابّا اور امّاں میں کیا باتیں ہوتی ہیں؟"

سلمیٰ :۔ "اونہہ جیسے یہ کچھ جانتے ہی نہیں۔"

لیلےٰ :۔ "جانتا تو ہوں۔ لیکن تم سے سننا چاہتا ہوں۔ اس میں لطف ہی اور ہے۔"

سلمیٰ :۔ "تو ہم نہیں سناتے۔"

لیلےٰ :۔ "یہ کس لئے؟ تم نہیں چاہتیں کہ مجھے خوشی ہو؟"

سلمیٰ :۔ "لیکن ایک ہی بات بار بار دہرانے سے کیا حاصل؟"

لیلےٰ :۔ "قندِ مکرر کا لطف تو تم نے سنا ہی ہوگا۔؟"

سلمیٰ ہنسنے لگی۔

لیلےٰ :۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی تاریخ بھی مقرر ہوئی۔ قران السعدین کی؟ یعنی ہمارے تمہارے ملاپ کی؟"

سلمیٰ :۔ (آنکھیں نیچی کر کے مسکراتے ہوئے) "ہاں ہو گئی رات ہی کو ہوئی ہے۔"

لیلےٰ :۔ (بیتابی کے ساتھ) "وہی تو پوچھنا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کون سی تاریخ مقرر کی ہے انہوں نے؟"

سلمیٰ :۔ "وہ خود بتا دیں گے۔ آپ مجھ سے اس طرح کی باتیں نہ پوچھا کیجئے۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے آپ کو؟"

لیلےٰ :۔ "تم میری جگہ ہوتیں تو مجھ سے کہیں زیادہ بے تاب و بے قرار ہوتیں میں تو پھر صبر و ضبط سے کام لیتا ہوں۔"

سلمیٰ :۔ "جی ہاں، بڑے صابر، خوب معلوم ہے آپ کی حقیقت ــــ باتیں نہ بنائیے۔"

لیلےٰ :۔ "بہت اچھا۔ بالکل باتیں نہیں بناؤں گا ــــ لیکن یہ خوشخبری سنا دو کہ کون سی تاریخ مقرر ہوئی ہے ہماری شادی کی؟"

سلمیٰ :۔ "مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، شاید اگلے مہینے کی دس۔"

لیلے :۔ "اتنا انتظار نہیں ہو سکتا۔ میں یہ تاریخ بدلواؤں گا۔"

سلمیٰ :۔ "کہیں بدلی نہ ہو۔"

لیلے :۔ "دیکھ لینا، آخر اگلے مہینے میں کیا دھرا ہے۔ اسی مہینہ کی کوئی تاریخ کیوں نہیں؟"

سلمیٰ :۔ "اب میں کیا جانوں؟ اچھا ہاں ایک بات تو سنیئے :۔"

لیلے :۔ "فرمایئے، کیا ارشاد ہے؟"

سلمیٰ :۔ "خدیجہ کو اشعار بہت پسند ہیں۔"

لیلے :۔ "تو میں کیا کروں؟ اشعار کوئی پھل یا ترکاری تو ہیں نہیں کہ پلو میں باندھ کر ساتھ لیتا چلوں اور تم اپنی سہیلی صاحبہ کی خدمت میں پیش کر دو۔"

سلمیٰ :۔ "ان باتوں سے کام نہیں چلنے کا۔ میں نے ایک دفعہ آپ کو گنگناتے سنا تھا اس کے یہ معنی ہیں کہ یا آپ شاعر ہیں ورنہ دوسرے شاعروں کا کلام گا کر پڑھ سکتے ہیں۔ کوئی بات بھی ہو ہمارا کام بن جائے گا۔"

لیلے :۔ "تو گویا مجھے، خدیجہ کے سامنے گانا پڑے گا؟"

سلمیٰ :۔ "ہاں تو کیا ہے؟ کیا شرم آئے گی آپ کو اپنا کلام یا گانا سناتے؟"

لیلے :۔ "کیوں نہیں آئے گی؟ کیا تم نے مجھے بے شرم سمجھ رکھا ہے؟"

سلمیٰ ہنسنے لگی۔ پھر بولی :۔

"بہر حال میں نے پہلے سے کہہ دیا ہے۔ وہاں ٹال مٹول کی کوشش نہ کیجئے گا۔ میں چاہتی ہوں۔ وہ بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہو۔ بلکہ جلے۔"

لیلے :۔ "یہ کیا؟ تم یہ بھی چاہتی ہو کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو۔ اور یہ بھی چاہتی ہو کہ مجھے دیکھ کر جلے۔ یہ کیا بات ہوئی بھئی!"

سلمیٰ :۔ "خوش تو اس لیے ہو گی کہ آپ جمال سے کہیں زیادہ بھلے ہیں۔ اور جلے گی اس پر کہ آپ ہمارے قبیلہ میں پہنچنے کے بجائے اس کے قبیلے میں کیوں نہ پہنچ گئے۔"

لیلےٰ :۔ (ہنستے ہوئے) واہ یہ بھی خوب رہی ــــ اچھی بات ہے۔ چلو اسے خوش بھی کریں گے اور جلائیں گے بھی ــــــ یہ سامنے جو نخلستان نظر آ رہا ہے۔ یہیں تو ہمیں جانا ہے؟"

سلمٰی :۔ "ہاں آ گئے۔ بس یہی ہے۔ وہ دیکھئے خدیجہ ــــــ!"

باب ۷

خداوہ دن کرے اس سے جو میں یہ بھی کہوں وہ بھی!

سلمیٰ، عامر کے روپ میں سلمیٰ کی آنکھیں بچا کر اور اسے نخلستان پہنچا کر مکہ پہنچ گئی۔ بڑی برق رفتاری کے ساتھ اس نے یہ راستہ طے کیا۔ وہ زینب سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے کے لئے سراپا اضطراب بنی ہوئی تھی ؂

میرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوہ ہجراں
خداوہ دن کرے اس سے جو میں یہ بھی کہوں وہ بھی!

وہ مکہ پہنچی۔ لیکن فضا کچھ بدلی بدلی سی نظر آئی —— ایک قسم کا سناٹا، ایک افسردہ کن اضمحلال، یہاں پہنچ کر جو خوشی ہونی چاہیئے تھی۔ وہ نہیں ہوئی۔ دل خواہ مخواہ بیٹھا جا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ کیا ماجرا ہے۔ حرمِ کعبہ میں پہنچی، (وہاں نماز پڑھی)۔ نماز کے بعد ایک حلقہ میں پہنچی۔ جہاں لوگ بیٹھے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ایک شیخ کہن سال نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا:۔

"ہا، کیسا زمانہ آگیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے پردہ فرمائے ابھی پچاس برس بھی نہیں گزرے۔ اور اسلام کی بیخ کنی کی تدبیریں اور تحریکیں شروع ہو گئیں۔"

ایک اور آدمی نے کہا:؂

"نورِ حق شمعِ الٰہی ہے بجھا سکتا ہے کون!
جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون!"

ایک اور آدمی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:-

"حد ہو گئی۔ اب اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ یہ لوگ سبطِ رسولؐ۔ جگر گوشۂ بتولؑ اور فرزندِ مرتضیٰؑ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔"

اسی پہلے شخص نے کہا:-

"لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ لوگوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ مسندِ خلافت پر وہ لوگ قابض ہیں جو اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جن کے دور میں فسق و فجور عام ہے محرکات کا ارتکاب علانیہ ہوتا ہے۔ امرِ حق کی پیروی نہیں کی جاتی باطل کا چرچا عام ہو گیا ہے۔ لوگ اس حکومت سے، ان حکمرانوں سے، ان لوگوں سے بیزار ہو چکے ہیں، متنفر ہو چکے ہیں!"

ایک اور شخص نے سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا:-

"ہاں، اور یہ فخر کوفہ کے لوگوں کو حاصل ہے۔ کہ انہوں نے اس غیر اسلامی حکومت کے خلاف اپنے آپ کو منظم کیا۔ اور اب کفن سر سے لپیٹ کر امام حسینؑ علیہ السلام کی زیر قیادت میدانِ جہاد میں اتر رہے ہیں۔"

لیلے (عامر) خاموشی کے ساتھ یہ باتیں سن رہی تھی۔ ان باتوں سے وہ کوئی قطعی رائے تو نہ قائم کر سکی۔ لیکن فکر و تشویش کی ایک لہر پیدا ہو گئی۔ اس نے شیخ کہن سال سے عرض کیا:-

"اگر اجازت ہو تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ امام حسین علیہ السلام کہاں ہیں؟"

شیخ نے تیوری چڑھا کر اور مشکوک نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا:-

"کیا کرو گے ان کا پتہ پوچھ کر؟ تم کون ہو؟ یہ سوال کس مقصد کے ماتحت کر رہے ہو۔؟ اس سے پہلے تو ہم نے تم کو یہاں نہیں دیکھا۔"

لیلے:- "جی ہاں! میں ایک مسافر ہوں اور اجنبی بھی، لیکن بحمداللہ کہ مسلمان ہوں۔ اور اپنے اسلام پر مجھے فخر ہے۔ میں کوفہ سے آرہا ہوں۔ اور ایک اہم ضرورت کے سلسلہ میں حضرت امام سے ملنا چاہتا ہوں۔"

شیخ :- (زہر خند سے) "تم کوفہ سے آرہے ہو؟ کیوں جی؟"

لیلے :- "جی ہاں، وہیں سے آرہا ہوں"

شیخ :- "لیکن تمہیں، یہ نہیں معلوم کہ امام حسینؑ کہاں ہیں؟ بہر حال تم دوست ہو یا دشمن اس سے بحث نہیں۔ مگر اب یہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں کہ حضرت امام کوفہ تشریف لے گئے ہیں"

لیلے :- "وہ کوفہ تشریف لے گئے؟ (اضطراب کے لہجہ میں) غضب ہوگیا، کب گئے وہ؟"

شیخ :- "انہیں گئے آج تیسرا دن ہے ـــــ لیکن تمہیں ان کے اس مبارک سفر سے تکلیف کیوں ہوئی ہے؟"

لیلے :- "اب کہ وہ تشریف لے جا چکے ہیں۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے"

شیخ :- "عجیب آدمی ہو۔ کوئی بات ٹھکانے کی کرتے ہی نہیں۔ آخر اس قدر ـــ پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ـــــ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اہلِ کوفہ کی دعوت رَد کر دیں، نہ جائیں؟"

لیلے :- "ہاں، میں اسی لئے آیا تھا"

شیخ :- "جزاک اللہ! بجائے اس کے کہ ایک کارِ خیر میں ان کا ساتھ دیتے۔ ایک نیک کام سے انہیں روکنے آئے تھے؟ ـــــ یہ جوان ہیں۔ اور اب جوانوں کا حوصلہ یہ رہ گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب قربِ قیامت کی علامتیں ہیں۔ میاں صاحبزادے! تمہیں لشکرِ امام کا سپاہی بننا چاہیئے تھا۔ نہ کہ سنگِ گراں کی طرح حائل ہونے پہنچ گئے۔ جاؤ، اپنا کام کرو"

ان باتوں نے لیلیٰ کے اضطراب میں اور زیادہ اضطراب پیدا کر دیا۔ اس کی ساری محنت اکارت گئی۔ آخر اس نے پوچھا :-

"حضرت امام کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ ربیع! کیا وہ بھی ان کے

ساتھ گیا ؟"

شیخ :۔ "کیسی باتیں کرتے ہو میاں صاحبزادے ! گیا نہیں تو بیٹھا ہے یہاں ؟"

ایک دوسرے شخص نے لیلےٰ کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا :۔

"وہ کوفہ سے آیا اسی لئے تھا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جائے !"

شیخ کہن سال نے پھر لیلیٰ پر چوٹ کی :۔

"نوجوان ایسے ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ہونا چاہیئے ہمارے نوجوانوں کو بخدا جب ریبع کا جوش اور ولولہ یاد آتا ہے تو میرے بدن میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے۔ کتنا قابلِ رشک ہے اس کا جوشِ شہادت اور شوقِ غزا۔ کاش میں بھی اس قابل ہوتا کہ اس کے ساتھ جا سکتا۔ لیکن بڑھاپا —— !"

یہ کہتے کہتے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

لیلےٰ نے سوچا۔ اب یہاں ٹھہرنا بیکار ہے۔ وہ ان لوگوں سے رخصت ہو کر چلی آئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اب اسے کوفہ واپس جانا چاہیئے۔ یہ سوچ کر باہر آئی۔ سانڈنی کو لے کر کارواں سرا میں پہنچی۔ اور وہاں ٹھہر گئی۔ سانڈنی اتنی لمبی منزل مار کے آئی تھی کہ اب پھر اس سے بڑی منزل پر لے چلنا ظلم کرنا بھی تھا۔ اور ناممکن بھی۔ کم از کم ایک دن اور ایک رات آرام ملنا چاہیئے۔ کاروانِ سرا میں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ایک قافلہ کے ساتھ آج ہی کوفہ سے یہاں پہنچے تھے۔ لیلیٰ نے سوچا لوگوں سے گفتگو کرنی چاہیئے۔ شاید کارواں سے امام کا کچھ سراغ لگے۔ ان لوگوں کا ایک جتھ اس کے سامنے ہی کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ لیلےٰ کو ان سے کچھ پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس لئے کہ یہ لوگ خود ہی اس موضوع پر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"بھائی ابوذر ! میرا تو یہاں جی نہیں لگتا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی اس حماقت پر افسوس آتا ہے کہ یہاں کیوں چلا آیا۔ کیوں نہ کاروانِ اسلام کے ساتھ کوفہ کی طرف واپس چلا گیا۔"

ابوذر :۔ "ریحان بھائی! کہتے تو ٹھیک ہو۔ جی تو میرا بھی یہی چاہ رہا تھا۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ آنا پڑا۔ اور اب یہاں بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ کل ہی دمشق روانہ ہونا ہے۔"

ریحان :۔ "تم جاؤ۔ میں تو کوفہ واپس جاتا ہوں۔"

ابوذر :۔ "عقل کے ناخن لو۔ وہاں جا کر کیا کر لوگے؟"

ریحان :۔ "جو کچھ بھی ہو سکے گا ——— میرے آنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ امام عالی مقام کو کوفہ جانے سے روکوں۔ مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد کوفہ کے لوگ بالکل بدل گئے ہیں۔ حضرت امام کے ساتھ غداری کی گئی ہے۔ کوفہ میں اب کوئی ایسا نہیں ہے۔ جو ان کا ساتھ دے۔ اب جنگ ہو کر رہے گی۔"

ابوذر :۔ "تو تم کیا کروگے؟"

ریحان :۔ "امام عالی مقام کا ساتھ دوں گا۔ خواہ اس راستہ میں جان سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑیں۔ یقیناً جس مختصر سے کارواں کو دور سے ہم نے کوفہ کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں دیکھا تھا۔ وہ کاروانِ امام ہی تھا! ۔

لیکن تم اپنی ضد پر اڑے رہے کہ یہ کاروانِ تجارت ہے۔"

ابوذر :۔ "ہاں غلط فہمی ہوگئی۔ بہر حال اب کیا کیا جا سکتا ہے؟"

ریحان :۔ "تم دمشق جاؤ۔ میں کوفہ واپس جاتا ہوں۔"

ابوذر :۔ "یہ بڑا احمقانہ فیصلہ ہے۔ اکیلے جا کر کیا کروگے؟"

ریحان :۔ "بحث نہ کرو۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر بحث نہیں کرنی چاہیئے۔ تم میری پونجی امانت رکھو اگر زندہ آیا تو لے لوں گا کام آیا تو تم مالک ہو۔"

لیلےٰ ان باتوں کو سنتی رہی۔ پھر جب اس گفتگو کے خاتمہ کے بعد یہ مجلس برخاست ——— ہوئی تو لیلےٰ نے ریحان سے کہا :۔

"میں بھی کوفہ جانا چاہتا ہوں۔ اور اسی مقصد سے جو آپ کا ہے۔ آپ

کب روانہ ہوں گے۔ تاکہ میں بھی ایک رفیق کی حیثیت سے آپ کے ساتھ چلوں ــــــ؟"

ریحان نے اچٹتی سی ایک نظر ڈالی اور کہا :-

"صبح کی نماز پڑھ کر یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ اگر ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں!"

باب ۷۱

نیا ساتھی

لیلیٰ (عامر) کو ایک اچھا ساتھی مل گیا۔ ریحان نے ایک دلآویز اور سحر طراز رفیقِ سفر پالیا۔ دونوں کوفہ کی طرف رواں دواں جا رہے تھے ——— ریحان نے لیلیٰ سے سلسلۂ کلام کے دوران میں کہا:-

"تمہاری باتیں تو خیر اچھی ہیں۔ لیکن شخصیت بھی اتنی سحر آفریں ہے کہ دل خودبخود تمہاری طرف کھنچتا ہے"

عامر:- (لیلیٰ) مسکرا کر "شکریہ اس عزت افزائی کا ——— کہیں عشق نہ فرمانے لگئے گا۔ اس خاکسار سے؟"

ریحان:- "کاش تم عورت ہوتیں"

عامر:- "تو کیا کرتے تم؟"

ریحان:- "پھر میں عشق کرتا۔ اور میرے عشق کی ساری دنیائے عرب میں دھوم مچ جاتی۔ لوگ جمیل و شبینہ اور لیلیٰ مجنوں کے افسانے فراموش کر دیتے۔ تمہاری شان میں اشعار کہتا۔ تمہارے حاصل کرنے کی راہ میں جو رکاوٹیں پیش آتیں انہیں نوکِ خنجر سے دور کرتا اور بالآخر تمہیں حاصل کر کے رہتا"

عامر:- "مجھے ہمدردی ہے آپ کے ساتھ، بہر حال میں عورت نہیں ہوں"

ریحان:- "یہی تو کمی ہے تم میں؟"

عامر :۔ "ہاں ۔ یہ کمی تو میں بھی محسوس کرتا ہوں ۔ خاص طور پر اس وقت جب عرب کی دوشیزائیں مجھ پر عاشق ہوتی ہیں ۔"

ریحان :۔ "یہ کیا کہا تم نے ! یعنی جب دوشیزگانِ عرب تم پر محبت کی کمند پھینکتی ہیں تو بجائے اس کے کہ خوش ہو افسوس کرتے ہو کہ عورت کیوں نہیں ہوئے ؟"

عامر :۔ "ہاں ، یہی بات ہے ۔"

ریحان :۔ "حیرت ہے ———— اس جذبہ کی بنیاد کیا ہے ۔ میں نہیں سمجھ سکا !"

عامر :۔ "بات یہ ہے کہ چاہا جانا اتنا پُر لطف نہیں ہوتا ۔ جتنا چاہنا !"

ریحان :۔ "تو تم کسی لڑکی سے محبت نہیں کرتے ؟"

عامر :۔ "نہیں آج تک تو ایسا اتفاق پیش نہیں آیا !"

ریحان :۔ "لیکن تم سے تو کئی لڑکیوں نے محبت کی ہو گی !"

عامر :۔ "ہاں ، نہ جانے کتنی موت و زیست کی کش مکش میں اب تک گرفتار ہیں میرے لئے ۔"

ریحان :۔ "ترس نہیں آتا ان پر ؟"

عامر :۔ "کسی پر نہیں آیا سوا ایک کے ۔"

ریحان :۔ "وہ کون خوش قسمت لڑکی ہے بھائی ؟"

عامر :۔ "اس کا نام سلمیٰ ہے ———— وہ محبت کی بھوکی ہے ۔ اس لئے بے پناہ طور پر اپنی محبت کا خزانہ لٹاتی رہتی ہے ۔

ریحان :۔ "بہت خوبصورت ہو گی وہ تو ؟"

عامر :۔ "بہت زیادہ تو نہیں ۔ لیکن بہر حال اس قابل ضرور ہے کہ اس سے محبت کی جائے ۔ وہ وفادار ہے ، سلیقہ مند ہے ۔ خوش ادا ہے ۔"

ریحان :۔ "بڑے سنگ دل ہو ۔"

عامر :۔ "تو تم کرنے لگے اس سے محبت، یقیناً وہ تمہاری محبت کا خیر مقدم کرے گی۔ مجھ سے تو مایوس ہو چکی ہے "

ریحان :۔ "مجھے تو اس نے دیکھا بھی نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف ہیں۔ پھر کیونکر یہ بیل منڈھے چڑھ سکتی ہے ؟"

عامر :۔ میں اس سے ذکر کروں گا اور اسے آمادہ کروں گا۔ اس سے کہوں گا۔ کہ ہمارے ایک دل پھینک دوست ہیں۔ وہ محبت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اجازت دو۔ تو یہ کام شروع کر دیں۔

ریحان :۔ (ہنستے ہوئے) "جی بخشئے مجھے تو اپنی سلمیٰ سے ؟"

دونوں خاموش ہو گئے۔ اور دونوں کی سانڈیاں ہوا سے باتیں کرتی منزل مقصود کی طرف بڑھنے لگیں۔ اب دن ختم ہو چکا تھا۔ اور رات کی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ لیکن کوئی اندیشہ اس لئے نہیں تھا کہ ریحان راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ایک تجربہ کار رہبر کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ریحان نے عامر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا :۔

"وہ دیکھو سامنے جو ہلکی ہلکی مدھم مدھم روشنی نظر آ رہی ہے۔ وہیں ہم رات کو قیام کریں گے۔

عامر :۔ لیکن قیام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ چلے چلو یونہی بڑھتے ہوئے۔ جلد از جلد کوفہ پہنچنا چاہیئے "

ریحان :۔ "خود میرا یہی خیال تھا لیکن کیا کروں۔ سانڈنی بہت تھکی ہوئی ہے۔ اور پھر یہ گھُپ اندھیرا، صرف ہم دو آدمیوں کا رات میں سفر کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔ پورا کارواں ساتھ ہوتا تو ایک بات بھی تھی "

عامر :۔ "لیکن یہ لوگ کون ہیں جہاں ٹھہرنے کا ارادہ کر رہے ہو ؟"

ریحان :۔ "یہ بئیر یوسف ہے۔ یہاں کوئی مستقل بستی نہیں ہے۔ خانہ بدوش قبیلے پانی اور چارہ کی تلاش میں آتے ہیں۔ دس بیس دن رہتے ہیں۔ پھر کسی طرف نکل جاتے

ہیں۔ میں جب کوفہ سے مکہ جاتے ہوئے گزرا تھا تو ہمارا کارواں یہاں ایک دن تک ٹھہرا تھا۔ اور ان لوگوں نے بڑی شرافت کے ساتھ ہماری خاطر مدارت کی تھی۔ اچھے لوگ ہیں۔ بلکہ ان کے شیخ قبیلہ سے اچھے خاصے مراسم ہو گئے تھے۔ اطمینان سے آج کی رات رہیں گے، اور صبح ہوتے ہی چل دیں گے۔"

عامر :۔ "نہیں مانتے تو مجبوری ہے۔ خیر یہی سہی۔"

ریحان :۔ "اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ ابھی پہنچ جاتے ہیں۔ تم بھی مسلسل سفر سے تھک گئے ہو گے۔ ذرا آرام کر لو۔"

عامر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہیز یوسف قریب آگیا۔ خیمے نظر آنے لگے۔ اگرچہ رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سوتا پڑ گیا ہے۔ عامر نے کہا:۔

"سناٹے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ سو گئے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں جانا مناسب ہو گا؟"

ریحان :۔ "اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔ آدھی رات کو بھی اگر مہمان آ جائے تو ان کی پیشانی پر بل نہیں آتا ——— ذرا بھی فکر نہ کرو۔"

اب یہ لوگ بالکل خیموں کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ریحان ذرا گھبرایا اُس نے کہا:۔

"کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے خدا خیر کرے!"

عامر :۔ "کیا ہوا! گڑبڑ کی وجہ کیا ہے؟"

ریحان :۔ "یہ تو وہ لوگ نہیں معلوم ہوتے۔ اُن کے خیمے اور طریقے کے تھے۔ یہ اور طریقے کے ہیں۔"

عامر :۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ چلے گئے۔ جن سے تم ملے تھے۔ یہ کوئی اور لوگ ہیں۔"

ریحان :۔ یقیناً یہی بات ہے۔"

عامر :۔" پھر اب کیا ہوگا ــــــــــ؟ نہ جانے یہ کون لوگ ہوں؟ ہمیں اپنے ہاں ٹھہرانا پسند کریں یا نہ کریں؟ آج کل زمانہ بڑا نازک ہو رہا ہے۔ دوست دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہے۔"

ریحان :۔" لیکن کریں کیا؟ سانڈنی تو بالکل بے حال ہو چکی ہے۔ اندھیرے میں راستہ بھول جانے کا بھی اندیشہ ہے۔ یہ خواہ دوست ہوں یا دشمن، ٹھہرنا ہمیں پڑے گا۔"

عامر نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سامنے سے چند آدمی آتے دکھائی دیئے۔

عامر :۔" یک نہ شد دو شد۔ اب پھنسے۔ دیکھتے ہو یہ لوگ اسی طرف آرہے ہیں۔"

ریحان :۔" ہاں بھئی! دیکھ تو رہا ہوں۔ لیکن کیا ضروری ہے۔ کہ کسی بُرے ارادہ سے آتے ہوں؟ ممکن ہے تفتیش احوال کے لئے آرہے ہوں؟"

عامر :۔" ہاں، یہ ممکن تو ہے۔ لیکن پھر یہ مسلح کیوں ہیں؟"

اتنے میں وہ لوگ بالکل قریب آ گئے۔ انہوں نے کسی قسم کی گفتگو کئے بغیر ان دونوں کو محاصرہ میں لے لیا۔ اور تلواریں میان سے نکال لیں۔ پھر ان میں سے ایک آدمی بڑھا۔ اور اس نے پوچھا :۔

" تم کون لوگ ہو؟"

ریحان نے جواب دیا :۔

" ہم مسافر ہیں۔"

وہ شخص بولا :۔

" تو پھر آج کی رات تم ہمارے مہمان ہو۔ سانڈنی پر سے اتر پڑو۔ اور اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارا سردار باہر گیا ہے۔ جب وہ آئے گا۔ تب تمہارا

فیصلہ ہو گا۔"

ریحان:۔ "لیکن ایک عرب سے یہ توقع رکھنی کہ وہ اپنے ہتھیار حوالے کر دیگا۔ اور بغیر دو ایک کی جان لئے ہوئے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیئے پیش کر دے گا، حماقت ہے۔ تم نے تلواریں میان سے نکال لیں ہیں آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر ریحان سانڈنی پر سے کود پڑا۔ عامر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دونوں نے اپنی اپنی تلواریں میان سے نکال لیں۔ وہ شخص بولا:۔

"جانتا ہوں تم بہادر اور شجاع ہو۔ ممکن ہے۔ تمہاری یہ بہادری اور شجاعت تمہیں فائدہ پہنچائے۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ صبح تمہیں سردار کے سامنے پیش کریں گے۔ وہ جیالے اور دلیر نوجوانوں کا قدردان ہے۔ یقیناً تمہارے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے گا ——— رات میں سفر کرنا آج کل ویسے بھی مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آج کی رات یہاں آرام کرو۔ صبح سردار سے مل کر اپنا معاملہ طے کر لینا!"

ریحان:۔ "تو کیا تمہارے سردار کا حکم ہے کہ جو ادھر سے گزرے اسے روک لو، گرفتار کر لو؟"

وہ شخص بولا:۔

"نہیں یہ حکم ہے کہ جو مشکوک نظر آئے اسے گرفتار کر لو۔ تم لوگ ہمارے خیموں کے پاس مشتبہ حالت میں کھڑے تھے۔ ہم دیکھ رہے تھے۔ تم رازدانہ طور سے باتیں کر رہے تھے۔ لہٰذا ہم مجبور ہو گئے کہ تمہیں روک لیں۔ صبح سردار سے مل کر اپنا معاملہ طے کر لینا۔"

"تمہارا سردار کون ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا:۔

"یہ آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ جب آپ ان سے ملاقات کریں گے۔"

"ہم اس پر تو آمادہ ہیں کہ رات یہاں گزاریں۔ اور جہاں تم رکھو رہیں۔ لیکن ہتھیار نہیں دے سکتے، یہ ہماری جان کے ساتھ ہیں۔"

کچھ دیر تک وہ شخص سوچتا رہا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے حاکمانہ انداز میں کہا :-

"کوئی حرج نہیں۔ ان کے ہتھیار نہ لو۔ یہ شریف لوگ ہمارے مہمان ہیں، سامنے والے خیمہ میں انہیں پہنچادو۔ ان کی خاطر داشت کا پورا لحاظ رکھو!"

باب ۴۲

وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا!

ریحان اور عامر دیلمی ایک ہی خیمہ میں مقید کر دیئے گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص ایک طباق میں کھانا لے کر آیا۔ کھانے کے بعد موجودہ صورتِ حال پر گفتگو ہونے لگی۔ ریحان نے کروٹ بدلتے اور عامر کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ تو بُرے پھنسے۔ اب کیا ہوگا؟ نہ جانے یہ لوگ کون ہیں؟ اور ہم سے کِس طرح پیش آئیں؟"

عامر:۔ "اسی اندیشہ کی بنا پر تو کہہ رہا تھا چلے چلو۔ لیکن تمہیں تو سانڈنی کا عشق ستا رہا تھا۔ بیچاری کہیں تھک نہ جائے۔ کہیں اس کے پاؤں میں موچ نہ آجائے کہیں اسے نزلہ و زکام کی شکایت نہ ہو جائے۔ اب مزا کرو۔ دیکھو صبح کیا ہوتا ہے۔ گردن کٹتی ہے یا رہتی ہے۔"

ریحان:۔ "اگر گردن کٹے گی تو راہِ صدق و وفا میں۔ یوں نہیں کٹ سکتی۔ وہ کوئی مولی گاجر نہیں ہے کہ جو چاہے کاٹ لے۔ اسی لئے تو میں نے اپنے ہتھیار نہیں دیئے تھے۔"

عامر:۔ "ہتھیار نہیں دیئے تھے؟ تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اتنے سارے آدمیوں کا ہم تم کیسے مقابلہ کر سکیں گے؟"

ریحان:۔ "عامر تم مرد ہو کر ڈرتے ہو؟ بزدل کہیں کے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں۔ مرد کے بجائے تمہیں عورت ہونا چاہیئے تھا۔"

عامر :- "کوشش کروں گا کہ عورت بن جاؤں۔ پھر دیکھوں گا آپ کی طرف سے کیسی قدردانی ظہور میں آتی ہے۔ لیکن یہ اطمینان دلائے دیتا ہوں کہ اگر تلوار چلانے کا موقع مل گیا تو عامر بھی اس وقت تک گرفتار نہیں ہو سکتا جب تک دو ایک کو موت کے گھاٹ نہ اتار لے۔"

ریحان :- "شاباش! اب تم نے وہ بات کہی جو صرف بہادروں کی زبان سے نکل سکتی ہے۔"

بڑی دیر تک اسی طرح دونوں باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک ایک کرکے دونوں سو گئے۔ صبح ابھی آنکھ ہی کھلی تھی کہ ایک آدمی خیمہ میں داخل ہوا اور اس نے کہا :-

"تیار ہو جائیے۔ سردار تشریف لا رہے ہیں۔"

ریحان :- (کچھ تعجب کے ساتھ) "ایں! سردار تشریف لا رہے ہیں! یعنی ہم لوگ ان کی خدمت میں نہیں پیش کئے جائیں گے؟"

اس نے جواب دیا :-

"جی نہیں۔ وہ خود آ رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اور ریحان و عامر ایک دوسرے کو حیرت اور پریشانی کے ساتھ دیکھنے لگے۔

عامر نے اپنی تلوار ہاتھ میں لے لی۔ اور ریحان کی، اس کی طرف بڑھا دی۔ اتنے میں کچھ چاپ سی محسوس ہوئی۔ دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سردار، قہر و جلال، نفرت و حقارت اور انتقام و غضب کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

یہ نعیم تھا۔

سلمیٰ کا باپ،

جس نے عامر کو بیٹے کی طرح اپنے پاس رکھنا چاہا تھا۔ جس کے حبالہ میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی سلمیٰ کو دے دینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور جسے دھوکا دے کر

عامر بھاگ آیا تھا۔

نعیم گھور کر عامر کو دیکھ رہا تھا اور عامر کی گردن شرم و ندامت سے جھکی ہوئی تھی۔ اور ریحان حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

نعیم نے گرجتی ہوئی آواز میں للکارتے ہوئے کہا:۔

"عامر تو ——— ؟ کیا واقعی تو ایک شریف عرب خاندان کا فرد ہے؟ کیا کوئی عرب اتنا بڑا احسان فراموش، ذلیل اور کمینہ بھی ہو سکتا ہے۔ جتنا تو ہے؟"

عامر سر جھکائے قہر و عتاب کی یہ باتیں سن رہا تھا۔

نعیم :۔ "تجھے میں نے پناہ دی۔ تجھے میں نے وہ مقام دیا۔ جو کسی گھر میں صرف بیٹے ہی کو حاصل ہے۔ لیکن تو نے مجھے دھوکا دیا۔ تو نے میری لڑکی کو بہلائے — فریب کیا۔ تو بھاگ گیا۔ بتا کیا سزا دی جائے تجھے؟"

عامر کی آنکھیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی زبان اب بھی خاموش تھی،

نعیم :۔ "عامر! میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں، جواب دے؟"

عامر :۔ "کیا جواب دے سکتا ہوں۔ سوا اعترافِ خطا کے!"

نعیم :۔ "اس طرح تو اپنی جان بچانا چاہتا ہے۔ اور یاد رکھ۔ کہ نعیم جتنا مہربان دوست ہے۔ اتنا ہی سخت گیر دشمن بھی۔"

عامر :۔ "میں مرنے کو تیار ہوں۔ میان سے تلوار نکال لیجئے اور میری گردن اڑا دیجئے۔ میں اپنا خون معاف کرتا ہوں!"

نعیم :۔ "پھر وہی خوشامد (چیخ کر) کہہ چکا ہوں۔ تو اب زندہ نہیں رہ سکتا ———!"

عامر :۔ "میں بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے زندگی کی بھیک نہیں مانگنی ہے۔ میں نے ایک جرم کیا ہے۔ سچائی کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ اور بہادری کے ساتھ اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

نعیم :۔ "نہیں۔ تو بہادر نہیں بزدل ہے۔"

عامر :۔ کیا بہادری احسان فراموشی کا نام ہے؟ کیا جب یہ کہوں گا کہ آپ جھوٹے

ہیں آپ میرے محسن نہیں ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی۔
تب آپ مجھے سچا اور بہادر مانیں گے؟ اگر یہی بات ہے تو میں اپنے بزدل
ہونے کا اعتراف کرتا ہوں۔"

نعیم :۔ "تو فریبی ہے، دغا باز ہے، ناقابلِ اعتبار ہے۔"

عامر :۔ "بے شک مجھ سے جو حرکت سرزد ہوئی۔ وہ فریب پر مبنی ہے۔ اس میں
دغا بازی کا شائبہ تھا۔ اور جس سے اس طرح کی حرکتیں سرزد ہوں۔ ہرگز اس
پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔"

نعیم :۔ "تو پھر کیا سزا دی جائے تجھے؟"

عامر :۔ "یہ بات آپ بار بار مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟"

نعیم :۔ "اتمام حجت کرنا چاہتا ہوں۔"

عامر :۔ "اتمام حجت کس چیز کا؟ میں نے غلطی کی اور جس مقصد کے لئے میں گیا تھا۔
جب تک وہ حاصل نہیں ہو جاتا ——— بار بار اس طرح کی غلطیاں کروں گا۔
بار بار فریب کاری کا ارتکاب کرنا پڑے گا، بار بار دغا بازی کروں گا۔"

نعیم :۔ (خشمناک لہجہ میں) "اچھا یہ دم خم ہیں تیرے۔؟"

عامر :۔ "اس میں دم خم کا کوئی سوال نہیں ہے صرف ایک امر واقعہ کا بیان ہے۔"

نعیم :۔ "تو نے میرا انتقام نہیں دیکھا ہے۔ تو میرے غصہ سے واقف نہیں ہے۔ اسی
لئے بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا ہے۔ شاید تو یہ سمجھتا ہے کہ میں رحم کر دوں گا۔۔۔۔
معاف کر دوں گا تجھے؟"

عامر :۔ "آپ چاہتے تو یہی ہیں۔ لیکن میں آپ کو ایسا کرنے نہیں دوں گا۔"

نعیم :۔ (بہت زیادہ چراغ پا ہو کر) "تو میری توہین کر رہا ہے کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ
میں تجھ پر رحم کرتے اور تجھے زندہ رہنے دینے پر مجبور ہوں؟"

عامر :۔ "جی ہاں، میرا مطلب یہی تھا۔ لیکن اگر میں غلط سمجھتا ہوں۔ تو بسم اللہ، یہ گردن
حاضر ہے۔ تلوار میان سے نکالئے اور قصہ ختم کیجئے۔"

نعیم :۔ یہی ہوگا۔ تھوڑی دیر صبر کر (ریحان سے مخاطب ہوکر) تو کون ہے ؟

ریحان :۔ ایک خطاکار کا ساتھی، میں عامر کا دوست ہوں۔

نعیم :۔ میں سمجھا، ــــــــ چور کا بھائی گرہ کٹ۔ یقیناً تو بھی ویسا ہی دغاباز، فریبی اور جعل ساز ہوگا۔ جیسا عامر ہے۔ لہٰذا تجھے بھی وہی سزا ملنی چاہیئے جو عامر کے لیئے تجویز ہوئی ہے۔

ریحان :۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ عامر کا بال بھی بیکا نہیں ہوسکتا۔ ہاں میرے بعد جو کچھ بھی ہو۔

نعیم :۔ یعنی تو مقابلہ کرے گا مجھ سے ؟

ریحان :۔ کیوں نہیں کروں گا۔ کون سے ایسے طرم خان ہو کہ تم سے دبل جاؤں ؟ دُو دُو ہاتھ پاؤں تمہارے ہیں، دُو دُو میرے، قوت و طاقت کا جہاں تک تعلق ہے تن تنہا مقابلہ میں آجاؤ۔ تو ابھی اٹھا کر پٹخ دوں۔ فنونِ جنگ پر ناز ہے تو آؤ، ہم تم دونوں تلوار کا حکم مان لیں۔

نعیم :۔ کیا تو نہیں جانتا۔ میرے ساتھ درجنوں آدمی ہیں۔ اور تو اکیلا ہے !

ریحان :۔ خوب جانتا ہوں۔ لیکن ان سب سے لڑنے کو تیار ہوں۔ موت صرف ایک ہی مرتبہ آتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے فیصلہ کرجاتی ہے۔ کہ مرنے والا بہادر ہے یا بزدل ؟ میں بہادری کے ساتھ مرنے کا تہیتہ کرچکا ہوں۔

نعیم :۔ تمہاری یہ ادا ہمیں پسند آئی۔ ہم بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ ہم تمہیں وہ مقام دینا چاہتے ہیں جو عامر کو دیا تھا۔ کہ تم ہمارے پاس رہنا منظور کرتے ہو ؟"

ریحان :۔ میں نہیں جانتا آپ کون ہیں ؟ کیا کرتے ہیں ؟ لیکن اگر آپ اچھے آدمی ہیں تو بھی اپنی مرضی اور خوشی سے تو اس وقت آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتا سفر سے واپسی پر البتہ یہ ممکن ہے۔

نعیم :۔ ہمیں تمہاری بات پر اعتماد ہے۔ ہم جانتے ہیں۔ بہادر آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ جاؤ تم آزاد ہو۔ جس کام سے جارہے ہو۔ اس سے فارغ ہوکر واپس

آجانا۔"

ریحان :۔ "اور عامر کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے؟"

نعیم :۔ "اس کی گردن مار دی جائے گی۔"

ریحان :۔ "تو میں بھی آزاد ہونا نہیں چاہتا۔ پہلے میری گردن اڑائیے۔ پھر عامر کی!"

نعیم :۔ (غصہ کے ساتھ) اگر اس پر اصرار ہے تو یہی سہی۔ کل کا انتظار کرو!"

باب ۳۷

یہ بھی ہوتا ہے

ریحان اور عامر پھر اکیلے رہ گئے ——— !

ریحان نے عامر سے پوچھا:۔

" یہ شخص تو تمہیں جانتا ہے۔ اور نہ صرف جانتا ہے۔ بلکہ شاقی ہے کہ تم نے اس کے ساتھ فریب اور دغا سے کام لیا۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟"

عامر :۔" ماجرا کیا ہوتا۔ سچ ہے۔ اعترافِ خطا تو کر چکا ہوں "

ریحان :۔" لیکن تم جیسے آدمی سے تو یہ بات مستبعد ہونی چاہیئے "

عامر :۔" یہ کیوں جناب والا ؟"

ریحان :۔" یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کہ فریبی ہو سکتے ہو۔ دغا باز ہو سکتے ہو۔ کم از کم میں تو باور کرنے کو تیار نہیں ہوں "

عامر :۔" شکریہ ——— لیکن اس حسنِ ظن کی وجہ ؟"

ریحان :۔" میں نے دنیا دیکھی ہے۔ دنیا والوں کو دیکھا ہے۔ دغا بازوں کے چہرے پر یہ معصومیت نہیں ہوتی۔ فریب کاروں میں یہ کشش نہیں ہوتی۔ احسان فراموش میں ایسی جرأت نہیں پائی جاتی "

عامر :۔" لیکن میرے دوست ! کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دھوکا دیتے ہیں۔ مجھے انہی میں سمجھ لو "

ریحان :۔" یہ نہیں ہو سکتا ——— سچ بتاؤ۔ اصل ماجرا کیا ہے ؟"

عامر :۔ "اور اگر نہ بتاؤں تو کیا کرو گے ؟"

ریحان :۔ "کیا بتاؤں ؟ نہ خفا ہو سکتا ہوں ۔ نہ ترک تعلق کر سکتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ پھر کیا کروں ؟"

عامر :۔ اچھا اصل واقعہ بتائے دیتا ہوں ـــــ یاد ہوگا۔ میں نے تم سے ایک لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ کہ مجھ پر عاشق ہو گئی تھی "

ریحان :۔ "ہاں خوب یاد ہے۔ شاید تم نے اس کا نام بھی بتایا تھا۔ بھلا سا نام تھا۔ ہاں یاد آیا۔ سلمیٰ "

عامر :۔ ٹھیک یاد آیا ـــــ تو جناب ! وہ انہی بزرگوار کی صاحبزادی کا نام ہے۔ جو اس وقت تلوار تولتے تولتے رہ گئے تھے ـــــ !"

ریحان :۔ "اوہو ، یہ بات تھی !"

عامر :۔ "جناب ـــــ ! اور بھی کچھ پوچھنا ہے آپ کو ؟"

ریحان :۔ "ہاں کیوں نہیں۔ پوری داستان سناؤ ؟"

عامر (دلیلی)، نے کوفہ کی روانگی سے لے کر مکہ پہنچنے تک کا سارا قصہ کہہ سنایا پھر پوچھا :۔

" بتاؤ۔ کیا ایسی صورت میں اس کے سوا کچھ اور کر سکتا تھا ۔ جو میں نے کیا ! ۔ تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے ؟"

ریحان :۔ (متاثر ہو کر) " وہی جو تم نے کیا ـــــ لیکن اب سوال یہ ہے کہ گلو خلاصی کی صورت کیا ہو ؟"

عامر :۔ "یہ سوچنا ہی بیکار ہے۔ نعیم ڈاکوؤں کا سردار ہے ۔ وہ رحم و مروت کے نام سے بھی ناواقف ہے۔ سفاکی اور ستم گری اس کی عادت بن چکی ہے۔ وہی کرے گا ، جو کہہ چکا ہے "

ریحان :۔ "یعنی تمہیں قتل کر دے گا ؟"

عامر :۔ "ہاں ، اور تمہیں رہا کر دے گا "

ریحان :۔ "میں ایسی رہائی پر سو بار نہیں ہزار بار لعنت بھیجتا ہوں، ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں ڈوبیں گے تو ساتھ، تیریں گے تو ساتھ"

عامر :۔ "تمہارے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن یہ موقع جذبات میں آکر کوئی غلط۔ فیصلہ کرنے کا نہیں ہے"

ریحان :۔ "میرے فیصلہ کو غلط کہتے ہو؟ ——— تم بھی؟"

عامر :۔ "ہاں جان دینی ہے تو کسی نیک مقصد کے لئے یعنی سبطِ رسولؐ کا ساتھ دے کر قربان کرو۔ میری حیثیت کیا ہے؟ میں زندہ رہا تو دنیا کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ کچھ نہیں سوا اس کے کہ ایک آدمی زندہ ہے۔ لیکن امام زندہ رہے اور۔ کامیاب ہو جائے۔ تو مسلمانوں کی قسمت پلٹ جائے گی۔ ملّتِ اسلامیہ کے دن بدل جائیں گے۔ باطل کی حکومت ختم ہو جائے گی اور حق کی سلطانی کا دَور دورہ شروع ہو جائے گا۔ میرے لئے جان دے کر تم صرف مجھ پر احسان کرو گے۔ لیکن سبطِ رسولؐ کا ساتھ دیتے ہوئے اگر جان دی تو آسمان کے فرشتے تم پر رشک کریں گے۔ جنت کی حوریں تمہارا استقبال کریں گی۔ اور خدائے واحد و قدوس کی بارگاہ میں انعام و مرحمت کے سزاوار قرار دیئے جاؤ گے۔ ضد سے کام نہ لو۔ وہ کام کرو جو کرنے کا ہے"

ریحان :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) "تو تمہاری رائے یہ ہے کہ چلا جاؤں؟"

عامر :۔ "ہاں، یہ میری قطعی اور آخری رائے ہے، لیکن ایک استدعا کے ساتھ"

ریحان :۔ "تمہاری ہر استدعا میرے لئے فرمان کا حکم رکھتی ہے بتاؤ؟"

عامر :۔ "امام عالی مقام کے ساتھیوں میں ایک شخص ہے ربیع، اس سے میرا پیام کہہ دینا"

ریحان :۔ "ربیع؟ ——— تم اسے جانتے ہو؟"

عامر :۔ "ہاں بہت اچھی طرح، کیا تم بھی اس سے واقف ہو؟"

ریحان :۔ "مجھ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا اس سے؟ وہ میرا دوست ہے۔

آج کا نہیں بچپن کا ؟"

عامر :۔ "بس تو تم سے بڑھ کر اس امانت کا امین کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس سے کہہ دینا کہ لیلیٰ کا انتقال ہو گیا ۔"

ریحان :۔ "کیا تم لیلےٰ کو بھی جانتے ہو ؟"

عامر :۔ "ہاں ـــــ کیا تم بھی اس سے واقف ہو ؟"

ریحان :۔ "کیوں نہیں ! وہ میرے دوست کی محبوبہ ہے۔ کیا اس کے بارے میں کوئی خبر پہنچانا چاہتے ہو ؟"

عامر :۔ "ہاں، ـــــ کہہ دینا۔ اس کا انتقال ہو گیا ؟"

ریحان :۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ـــــــــــ اس کا انتقال ہو گیا ! تمہیں کیسے معلوم ؟"

عامر :۔ "میں اس کا بھائی ہوں ۔"

ریحان :۔ "جب ہی اتنے خوبصورت ہو۔ بیشک تم جیسے آدمی کو لیلیٰ کا بھائی ہونا چاہیئے. مطمئن رہو۔ میں کہہ دوں گا ۔"

عامر :۔ "لیکن میں نے ربیع سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں سنا ۔"

ریحان :۔ "نہیں سنا ہو گا ـــــ ہم دونوں بچپن کے دوست ہیں۔ بصرہ میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور اس نے لیلیٰ سے اپنے معاشقہ کا حال سنایا تھا۔ بصرہ سے وہ کوفہ آیا اور دوسرے ہی ہفتہ میں بھی ایک کام سے کوفہ پہنچا۔ وہاں معلوم ہوا وہ مکہ گیا ہے مجھے بھی مکہ ہوتے ہوئے دمشق جانا تھا میں بھی اسی ارادہ سے چل پڑا کہ اس سے ملاقات ہو گی۔ مگر نہ اس سے ملاقات ہوئی نہ حضرت امام سے ۔"

عامر :۔ "کیا تم بھی امام کے جاں نثاروں میں ہو ؟"

ریحان :۔ "یہ شرف مجھے کہاں حاصل ہو سکتا ہے ! میں ان بدقسمت لوگوں

میں تھا۔ جو یزید کی خلافت کے حامی ہیں۔ بصرہ میں میری اور ربیع کی کافی گفتگو رہی لیکن میں اپنی رائے پر جما رہا۔ البتہ مکہ آتے ہوئے جب میں نے دُور سے ایک مختصر سے کارواں کو جاتے ہوئے دیکھا تو میرے دل میں ایک لہر سی اٹھی۔ اور پھر مکہ پہنچ کر اس شیخ کہن سال کی گفتگو نے اس لہر کو طوفان سے بدل دیا۔"

عامر :۔ "جزاک اللہ، جزاک اللہ، ایک مسلمان کی یہی شان ہے۔"

ریحان :۔ "لیکن عامر! میرا جی نہیں چاہتا کہ تمہیں یوں قتل ہونے کے لئے چھوڑ جاؤں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں؟"

عامر :۔ "ناممکن ـــــــــ یہاں کا ذرہ ذرہ ہمارا پاسبان اور نگہبان ہے۔ اگر ہم کسی چٹان کی اوٹ میں بھی چھپ جائیں گے۔ تو وہ بھی ہمارے خلاف گواہی دے گی۔ ذرا خیمہ سے جھانک کر تو دیکھو باہر کی طرف!"

ریحان :۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

عامر :۔ "کئی آدمی ہماری پاسبانی پر مامور ہیں۔"

ریحان :۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے؟ چوہے کی طرح مرنے کے مقابلہ میں شیر کی طرح مرنا کہیں شاندار ہے۔"

عامر :۔ "میرے دوست سچ کہتے ہو۔ لیکن موت کی جگہ یہ نہیں ہے بلکہ وہ ہے جہاں پر امام حسینؑ تشریف رکھتے ہیں۔"

ریحان :۔ "سچ کہتے ہو۔ تمہیں خدا کو سونپتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو بھی اس کی مرضی کے حوالے کرتا ہوں۔"

عامر :۔ "شاباش! اب تم نے جوانمردوں کی سی بات کی۔"

اس گفتگو کے بعد بات چیت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ دونوں نہ جانے کس فکر میں مستغرق ہو گئے۔ یہاں تک کہ روزِ روشن اندھیرے کے دامن میں روپوش

ہو گیا۔ رات ہو گئی۔ اور سناٹا چھا گیا۔ دونوں اپنے اپنے بستر پر لیٹے اور سو گئے تھوڑی دیر کے بعد عامر نے محسوس کیا۔ کوئی اس کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہلا رہا ہے اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے پوچھا —— "کون ہے ؟"

آہستہ سے آواز آئی :-

"دوست ! —— آؤ باہر آؤ "

عامر اس کے ساتھ ہو لیا۔ خیمہ کے دروازے پر اگرچہ ایک چھوڑ دو پاسبان موجود تھے۔ لیکن کسی نے روک ٹوک نہ کی۔ عامر اور وہ شخص اندھیرے میں چلتے رہے خیموں کی حد سے باہر نکل کر اس شخص نے اپنے چہرے کا نقاب الٹ دیا —— یہ سلمیٰ تھی۔

سلمیٰ نے عامر سے کہا :-

"تم نے جو کچھ کیا۔ اس کا فیصلہ تم ہی بہتر کر سکتے ہو۔ کہ وہ ٹھیک تھا۔ یا غلط۔ لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے پاسبانوں کو راضی کر لیا ہے۔ یہ تمہاری سانڈنی ہے۔ جاؤ۔ جہاں تمہارا جی چاہے۔ ابا جان اپنے ساتھیوں سمیت تشریف لے گئے ہیں۔ وہ صبح تک تو آتے نہیں۔ راتوں رات بہت دور نکل جاؤ گے "

عامر نے چشم پُرنم اور گریہ گلوگیر کے ساتھ جواب دیا۔

"سلمیٰ ! تمہاری محبت کا جواب محبت کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن تم نے اس سے محبت کی جو محبت کا جواب نہ دے سکنے پر مجبور ہے۔ کاش تم . مجھے معاف کر دو "

سلمیٰ نے کہا :-

"اگر معاف نہ کر چکی ہوتی۔ تو اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر تمہیں روانہ کرتی۔ اب باتوں کا وقت نہیں ہے۔ جاؤ جلدی سے روانہ ہو جاؤ "

دفعتہً چند ساتھیوں کے ساتھ ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے کہا:۔
"تمہیں رہا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ سردار کا قیدی ہے آؤ عامر آؤ۔ بزدلی کے ساتھ بھاگنے کی کوشش نہ کرو"
یہ جمال تھا ـــــ سلمیٰ کا ابن عم۔ جس سے وہ نفرت کرتی تھی۔!

باب ۴۷

ایک اور شہید

امام حسینؑ کا کارواں اب کوفہ کے قریب پہنچ چکا تھا اور ایک مقام زبالہ پر خیمہ زن تھا۔ آپ کو اب تک مسلم بن عقیل کی خبر شہادت نہیں ملی تھی۔ بنو امیہ کی وہشت اتنی قائم تھی کہ جو راستہ میں ملتا تھا۔ وہ آپ کو آگے بڑھنے سے روکتا تھا لیکن آپ صرف ایک ہی بات فرماتے تھے۔ یہ کہ میں ارادہ کر چکا ہوں۔ میں نے ایک نیک ارادہ کیا ہے۔ میں ذاتی جاہ و نمود کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا ہوں۔ اسلام کی سربلندی اور کتاب و سنت کی فرمانروائی میرا نصب العین ہے۔ اس مقصد کے لئے اپنی جان خوشی سے قربان کر سکتا ہوں۔ منع کرنے والے لوگ یہ سنتے تھے اور خاموش ہو جاتے تھے۔

" زبالہ کے مقام پر جب آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ خیمہ زن ہوئے تو آپ نے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن لقطر کو کوفہ روانہ کیا کہ وہاں جا کر اہل کوفہ اور مسلم بن عقیل کو اطلاع دے دیں۔ کہ آپؑ تشریف لا رہے ہیں۔ اور امروز و فردا میں کوفہ پہنچا چاہتے ہیں "

لیکن عبداللہ کوفہ پہنچنے سے پہلے گرفتار کر لئے گئے۔ حصین بن نمیر ابن زیاد کی پولیس کا افسر اعلیٰ تھا۔ اسے ابن زیاد نے اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ۔ کہ اپنا لشکر لے کر تمام راستے روک لے۔ اور لشکر حسینی کے کسی فرد کو حدود کوفہ میں داخل نہ ہونے دے۔ اس نے عبداللہ کو گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس کوفہ بھیج دیا۔

عبداللہ کو دیکھ کر ابن زیاد آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے کڑک کر کہا:۔

"تو حسینؑ کا بھیجا ہوا آیا ہے؟"

عبداللہ نے استقلال اور عزیمت کے ساتھ جواب دیا:۔

"زبان سنبھال کر بات کر جس مقدس اور محترم ہستی کا نام تونے اس بے ادبی سے لیا ہے۔ اس کا نام فرشتے بھی ادب سے لیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو تیری زبان کٹ جائے۔ اور تو قوتِ گویائی سے محروم ہوکر گونگا ہو جائے۔

بے انتہا غضب ناک ہونے کے باوجود ابن زیاد اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکا۔ اس نے کہا:۔

"تو مجھے ڈراتا ہے؛ شاید تو نہیں جانتا۔ میرے کوڑے میں کتنی قوت اور میری تلوار میں کیسی دھار ہے؟"

عبداللہ نے پامردی کے ساتھ جواب دیا:۔

"جانتا ہوں۔ لیکن شاید تو نہیں جانتا کہ خدا میں کتنی قوت ہے۔ تیرا کوڑا صرف ایک آدمی کی پیٹھ پر پڑ سکتا اور اس کی کھال اتار سکتا ہے۔ تیری تلوار چند آدمیوں کی گردن کاٹنے کے بعد کند ہو جائے گی۔ لیکن خدا کے قہر و جلال کے سامنے بڑی بڑی قوتیں اور ملتیں مکھی، مچھر اور چیونٹی سے بھی زیادہ بے بس ثابت ہوتی ہیں۔ زمین الٹ جاتی ہے۔ بلند و بالا عمارتیں خاک کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ لاکھوں اور کروڑوں آدمی زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں نے حسینؑ ابن علیؓ یعنی سبطِ رسولؐ کا بھائی بن کر صرف تیرے غصہ کو مشتعل کیا ہے۔ لیکن تو یزید کا ساتھ دے کر، کتاب و سنت کی راہ چھوڑ کر، ظل کی خوشامد کرکے اور حق پرستوں پر ظلم و زیادتی کرکے، خدا کے انتقام کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ مجھ سے زیادہ تو اس کا مستحق ہے کہ ڈرے۔"

ابن زیاد:۔ "خاموش، تیری یہ بے ادبی اور گستاخی ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی۔ خدا کی قسم، اب تو اپنی گردن سلامت نہیں لے جا سکتا۔"

عبداللہ بن یقطر:۔ (مسکرا کر) خدا کی قسم، جس دن مکہ سے چلا تھا۔ اسی دن سمجھ لیا

تھا کہ یہ گردن میری نہیں ہے۔

ابن زیاد :۔ "تو نہیں جانتا، موت کتنی بھیانک ہوتی ہے!"

عبداللہ بن یقطر:۔ "جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جہنم کی آگ، موت سے کہیں زیادہ ہولناک اور بھیانک ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ آتش جہنم سے ڈرتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ تو بھی اس سے ڈرے!"

ابن زیاد:۔ "یہ میرا ایوان امارت ہے، وعظ کی مجلس نہیں۔"

عبداللہ بن یقطر:۔ "ہاں، اور اسی ایوان امارت کے بارے میں خدا کے آخری نبیؐ نے فرمایا ہے:۔

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر — جور و ستم کرنے والے فرمانروا کے سامنے حق کا کلمہ بلند کرنا افضل ترین جہاد ہے۔

مجھے فخر ہے۔ کہ اس جہاد کی سعادت مجھے حاصل ہوئی۔ میں پھر تجھ سے کہتا ہوں کہ اس چند روزہ زندگی کے لئے آخرت کا سودا نہ کر!"

ابن زیاد:۔ "اگر تو نے بک بک جاری رکھی تو تیری زبان کاٹ لوں گا۔"

عبداللہ بن یقطر:۔ "ہاں، تو ایسا کر سکتا ہے۔ لیکن جب تک وہ زبان میری ہے۔ حق کہنے سے باز نہیں آ سکتی۔"

یہ باتیں سن کر ابن زیاد کھول گیا۔ اس نے اپنے حاشیہ نشینوں کی طرف دیکھا۔ اور ایک شخص سے کہا:۔

"عمارؔ! اس کی باتیں ناقابلِ برداشت ہو چکی ہیں۔ اسے میرے ایوان کی چھت پر لے جاؤ۔ اگر یہ کذاب ابن کذاب حسینؑ[1] (نعوذ باللہ) پر لعنت کرے تو اس کی جان بخشی کرو۔ ورنہ وہیں سے دھکا دے کر نیچے گرا دو۔ جس طرح حسینؑ کے

---

[1] یہ واقعہ متعدد مستند کتابوں میں منقول ہے ابن زیاد، امام حسینؑ اور حضرت علیؓ کا ذکر ایسے ہی ناشائستہ الفاظ میں کیا کرتا تھا۔

ایک اور پیامبر قیس بن مسعر کے ساتھ کر چکے ہو۔"

عمار فوراً یہ خدمت بجالانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ عبداللہ بن یقطر کو لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایوانِ امارت کی چھت پر گیا اور عبداللہ سے کہا :۔

"امیر ابن زیاد نے جو الفاظ کہے تھے انہیں دہرا دے تاکہ تیری جان بچ جائے۔"

محل کے نیچے بہت سے آدمی کھڑے تھے۔ عبداللہ چھت کے چھجے کے پاس کھڑے ہوئے اور انہوں نے بآوازِ بلند فرمایا :۔

لوگو !

ابن زیاد نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں خدا کے مقبول اور برگزیدہ بندوں، علیؑ اور حسینؑ کو کذاب کہوں اور ان پر لعنت بھیجوں۔

لوگو !

یہ وہ حسینؑ ہیں جو دوشِ رسولؐ کے سوار ہیں۔ انہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گود میں لیتے۔ محبت سے ان کے رخسار و گلو کو چومتے۔ اور انہیں جوانانِ جنت کا سردار کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ اور علیؑ وہ ہیں جن کے بارے میں رسالت مآب نے فرمایا :۔

مَنْ کُنْتُ مولاہ	جو مجھے دوست رکھتا ہے وہ
ھٰذا علی مولاہ	علیؑ کو بھی دوست رکھتا ہے۔

لوگو !

"گواہ رہنا۔ میں علیؑ کو اور حسینؑ کو خدا کا برگزیدہ بندہ سمجھتا ہوں۔ وہ پارسا، نیک متقی اور پرہیزگار ہیں۔ میں علیؑ کے لئے مغفرت اور حسینؑ کے لئے کامیابی اور کامرانی کی دعا کرتا ہوں۔ اور تم سے کہتا ہوں کہ حق کا ساتھ دو اور باطل سے کنارہ کشی کر لو۔ دنیا دے کر آخرت

حاصل کرو۔ آخرت کا سودا کر کے دنیا نہ خرید و موت سر پر کھڑی ہے اس سے نہ ابن زیاد بچ سکتا ہے نہ یزید۔ مرنے کے بعد، بتاؤ تم کہاں جاؤ گے؟ رسول اللہؐ کو کیا جواب دو گے؟ ان کے سامنے اپنے عمل کی جواب دہی کس طرح کرو گے؟ اگر تم نے حسینؓ کا یعنی حق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور یزید و ابن زیاد یعنی باطل کا ساتھ دیا....؟

شاید ابھی عبداللہ کچھ اور بھی کہتے۔ لیکن عمار کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے عبداللہ کو ایک زور کا دھکا دیا۔ وہ چھت سے فرش زمین پر گرے اور موت کی ہچکیاں لینے لگے۔

عبداللہ کے گرائے جانے کے بعد وہ مجمع جو اکٹھا ہو گیا تھا —— تتر بتر ہو گیا ابھی وہ موت و زیست کی کش مکش میں گرفتار تھے کہ ایک شخص عبدالمومن بن عمیر لخمی ادھر سے اپنے چند ساتھیوں سمیت گزرا۔ اس نے عبداللہ کو یوں موت سے لڑتے دیکھا تو خنجر نکالا اور انہیں ذبح کر دیا۔

ایک ساتھی نے ملامت کرتے ہوئے کہا:۔

"کس قدر سنگ دل اور جفا پیشہ انسان ہو تم۔ اگر ایسے ہی بہادر تھے تو کسی صحیح اور تنومند آدمی پر اپنے خنجر کی دھار آزمائی ہوتی، ایک جان بلب شخص کی گردن کاٹتے تمہیں شرم نہ آئی؟"

عبدالمومن نے خنجر کا خون صاف کرتے ہوئے کہا:۔

"میں نے یہ کام عبداللہ کو آرام پہنچانے کے لئے کیا ہے۔ کیونکہ میں اس کے سسکنے اور ایڑیاں رگڑنے کا جگر خراش منظر دیکھنے کی تاب نہ رکھتا تھا"[1]

یہ کہہ کر عبدالمومن اپنی راہ چلا گیا۔ اور عبداللہ بن یقطر کی سر بریدہ لاش یونہی پڑی رہی۔

ع۱ ۔ الحسین، مطبوعہ مصر۔

ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ امام حسینؑ کو مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی اطلاع ملی تھی کہ اب عبداللہ بن یقطر کی خبر شہادت ملی۔

اس موقع پر بھی بعض لوگوں نے اصرار کیا کہ کوفہ کا ارادہ ترک کر دیا جائے اور مکہ کی طرف مراجعت فرمائی جائے۔

یہ سن کر امام عالی مقام نے اپنے تمام ساتھیوں کو بلایا اور ان کے سامنے۔ ایک مختصر لیکن فیصلہ کن تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مجھے بار بار مشورہ دیا گیا۔ کہ میں مکہ سے باہر نہ نکلوں۔ لیکن میں نے وہ مشورہ قبول نہ کیا ——— میری روانگی کے بعد بھی مشورے جاری رہے اور میں انہیں مسترد کرتا رہا۔ اب مسلم اور عبداللہ کی شہادت کے بعد پھر یہ مشورے دیئے جا رہے ہیں۔ اور میں انہیں بھی رد کرنے پر مجبور ہوں۔

اس موقع پر یہ بات صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں اپنے ارادہ سے باز نہیں آ سکتا۔ بہت سے لوگ میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ سارا کوفہ ——— جس نے مجھے بلایا تھا ——— مجھ سے منہ موڑ چکا ہے۔ اب میں بظاہر بے سروسامان اور بے یارومددگار ہوں۔ جو لوگ اس لئے میرے ساتھ آئے تھے کہ انہیں میری کامیابی کا یقین تھا۔ وہ رخصت ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں ہرگز نہیں روکنا چاہتا۔ بلکہ مشورہ دیتا ہوں کہ چلے جائیں۔ جو لوگ یہ سوچ کر آئے تھے کہ ہر حالت میں میرا ساتھ دیں گے خواہ کامیابی ہو یا ناکامی، زندگی رہے یا جائے وہ رہنا چاہیں تو میں ان کا خیر مقدم کروں گا۔ لیکن جانے والوں کے خلاف نہ مجھے کوئی شکایت ہو گی نہ ان پر معترض ہوں گا۔ جو لوگ جانا چاہیں بے تامل چلے جائیں۔

اس تقریر کے بعد لوگ چھٹنے شروع ہو گئے۔ اور صرف وہی رہ گئے جو مدینہ سے آپ کے ساتھ آئے تھے۔ یا چند وہ لوگ جو راستہ میں آپ کے ساتھ ہو لئے تھے۔

انہی میں زہیر بن قیس بجلی بھی تھے۔ یہ حضرت عثمانؓ کے طرفداروں میں تھے۔ اور حج سے فارغ ہوکر کوفہ واپس جارہے تھے۔ انہوں نے حضرت امامؑ کو اس طرح جاتے دیکھا تو حمیت ایمانی جوش میں آئی۔ اور سرفروشی کے مخلصانہ جذبہ کے ساتھ ہمرکاب امام ہو گئے۔ انہی زہیر نے امام والامقام سے دریافت کیا:-

"اس نازک موقعہ پر آپ نے یہ تقریر کیوں فرمائی۔؟"

حضرت امام نے جواب دیا:-

"ان میں سے اکثر کا خیال تھا کہ یہ ایسے شہر کی طرف جارہے ہیں۔ جہاں کے باشندے پورے طور پر میرے ساتھ ہیں۔ لیکن تازہ حالات کی روشنی میں میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں بتا دیا جائے کیسے حالات پیش آسکتے ہیں۔ تاکہ وہی لوگ ساتھ رہیں، جو۔ زندگی کے آخری سانس تک ساتھ دے سکتے ہوں۔ اور جو اس کے لیئے تیار نہ ہوں، وہ شوق سے واپس چلے جائیں!"

زہیر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے کہا:-

"بیشک اہل حق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور میں عہد کرتا ہوں کہ زندگی کے آخری سانس تک آپ کا ساتھ دوں گا۔"

باب ۵۰

من دوست و دامان آلِ رسولؐ

اب لشکر امام، زبالہ سے آگے بڑھا۔ اور بطن عقبہ میں قیام فرمایا۔ یہاں ایک شخص جو بنو عکرمہ سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ خیر خواہ اہل بیت اور معتقد امام تھا۔ اس نے تمام حالات کی وضاحت کرنے کے بعد عرض کیا۔

"ابن زیاد نے آپ کا راستہ روکنے اور آپ کو کوفہ تک نہ پہنچنے دینے اور آپ کو شہید کر ڈالنے کی تمام تیاریاں مکمل کرلی ہیں۔ اس نے قادسیہ سے عذیر تک اپنے مسلح سواروں کا جال بچھا دیا ہے۔ تاکہ کسی طرح بھی آپ زندہ نہ واپس جا سکیں۔ اس لئے میں مودبانہ طور پر لیکن پورے اصرار کے ساتھ التجا کرتا ہوں۔ کہ واپس تشریف لے جائیں ——— اور اس سفاک و شقی سے اپنے آپ کو بچالیں۔"

حضرت امام حسینؑ غور اور توجہ کے ساتھ اس شخص کی باتیں سنتے رہے۔ پھر فرمایا:۔

"میرا مقصد اسلام کی خدمت ہے اس راستہ میں خواہ جان جائے یا رہے مجھے ہر قیمت پر یہ فرض ادا کرنا ہے۔"

عکرمی خاموشی کے ساتھ اٹھ گیا۔ اور آپ آگے بڑھنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ابن زیاد نے امام حسینؑ اور کوفہ کے درمیان اپنے مسلح سواروں کے ذریعے

ایک حدِ فاصل قائم کر دی تھی۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ نہ کوفہ والوں کو امام حسینؓ کی نقل و حرکت کی اطلاع مل سکے۔ نہ لشکرِ امام میں کوئی بات کوفہ والوں کو پہنچ سکے۔ دونوں ایک دوسرے سے قطعاً ناواقف اور لاعلم رہیں۔ اور راستہ ہی میں کسی مقام پر مقابلہ کیا جائے۔ اور آپ کو شہید کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابنِ زیاد بہت اچھی طرح یہ جانتا کہ امام حسینؓ لڑنے کے لئے نہیں آرہے ہیں نہ ان کے پاس سازوسامانِ جنگ ہے نہ کوئی مسلح اور مکمل فوج۔ اپنے کچھ عقیدتمندوں اور جانثاروں کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ لیکن اگر تشریف لے آئے تو حالات بدل جائیں گے۔ جن لوگوں کو اس نے تشدد کے ذریعہ خاموش کر دیا ہے۔ وہ ہر بندش کو توڑ کر میدانِ عمل میں اتر آئیں گے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اموی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یزید کا تختِ حکومت سرنگوں ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ابن زیاد اور اس جیسے دوسرے موقع پرستوں کی جاہ و منفعت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہت اچھی طرح یہ جاننے کے باوجود کہ نہ حضرت امام حسینؓ کے ساتھ کوئی فوج ہے نہ وہ لڑنے کے ارادہ سے آرہے ہیں یہ فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو راستہ ہی میں آپ کا خاتمہ کر دیا جائے۔ تاکہ یہ اندیشہ ہی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے کہ خلافت بنو امیہ کسی خطرہ میں ہے۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ابن زیاد نے پورے جوش و خروش اور زور و شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

ابن زیاد نے اس سلسلہ میں ایک اور چالاکی کا ثبوت دیا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ مسلمان بہرحال ہنسی خوشی اپنے رسولؐ کے نواسے کا خون نہیں بہا سکتے۔ نہ اس کے ساتھ تشدد اور سختی کا برتاؤ کر سکتے ہیں۔ آج جو لوگ فوج میں بھرتی ہوئے ہیں اور امام حسینؓ سے لڑنے کے لئے نکلے ہیں۔ یہ حکومتِ امویہ کے اتنے وفادار نہیں ہیں، صرف روپے کے لالچ میں۔ انہوں نے اپنے احتیاجات پورے کرنے کے لئے یہ ملازمت کی ہے لیکن جب ان کا اور امام کا آمنا سامنا ہوگا، تو عین ممکن ہے

ان کی حمیت دینی ابھرے، اور یہ روپیہ سے روگرداں ہو کر امام کا ساتھ دیں۔ اور حکومت سے بغاوت کر بیٹھیں۔

یہ سوچ کر اس نے اپنی فوج میں جو عراق کے طول و عرض میں پھیلا دی تھی اور جو کوفہ کے گرد و نواح میں گشت کر رہی تھی اور جو حجاز مقدس کے ہر راستہ میں کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھی بہت کافی تعداد میں ایسے لوگوں کو بھی بھرتی کیا جو مسلمان نہیں تھے۔ بلکہ عیسائی یا یہودی تھے۔ ابن زیاد جانتا تھا عیسائی اور یہودی سپاہیوں کو امام حسینؑ سے کوئی عقیدت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ دلی جوش و خروش کے ساتھ اس۔ نشانِ رسولؐ کو مٹانے کی جدوجہد میں حصہ لیں گے۔ کیونکہ اگر حسینؑ کے نانا کا دین نہ پھیلتا۔ تو عیسائیوں کی حکومتیں قائم رہتیں[1]۔ ان کے دبدبہ اور طنطنہ میں فرق نہ آتا۔ ان کا جاہ و جلال باقی رہتا۔ ان کی تہذیب و تمدن اور معاشرت متاثر نہ ہوتی۔ اسی طرح یہودیوں کے دم خم میں بھی فرق نہ آتا۔ وہ حجاز کو اپنی سرمایہ داری کے شکنجہ میں کستے رہتے۔ مدینہ کے رہنے والوں کو یہودی بناتے رہتے۔ اور ایک نہ ایک دن اس حوالی میں ایک یہودی حکومت قائم کر لیتے۔ لیکن اسلام نے نمودار ہو کر اس خواب شیریں کا خاتمہ کر دیا۔

ابن زیاد نے عیسائی اور یہودی سپاہیوں کو زیادہ تعداد میں بھرتی کر کے ایک طرف تو یہ اطمینان کر لیا کہ یہ کسی طرح بھی امام حسینؑ کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے دوسری طرف وہ مسلمان سپاہی جن سے کسی درجہ میں بھی بغاوت کا اندیشہ کیا جا سکتا

---

[1] اس تاریخی حقیقت کی تصدیق مشہور عرب نژاد امریکی مصنف اور مورخ پروفیسر فلپ حتی نے بھی کی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ کراچی تشریف لائے تھے اور اہل علم کے مجمع میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ امام حسینؑ سے لڑنے والی فوج میں کافی تعداد عیسائیوں اور یہودیوں کی تھی۔ کیونکہ مسلمان سپاہیوں سے بغاوت کا اندیشہ تھا (رئیس احمد جعفری)

تھا اب اپنے عزائم سے دستبردار ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ یہودی اور عیسائی سپاہی باغی سپاہیوں کا بھی میدان جنگ میں قلع قمع کر کے رکھ دیں گے۔

حضرت امام حسینؓ نے مکہ مکرمہ سے لے کر عراق تک کا سفر انتہائی روح فرسا، ناقابلِ برداشت اور تکلیف دہ حالات میں طے کیا۔ زمین بے انتہا ناہموار تھی۔ راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونچے اونچے ٹیلے اور گہرے گہرے گڑھے تھے۔ لق و دق صحرا نے اور زیادہ رہروی دشوار کر دی تھی۔ پھر گرم گرم پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا جو سنگِ راہ کی طرح راستہ میں حائل ہو رہا تھا۔ بادِ سموم کے تھپیڑے لوُکے جھکڑ گرد و غبار کے طوفان اور گرم گرم جھلستی ہوئی ریت کی یورش۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی آپ کے عزم میں حارج نہ ہو سکی۔ آپ برابر اپنے مختصر سے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک ایک مقام شراف میں پہنچ گئے۔ سامنے جبل ذی حسم تھا۔ آپ نے زہیر بن قیس کے مشورہ سے اس پہاڑ کے دامن میں اپنے خیمے نصب کرائے ــــــ تاکہ اگر مقابلہ کی نوبت آئے۔ تو ایک ہی طرف سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اور پشت کی طرف سے ایک مضبوط نگہبان کا کام دے۔

حضرت امام حسینؓ اپنے خیمہ میں فروکش تھے۔ کہ زہیر بن قیس حاضر ہوئے انہوں نے کہا:-

"موسم کی شدت بڑھتی جارہی ہے۔ عورتوں اور بچوں کا ساتھ ایسے نامساعد حالات اور ناخوشگوار موسم میں بڑی زحمت کا موجب ہے۔"

آپ نے تبسّم فرمایا اور کہا:-

"زہیر تم سچ کہتے ہو۔ لیکن میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا ــــــ کہ اہل و عیال کو پیچھے چھوڑ آتا۔ میں چاہتا ہوں۔ ہم سب ایک ساتھ ہی رہیں۔ مسلم کا حشر تمہیں معلوم ہو چکا ہے۔ ممکن ہے یہی حشر میرا بھی ہو۔ ایسے مواقع پر اتنے قریبی عزیزوں کی دوری بہت کھلتی ہے۔"

زہیر :- "بجا ارشاد ہوا۔ آپ اصحاب عزیمت ہیں۔ یہی آپ کے شایانِ شان تھا جو

آپ نے کیا۔ ہم جیسے کم حوصلہ آدمی تو یہ ہمت نہیں کر سکتے !"

حضرت امام :۔ "معلوم ہوتا ہے۔ تم نے اپنے اہل و عیال کو ساتھ نہیں لیا؟"

زہیر :۔ "نہ صرف انہیں ساتھ ہی نہیں بلکہ ان کا فیصلہ بھی کر دیا۔ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ مہر ادا کر دیا، اس سے اپنی خطائیں معاف کرالیں۔ اور اسے اس کے بھائی کے ساتھ اعزاز و احترام کے ساتھ رخصت کر دیا۔"

حضرت امام :۔ (متحیر ہو کر) "یہ تم نے کیا کیا؟ آخر اس کی ضرورت کیا تھی؟ طلاق کیوں دی؟"

زہیر :۔ "تاکہ یک سُو ہو کر جاں نثاری کا فریضہ ادا کر سکوں۔ اگر میں نے اپنی بیوی کو جس سے مجھے بہت محبت تھی۔ طلاق نہ دی ہوتی۔ تو ممکن تھا میرا دل اس میں اٹکا رہتا۔ اور میں اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا[1] اب میں ہر فکر، ہر خیال، ہر اندیشہ سے آزاد ہوں۔"

حضرت امام :۔ "تمہارے اس جذبہ کی ہم قدر کرتے ہیں۔ لیکن یہ تم نے اچھا نہ کیا۔ کاش اپنے اس ارادہ کا ہم سے اظہار کر دیا ہوتا۔"

زہیر :۔ "آپ جانتے ہیں۔ میں اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ جو شیعیان معاویہ کا گروہ کہلاتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو حضرت علیؓ کو قتل عثمانؓ کا ملزم گردانتے ہیں۔ مجھے بظاہر یزید کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔"

حضرت امام :۔ "ہاں، ہمیں ہرگز یہ امید نہ تھی کہ یوں سب کچھ چھوڑ کر ہمارے ساتھ مرنے کے لئے آجاؤ گے!"

زہیر :۔ "لیکن (آواز بھر آگئی) آپ کو دیکھ کر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاد آگئے میرے دل نے کہا جنت ہو یا جہنم، جو کچھ بھی ملے وہ آلِ رسولؐ کے ساتھ

---

[1] زہیر بن قیس نے اسی خیال سے واقعی اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، یہ واقعہ تاریخوں میں مندرج ہے۔

ملنا چاہیئے۔ اگر آپ حق پر ہیں۔ تو سبحان اللہ اور اگر نہیں ہیں تو بھی میرے لیئے یہ بھی باعثِ فخر ہے کہ میں نے زندگی کے آخری سانس تک سبطِ رسولؐ کا ساتھ دیا۔"

من دوست و دامان آل رسولؐ!

کیا اس کے بعد بھی خدا مجھ پر رحم نہیں کرے گا؟

اس کے آگے زہیر کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کا چشمہ بہہ نکلا —!

باب ۶۷

امام حسینؑ کی تقریر

جبل ذی حسم کے دامن میں حضرت امام حسینؑ اپنے ساتھیوں سمیت خیمہ زن تھے۔ اتنے میں ایک لشکر آتا نظر آیا۔ زہیر نے تحقیق احوال کے بعد بتایا۔ یہ حُر بن یزید تمیمی کا لشکر ہے۔ جو اس لئے آیا ہے کہ آپ کا راستہ روکے اور آپ کو آگے نہ بڑھنے دے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:۔

"یہ تپتی ہوئی دوپہر میں چلے آ رہے ہیں۔ تھک گئے ہوں گے۔ انہیں پانی پلاؤ۔ ان کے گھوڑوں کو سیراب کر دو۔"

آپ کے رفقاء نے ان ارشادات کی تعمیل کی۔

ظہر کے وقت خیمۂ امام سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ پھر آپ نے اقامت کا حکم دیا اور حُر سے پوچھا:۔

"کیا تم ہمارے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرو گے یا الگ؟"

حُر نے کہا:۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لاکھ اختلاف ہوں۔ لیکن آپ جو کچھ ہیں وہی ہیں۔ نماز پڑھایئے۔ اپنے تمام ساتھیوں سمیت آپ کی اقتداء میں نماز پڑھوں گا۔"

عصر کے وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ نماز عصر کے بعد آپ نے حُر کو اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

لوگو!

• اگر تم خدا سے ڈرو اور مستحق کا حق پہچانو۔ تو یہ خدائے بزرگ و برتر کی رضامندی اور خوشنودی کا موجب ہوگا۔ ہم اہل بیت رسولؐ، خلافت کے ان مدعیوں کے مقابلہ میں۔ جو کسی قسم کا استحقاق نہیں رکھتے۔ اور جن کی حکومت جبر و جور اور ظلم و زیادتی پر قائم ہے۔ کہیں زیادہ خلافت کے سزاوار ہیں۔ لیکن اگر تمہاری رائے بدل گئی ہے۔ اور تم ان خطوط و عہود سے پھر گئے ہو۔ تو صاف صاف کہہ دو۔ تاکہ ہم جہاں سے آئے ہیں۔ وہیں واپس چلے جائیں "

اس کے جواب میں حُر نے کہا :-

" آپ خطوں اور قاصدوں کا کیا ذکر کر رہے ہیں؟ ہم تو بالکل نہیں جانتے کیا معاملہ ہے؟"

حضرت امام نے فرمایا :-

" یہ تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا"

یہ کہہ کر آپ نے دو بڑے بڑے تھیلے منگائے۔ اور حُر کے سامنے ڈال دیئے۔ اور فرمایا :-

" یہ ہیں وہ خطوط جو اہل کوفہ نے مجھے لکھے تھے "

حُر نے جواب دیا :-

" لکھے ہوں گے۔ مگر ہم لوگوں نے تو نہیں لکھے۔ ہم تو اس بات پر مامور ہیں کہ آپ کو ابن زیاد کے پاس کوفہ روانہ کر دیں "

امام حسین :- " یہ ناممکن ہے۔ میں اس کے پاس کیوں جاؤں؟"

حُر بن یزید :- " تو پھر آپ کسی طرف نہیں جا سکتے "

امام حسین :- " ضرور جاؤں گا۔ اور اسی طرف جاؤں گا جس طرف چاہوں گا۔ تو مجھے نہیں روک سکتا "

حُر بن یزید :- " آپ مجھے ابتلا میں نہ ڈالئے۔ میں آپ سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔

مجھ پر رحم کیجئے۔"

ان الفاظ سے حضرت امام کا دل پسیج گیا۔ آپ نے فرمایا:۔

"پھر تمہاری مرضی کیا ہے؟"

حُر بن یزید:۔ "نہ آپ مدینہ جایئے۔ نہ کوفہ۔ کسی ایسے راستہ پر چلئے۔ جو ان دونوں مقاموں سے الگ ہو۔ شاید اللہ تعالٰے کوئی ایسی صورت پیدا کر دے۔ جو میرے لئے عافیت کا سبب بن جائے۔

آپ نے اس تجویز کو قبول کر لیا، اور شمال کی طرف رخ کر کے نینویٰ کی طرف چل پڑے۔ حُر بھی اپنے لشکر کے ساتھ آپ کے ہمراہ چل رہا تھا۔

راستہ میں ایک مقام بیضا آیا۔ یہاں آپ نے ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔ یہ تقریر صرف امام حسینؑ ہی کر سکتے تھے۔ آپ نے حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:۔

لوگو!

"رسولؐ اللہ کا ارشاد ہے۔ کہ جس نے ایسے فرمانروا کو دیکھا۔ جو ظالم ہو۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر ڈالتا ہو۔ عہد خداوندی کو توڑنے میں جری ہو۔ سنتِ رسول اکرمؐ کی اپنے عمل اور گفتار سے مخالفت کرتا ہو۔ خدا کے بے سہارا اور بے بس بندوں پر ظلم کرتا ہو۔ مگر یہ دیکھنے کے باوجود اپنی گفتار یا کردار کے ذریعہ اپنی غیرت ایمانی کا ثبوت نہ دے۔ تو خدا کو حق ہے۔ کہ اسے بھی اس فرمانروا کے ساتھ جہنم رسید کر دے ۔۔۔!

لوگو!

میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ کہ ان لوگوں (بنی امیہ) نے شیطان کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ اور خدائے رحمان کی اطاعت ترک کر دی ہے۔ انہوں نے سارے ملک میں فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے۔ اور

حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے۔ مالِ غنیمت میں یہ لوگ اپنا حصہ (بغیر کسی اصول اور حق کے) زیادہ رکھتے ہیں۔ جن چیزوں کو خدا نے حرام کیا ہے۔ انہوں نے ان چیزوں کو اپنے لئے حلال کر دیا ہے۔ جن چیزوں کو خدا نے حلال کیا ہے۔ یہ انہیں اپنے لئے حرام قرار دے چکے ہیں۔ لہٰذا مجھے زیادہ حق ہے کہ یہ حرکتیں دیکھ دیکھ کر غیرت آئے۔ میرے پاس تمہارے خطوں کا تار بندھ گیا۔ تمہارے قاصدوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تم نے بار بار مجھے لکھا ہے۔ کہ تم نے میری بیعت کر لی ہے۔ اور میرے پرچم تلے آنے کو تیار ہو۔ تم نے عہد کیا تھا کہ مجھے بے یار و مددگار نہیں چھوڑو گے۔"

پس اے لوگو!

اگر تم اپنے عہد پر قائم ہو اور اپنی بیعت پوری کرو گے۔ تو راہ راست پر گامزن ہو گے۔ میں حسینؓ ہوں۔ علیؓ کا بیٹا اور فاطمہؓ بنت محمدؐ کا لختِ جگر میری جان تمہاری جانوں کے برابر اور میرے اہل و عیال تمہارے اہل و عیال کے برابر ہیں۔ میرا وجود تم لوگوں کے لئے نمونہ ہے۔ لیکن اگر تم نے اس کے باوجود اپنا عہد توڑ دیا۔ اور میری بیعت شکست کر دی۔ تو خدا کی قسم یہ بھی کوئی ایسی بات نہ ہو گی۔ جو تمہاری ذات سے بعید اور حیرت انگیز ہو۔ اس سے پہلے بھی یہی سلوک میرے باپ علیؓ، میرے بھائی حسنؓ اور میرے ابن عم مسلم بن عقیل کے ساتھ کر چکے ہو ــــــ!

اس تقریر نے حاضرین پر ایک سناٹے کی کیفیت طاری کر دی۔ کچھ دیر تک سکوت سا چھایا رہا۔ حُرؔ آگے بڑھا اور اس نے کہا:۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر آپ نے جنگ کی تو ضرور قتل کر دیئے جائیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کی حفاظت میں اسی طرح کروں گا۔ جس طرح اپنی جان کی کر سکتا ہوں۔ یہ میرے انصار ہیں۔ میری غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ میرے انصار۔ میرے سامنے گرفتار کر لئے جائیں۔ اور میں دیکھتا رہوں۔!"

یہ سُن کر حُر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے لوگوں سے کسی طرح کا تعرض نہیں کیا۔

یہ لوگ جب آپ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا:۔

"تم نے کوفہ کس حال میں چھوڑا ہے؟"

ان میں سے ایک شخص مجمع بن عبید اللہ العامری نے جواب دیا:۔

"کوفہ کے معززین کو اتنی رشوتیں دی گئی ہیں کہ ان کی تھیلیاں سیم و زر سے بھر گئی ہیں۔ لہٰذا وہ سب آپ کے خلاف متحد ہو چکے ہیں۔ ہاں عام لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن وہ بے بس ہیں۔ عقیدت کے باوجود، کل میدانِ جنگ میں ان کی تلواریں آپ کے خلاف نکلیں گی۔" [1]

---

[1] :۔ اس باب کے جملہ واقعات "الحسین" مطبوعہ مصر سے ماخوذ ہیں۔

یہ سن کر حضرت امام نے ارشاد فرمایا:۔

"اے شخص! تو مجھے موت سے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا واقعی تیری بدنصیبی یہاں تک پہنچ جائے گی کہ تو مجھے قتل کر دے گا؟ میں نہیں جانتا تیری ان باتوں کا کیا جواب دوں؟ میں صرف ایک ہی جواب دے سکتا ہوں۔ جو اوس کے چچازاد بھائیوں نے اوس کو اس وقت دیا تھا۔ جب وہ رسول اللہ کی مدد کو جا رہے تھے ______ اوس نے ان سے سوال کیا:۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟ اگر تم نے محمدؐ کی مدد کی تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔"

یہ سن کر ان میں سے ایک نے جواب دیا:۔

"میں بہت جلد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہا ہوں موت کسی جواں ہمت کے لئے موجب عار نہیں۔ بشرطیکہ نیت مخلص اور نیک ہو اور راہ اسلام میں جہاد کرنے کے ارادہ سے نکلا ہو۔ اور اپنی جان دے کر ایسے لوگوں کا معین و مددگار بنے جو نیک ہوں۔ اور ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرے جو بُرے اور مجرم ہوں۔ اگر زندہ رہا۔ تو نادم نہیں ہوں گا۔ اور اگر میری جان (در راہ اسلام میں) کام آئی تو رنج و افسوس کی کوئی بات نہ ہوگی۔ ہاں اے اوس تیرے لئے تو صرف ذلت ہی ذلت ہے۔ خواہ کیسی ہی عیش و کامرانی کی زندگی تجھے کیوں نہ حاصل ہو؟"

امام عالی مقام کے ان ارشادات کے بعد حرؓ نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ یہاں تک کہ امام حسینؑ عذیب الہجانات کے مقام پر پہنچ گئے۔

یہاں کوفہ سے کچھ سوار آتے دکھائی دیئے۔ یہ لوگ سیدھے امام حسینؑ کی طرف بڑھے۔ حرؓ نے انہیں روکنا چاہا۔ اس نے حضرت سے کہا:۔

"یہ لوگ کوفہ سے آ رہے ہیں۔ اور میں اپنے فرائض کی رو سے انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ یا تو یہ لوگ گرفتار ہوں گے۔ یا پھر انہیں واپس جانا پڑے گا۔"

غیرت ہاشمی جوش میں آئی۔ آپ نے فرمایا:۔

باب ۲۲

شمر

کوفہ سے آنے والے لوگوں سے آپ نے اپنے قاصد قیس بن مسعر اور عبداللہ بن بقطر کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے نہایت تفصیل سے ان جانبازوں اور سرفروشوں کی جرأت ایمانی اور قتل کی داستانِ درد سنائی۔ حضرتِ امام یہ واقعات سُن کر بہت دلگیر ہوئے۔ آپ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ آپ نے فرمایا۔

فمنھم من قضی نحبہ و منھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا

"ان میں سے بعض نے اپنے عہد پورے کر دیئے۔ اور بعض موقع کے منتظر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں کی۔

اس موقع پر ان لوگوں میں سے ایک شخص طرماح بن عدی نے حضرت کی خدمت میں ایک مشورہ پیش کیا۔ اس نے کہا:۔

"میں ہر طرف نظر دوڑا رہا ہوں۔ مگر مجھے آپ کے ساتھ ان چند نفوس کے علاوہ کوئی اور لشکر نظر نہیں آتا۔ اگر حرؑ کے ساتھی آپ پر ٹوٹ پڑیں تو ان کا ابھی خاتمہ ہو جائے۔ میں نے کوفہ چھوڑنے سے پہلے لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھا ہے کہ آج تک کسی ایک میدان میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ سب لوگ اس لئے جمع کئے گئے ہیں کہ آپ سے لڑیں۔ لہٰذا خدا کا واسطہ دے کر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اب

ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایئے۔ آیئے، ہمارے ساتھ آجا پہاڑ پر چلئے اور وہیں قیام فرمایئے۔ یہ بڑا تاریخی پہاڑ ہے۔ یہاں تک کسی بڑے سے بڑے دشمن کا لشکر نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں رہ کر ہم نے غسانی اور حمیری بادشاہوں کی چڑھائیاں روکی ہیں اور انہیں زچ کر دیا ہے۔ یہاں آکر جو شخص بھی قیام پذیر ہوا۔ وہ کبھی ذلیل اور رسوا نہیں ہوا۔ آپ طے کے قبائل کو اپنی مدد کے لئے بلا لیجئے۔ دس دن کے اندر اندر بیس ہزار سوار اور پیادے آپ کے گرد پروانہ وار جمع ہو جائیں گے۔ اور یقین فرمایئے۔ کہ جب تک ان میں سے ایک ایک اپنی جان نچھاور نہیں کر دے گا۔ دشمن کا ہاتھ آپ تک نہیں پہنچ سکے گا۔

یہ باتیں سن کر حضرت امام نے جواب دیا:۔

" خدا تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جزائے خیر دے۔ افسوس ہم تمہارے مشورہ کو قبول نہیں کر سکتے۔"

طرماح بن عدی نے دریافت کیا:۔

" یا امام! یہ صائب مشورہ آپ کیوں نہیں قبول فرما سکتے؟"

آپ نے فرمایا:۔

" اس لئے کہ ہم حُر سے عہد کر چکے ہیں۔ اور اس عہد کو توڑ نہیں سکتے۔"

اور عین اس وقت جب آپ طرماح بن عدی کی پیش کش کو ٹھکرا رہے تھے۔ حُر ابن زیاد کا خط پڑھ رہا تھا:۔

" جس وقت میرا یہ خط اور میرا قاصد تم تک پہنچے، تو حسینؑ اور ان کے رفقاء کو وہیں روک لو۔ جہاں وہ ہیں انہیں ایسی جگہ پر اترنے پر مجبور کر دو۔ جہاں بالکل چٹیل میدان ہو۔ جہاں کسی طرح کی سرسبزی کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ نہ کوئی پانی کا چشمہ ہو۔ میرا قاصد اس وقت تک تمہارے ساتھ رہے گا۔ جب تک یہ چشم خود نہ دیکھ لے کہ تم نے میرے احکام و ہدایات کی حرف بہ حرف تعمیل کر لی ہے۔"

یہ خط پڑھ کر حُر، حضرت امام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ اب صرف دو ہی راستے رہ گئے ہیں۔ جنگ یا اطاعت۔ جنگ کیجئے اور فیصلہ تلوار پر چھوڑ دیجئے ـــــــ ورنہ پھر غیر مشروط اطاعت کیجئے۔ اور ہتھیار ڈال دیجئے۔"

حُر کی یہ باتیں سن کر ربیع اور زہیر بن قیس نے حضرت سے عرض کیا:۔

"معاملات نازک سے نازک تر صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کے سامنے جو لشکر کھڑا ہے۔ یہ اس سے بہت کم ہے جو عنقریب آنے والا ہے۔ ظاہری ساز و سامان جنگ کے لحاظ سے ہم اس لشکر سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ نہ کہ اس عظیم الشان لشکر سے جو کوفہ سے روانہ ہو چکا ہے۔ اور بہت جلد ہمارے مقابلہ میں صف آرا ہونے والا ہے لہٰذا اگر جنگ ہی کرنی ہے تو حُر سے اس کا آغاز کیجئے۔ اس سے بہر حال کسی نہ کسی طرح ہم عہدہ برآ ہو لیں گے۔"

مگر آپ نے فرمایا:۔

"تمہارا مشورہ اگرچہ اخلاص پر مبنی ہے۔ لیکن جب تک حُر تلوار نہ اٹھائے ہماری تلوار میان سے باہر نہیں نکل سکتی۔"

آخر آپ کا لشکر کربلا کے میدان میں خیمہ زن ہو گیا۔ اور حُر کی فوجیں مدِ مقابل بن کر سامنے کھڑی ہو گئیں۔

ابن زیاد نے عمر بن سعد بن ابی وقاص کو چار ہزار کا لشکر جرار دے کر روانہ کر دیا۔ اور دوسرے روز یہ لشکر بھی آکر حُر کے ساتھ مل گیا۔ عمر بن سعد، حضرت امام کا رشتہ دار اور قرابت دار بھی تھا۔ وہ اس جنگ سے پہلو تہی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے آپ سے ملاقات کی۔ اور اس پر آمادہ کر لیا کہ یا تو مکہ چلے جائیں یا یزید سے خود مل کر معاملات کا تصفیہ کر لیں۔ یا کسی اسلامی سرحد پر جا کر کفار سے جہاد کریں۔ اس نے ابن زیاد کو یہ باتیں لکھ کر ہدایات طلب کیں۔ ابن زیاد بھی یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا:۔

"میں ان تجاویز کو قبول کرتا ہوں۔"

حاضرین دربار میں شمر ذی الجوشن بھی تھا۔ اس کی پھوپھی ام بنین بنت حزام حضرت علیؓ

کی زوجہ تھیں۔ اوران کے بطن سے عباس بن علیؓ، جعفر بن علیؓ، اور عبداللہ بن علیؓ پیدا ہوئے تھے۔ لیکن شمر نے اس قرابتداری کا بھی پاس و لحاظ نہیں کیا۔ وہ کھڑا ہوا اور اس نے ابن زیاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"کیا آپ ان تجاویز کو قبول کرلیں گے۔ جبکہ حسینؑ آپ کے چنگل میں پھنس چکے ہیں؛ خدا کی قسم! اگر حسینؑ ہاتھ سے نکل گئے۔ اورانہوں نے آپ کی اطاعت اور یزید کی بیعت نہ کی۔ تو پھر وہ کبھی ہمارے ہاتھ نہیں آسکیں گے۔ بہت جلد وہ قوت و شکوت حاصل کرلیں گے۔ اور پھر آپ ان کے مقابلہ میں کمزور اور درماندہ نظر آئیں گے۔

ابن زیاد نے بہت غور اور توجہ سے شمر کی باتیں سنیں۔ پھر کہا:۔

"تو تمہاری رائے میں کیا کرنا چاہیئے ہمیں؟"

شمر نے جواب دیا:۔

صرف ایک بات ——— انہیں حکم دیجئے کہ غیر مشروط اطاعت کریں۔ اگر وہ اس حکم پر سر تسلیم خم کردیں تو آپ کو حق ہوگا کہ انہیں سزا دیں یا معاف کردیں۔"

یہ بات ابن زیاد کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے شمر سے کہا:۔

"تمہاری رائے بہت صائب ہے۔ میں یہ کام تمہیں سونپتا ہوں۔ جاؤ اور عمر بن سعد تک میرا یہ حکم پہنچا دو۔ اگر وہ اطاعت کرے تو اس کے رفیق اور مشیر بن کر رہو۔ اور اگر انکار کرے تو اسے قتل کردو۔ اور اس کی گردن کاٹ کر میرے پاس بھیج دو۔ اور فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لو۔[1]

ابن زیاد نے یہی باتیں ایک خط میں لکھ کر شمر کو کربلا کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ خط پڑھ کر عمر بن سعد کے ہوش رخصت ہو گئے ——— یہ خط پاتے ہی اس نے آہنی عزم کے ساتھ فیصلہ کرلیا کہ وہ حسینؑ کی جان لے کر رہے گا اس نے شمر سے کہا:۔

---

[1] "الحسینؑ" مطبوعہ مصر

ابن زیاد نے یہ رائے یقیناً تمہارے مشورہ سے قائم کی ہے۔ میں اس کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ لیکن یاد رکھو۔ آج کے دن ایک بڑے ہولناک واقعہ کا آغاز ہو رہا ہے تم نے بنے بنائے کام کو بگاڑ دیا۔ خدا کی قسم حسینؑ ہرگز ہماری اطاعت اور یزید کی بیعت نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ خود دار اور خود نگر ہیں۔ تم چاہتے ہو کہ وہ قتل کر دیئے جائیں۔ اور اب ایسا ہی ہو گا۔

شمر مسکرایا اور۔ اور اس نے کہا:۔

"میرے دوست! یہی صحیح اور درست راستہ ہے"

پھر شمر نے اپنی پھوپھی کے بیٹوں عباس بن علیؑ اور ان کے بھائیوں کو بلایا اور ان سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا:۔

"میرے عزیزو! تاریخ کا بہت المناک حادثہ رونما ہونے والا ہے۔ حسینؑ اپنی ضد پر قائم ہیں۔ اب جنگ ہو گی۔ اور اس جنگ کا انجام جو کچھ ہو گا۔ وہ ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن تم نہ گھبراؤ۔ میں نے ابن زیاد سے تمہارے لئے امان حاصل کر لی ہے تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ چاہو تو مدینہ یا مکہ واپس چلے جاؤ۔ چاہو تو میرے پاس آکر مقیم ہو جاؤ۔ لیکن ہر حالت میں حسینؑ کا ساتھ تمہیں چھوڑنا پڑے گا"

عباسؑ اور ان کے بھائیوں نے جواب دیا:۔

"اللہ تعالےٰ تجھ پر اور تیری امان پر لعنت کرے ہمیں تو امان دیتا ہے۔ لیکن ابن رسولؐ اللہ کے خون کا پیاسا ہے؟ ہم اس امان کو ٹھکراتے ہیں۔ ہمارا بھی وہی حشر ہو گا جو حسینؑ کا ہو گا"

شمر یہ باتیں سن کر جل گیا۔ اس نے کہا:۔

"اگر تم لوگ مرنے کا تہیہ کر چکے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ تم جانو اور تمہارا کام۔ میں نے بہر حال اپنا فریضہ ادا کر دیا"

عباسؑ نے حقارت بھری نظر اس پر ڈالی اور کہا:۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ نہ تم خدا سے ڈرتے ہو، نہ رسولؐ کی محبت تمہارے دل

یں ہے۔ تم ایسے راستے پر چل رہے ہو۔ جو خدا کے غضب اور قہر کا راستہ ہے۔ ہم تمہیں امانِ الٰہی کی بشارت دیتے ہیں۔ ابن زیاد کا ساتھ چھوڑ دو۔ اور ہمارے ساتھ آجاؤ۔

شمر یہ سن کر برہم ہوگیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کوئی بات کئے ہوئے اپنے خیمہ میں چلا گیا ——— !

باب ۴۸

پری تمثال حباب

دمشق کے قصرِ خلافت میں یزید ایک زرکار مسند پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ خوش اندام اور خوش شکل اور خوش ادا کنیزوں کے طائفے موجود ہیں۔ جام گردش میں ہے ——— اور قرابے کے قرابے صرف ہو رہے ہیں۔ مسند کے قریب ابنِ سرجون اور دوسرے مشیر و مصاحب بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ یہ قصرِ خلافت نہیں شاہانِ عجم میں سے کسی عیاش اور ہوس پرست بادشاہ کا دربار ہے۔ جہاں خوش گلو اور نیم عریاں نوجوان کنیزیں اپنے حسن و شباب کی نمائش کر رہی ہیں اور خلیفہ کو بہلانے اور پرچانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یزید پر اس وقت نیم مدہوشی کی کیفیت طاری ہے۔ اور وہ اپنی ایک نازنین۔ اور سحر طراز کنیز حباب کا رقص بے محابا دیکھنے میں مصروف ہے۔ دفعتہً برہمی اور خشونت کے عالم میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اٹھتے ہی ایسا معلوم ہوا۔ زمین و آسمان کی گردش رک گئی۔ حباب کا رقص قیامت خیز رک گیا۔ جامِ شراب کا دور رک گیا۔ اہلِ بزم کا نشہ عیش و نشاط رک گیا حباب کا جو پاؤں رقص کے لئے اٹھا تھا وہ پھر زمین سے آشنا نہ ہو سکا۔ ساقی مہوش اور پری جمال نے جو جام بھرا تھا۔ وہ چھلک بھی نہ سکا۔ صراحی اور جام دونوں آمنے سامنے تھے۔ لیکن۔ ایک دوسرے سے الگ اور بے نیاز۔ حباب نے عرض و التجاء کی نظروں سے شاہِ وقت یزید کو دیکھا۔ لیکن جواب درشتی اور برہمی کے ساتھ ملا۔

"ہم تخلیہ چاہتے ہیں!"

جیسے ہی یہ آواز بلند ہوئی۔ سارا ایوان خالی ہوگیا۔ اب نہ حباب تھی، نہ ساقی پُرفن، نہ شراب کی صراحی، نہ جام مے۔ ابن سرجون بھی یزید کی کیفیت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور واپس جانے لگا۔ لیکن یزید نے اسے روکا۔

"کہاں جاتے ہو؟ بیٹھو!"

یزید پھر اپنی مسند پر متمکن ہوگیا۔ اور ابن سرجون بھی اس کے قریب سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔ یزید نے کہا:۔

"حباب کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

ابن سرجون:۔" وہ انسانی مخلوق ہی نہیں معلوم ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پرستان کی پری یا بہشت کی حُور ہے۔"

یزید:۔ کیا وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے؟"

ابن سرجون:" وہ خوبصورت ہی نہیں بلکہ خوبصورتی کا معیار ہے۔ اس کی آنکھیں آہوئے ختن کو شرماتی ہیں۔ اس کا رنگ نمود سحر کی طرح نظر فریب اور دلکشا ہے۔ اس کی آوازیں وہ لوچ، وہ ترنم، وہ دل کشی ہے کہ جن و ملک بھی ورد پڑھتے ہیں ہوں گے۔ اس کی اداؤں میں وہ دلبری اور شوخی ہے کہ ستارے بھی اسے جُھک کر دیکھتے ہیں۔ چاند بھی اسی کا نظارہ کرنے کے لئے طلوع ہوتا ہے۔ امیرالمومنین! حقیقت یہ ہے کہ حباب کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ وہ انسان نہیں۔ دستِ قدرت کی بنائی ہوئی پہلی اور آخری مورت ہے۔"

یزید:۔ (دانتوں تلے انگلی دبا کر کچھ سوچتے ہوئے) ٹھیک کہتے ہو ابن سرجون واقعی وہ قیامت ہے۔"

ابن سرجون:۔" وہ اپنی مثال نہیں رکھتی۔ وہ آپ اپنی مثال ہے۔ میں نے دنیا کی سیر کی ہے۔ ہر رنگ اور ہر ملک کا حسن دیکھا ہے۔ لیکن حباب ان سب میں یکتا اور منفرد ہے!"

یزید:۔" جانتے ہو ہم نے اسے کتنے میں خریدا ہے؟"

ابن سرجون :- "غلام کو یہ تو نہیں معلوم ـــــ لیکن یہ عرض کر سکتا ہوں کہ جتنے میں بھی خریدی گئی ہو سستی ہے بہت سستی ـــ !"

یزید :- "ہم نے اسے دس لاکھ اشرفیاں دے کر خریدا ہے۔ لیکن سودا پھر بھی سستا رہا۔"

ابن سرجون :- "کیا شبہ ہے اس میں ؟ میں تو دس کروڑ سنتا تو بھی یہی کہتا ۔"

قیمت خود ہر دو عالم گفتہٴ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

بے شک وہ ایسی قابل تھی کہ منہ مانگے دام دے کر خریدی جائے۔ وہ اس محل کی رونق اور امیرالمومنین کے کاشانۂ دل کی مکین ہے ۔"

یزید :- "نہیں ابن سرجون، یہ نہ کہو ۔"

ابن سرجون :- "کیا میں غلط عرض کر رہا ہوں ؟"

یزید :- "ہاں بالکل غلط ـــــ کیا تم لیلیٰ کو بھول گئے ؟"

ابن سرجون :- "جی نہیں، لیلیٰ بھی کہیں بھلائی جا سکتی ہے ؟"

یزید :- "کیا حباب، لیلیٰ کا مقابلہ کر سکتی ہے ؟"

ابن سرجون :- "لیلیٰ اور حباب کا کوئی مقابلہ نہیں۔

چہ نسبت خاک راہ با عالم پاک۔

کہاں لیلیٰ، کہاں حباب، دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔"

یزید :- "پھر بھی تم کہتے ہو کہ حباب ہمارے کاشانۂ دل کی مکین ہے ؟"

ابن سرجون :- "امیرالمومنین ! غلام اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہے۔ حباب بہت کچھ ہے، سب کچھ ہے۔ لیکن لیلےٰ کے سامنے ہیچ ہے ۔"

یزید :- "ہم نے حباب کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ حباب میں اس بلا کی صباحت و ملاحت، اس غضب کی تسخیر اور کشش ہم نے محسوس کی کہ منہ مانگے دام دے کر خرید لیا۔ وہ ہمارے پاس آئی تو اس نے ہمیں بہلانے اور پرچانے تک کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اور ابن سرجون، ہم سچ کہتے ہیں اگر ہماری جگہ کوئی

فرشتہ بھی ہوتا۔ تو اس کے سامنے سر بہ سجدہ ہو جاتا۔ اور ہم جھوٹ کیوں کہیں!
ہم نے اس سے محبت کی۔ اس کی قدر کی، اسے نوازا "

ابن سرجون:۔" وہ مستحق بھی اس کی ہے امیر المومنین!"

یزید:۔" لیکن نہ جانے کیا بات ہے؟ جب لیلیٰ یاد آجاتی ہے۔ تو حباب سے نفرت ہو جاتی ہے ہمیں"

ابن سرجون:۔" لیکن امیر المومنین! جس چیز کو آپ نے ٹھکرا دیا۔ اس کا ذکر کرنے سے کیا حاصل؟ وہ بدنصیب تھی۔ کہ امیر المومنین کی قدر نہ پہچانی اور اب در بدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوگی"

یزید:۔ (چونک کر) لیکن ابن زیاد نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کچھ نہیں معلوم!

ابن سرجون:۔" مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ ابن زیاد خود بھی اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ اور اس سے شادی کر لینے کا فیصلہ کر چکا تھا"

یزید:۔ (ترش روئی کے ساتھ) " ابن زیاد کو ہم نے لیلیٰ سے عشق کرنے کی اجازت تو نہیں دی تھی"

ابن سرجون:۔" آپ نے لیلیٰ اسے بخش دی تھی۔ خواہ وہ اس سے عشق کرے۔ یا۔ نفرت!"

یزید:۔" غلط ـــــ ہم نے یہ کہا تھا کہ اسے چند روز اپنے پاس رکھ کر کسی بدخو اور کریہہ المنظر شخص سے اس کی شادی کر دے۔ لیکن وہ خود اس سے محبت کرنے لگا۔ وہ نافرمان ہے۔ وہ تعزیز و عقوبت کا مستحق ہے۔ اسے فوراً یہاں طلب کرو۔ تاکہ ہم اپنے ہاتھ سے اس کی گردن مار سکیں"

"لیکن امیر المومنین! اسے خود لیلےٰ نے سزا دے دی ـــ!"

"وہ کیونکر؟"

"وہ اس کی حراست سے بھاگ نکلی اور اب تک سراغ نہیں لگ سکا۔

وہ کہاں ہے ! کیا اس سے بڑھ کر بھی شرمناک ناکامی کوئی ہو سکتی ہے ؟"

" ٹھیک کہتے ہو ابن سرجون ! واقعی اسے سزا ملی اور بڑی عبرت انگیز ہم خوش ہوئے یہ سن کر۔ لیکن اس کے باوجود ابن زیاد کو معاف نہیں کیا جا سکتا اسے سزا ملے گی۔ اس نے ہماری نافرمانی کی۔ اس نے اس سے محبت کی جس سے ہم محبت کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر بے ادبی اور گستاخی اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اسے فرمان بھیج کر فوراً بلاؤ۔ اور کوفہ و بصرہ کی ولایت کسی اور موزوں آدمی کے سپرد کر دو ! یہ ہمارا حکم ہے۔ اس کی تعمیل ہونی چاہیئے !"

" ابن زیاد کو ضرور سزا دیجئے۔ لیکن اس وقت نہیں۔ میں خود اس کی گردن اپنی تلوار سے کاٹ کر امیر المومنین کی خدمت میں پیش کروں گا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد۔

" تمہاری بات ہمیشہ مان لیتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ جب تک قائل نہ کر دو۔ کسی طرح مان سکتے !"

باب ۹

قتل کے مشورے

ابن سرجون نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے یزید کو مخاطب کرتے ہوئے سرگوشی کے لہجہ میں کہا:-
"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے دشمن کے مقابلہ میں چھوٹے دشمن کو زندہ رہنے دیا جاتا ہے"
یزید:- (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں ہمیں یاد آیا۔ ہم اسے لکھ چکے ہیں کہ اپنی صورت ہمیں اس وقت دکھائے جب حسینؓ ابن علیؓ کا خاتمہ کر لے"
ابن سرجون:- "غلام اسی امر کی یاد دہانی کرنا چاہتا تھا"
یزید:- لیکن اس وقت تک ہمیں یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ لیلےٰ سے محبت کرنے لگا ہے"
ابن سرجون:- "بجائے اس کے کہ وہ اس الزام میں قتل ہو کہ لیلیٰ سے محبت کرتا تھا۔ اگر اس الزام میں قتل کیا جائے کہ وہ حسینؓ ابن علی کا قاتل ہے۔ تو کیا یہ بات زیادہ مناسب نہیں ہوگی"
یزید:- "(مسکراتے ہوئے) "بڑے ہوشیار ہو"
ابن سرجون:- "غلام کا خیال یہ ہے کہ وہ اپنی خطا امیرالمومنین سے معاف کرا ہی لے گا۔
یزید:- "یہ تم نے کیونکر جانا؟"

ابن سرجون :۔ "میں جانتا ہوں وہ قسمت کا دھنی ہے۔ وہ امیرالمومنین کی بارگاہ سے انعام لے کر رہے گا۔"

یزید :۔ "کوئی خاص بات ہمارے علم میں لانا چاہتے ہو؟"

ابن سرجون :۔ "یہ تو امیرالمومنین کو معلوم ہی ہے کہ حسینؓ ابن علیؓ کوفہ کی طرف اپنے اہل وعیال اور اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ بڑھ رہے ہیں؟"

یزید :۔ "ہاں یہ ہم جانتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں کیوں آگے بڑھنے دیا جارہا ہے؟ اب تک ان کا کام کیوں نہیں تمام کیا گیا؟"

ابن سرجون :۔ "ہو جائے گا، بہت جلد ہو جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ حسینؓ نے ایک ایسی تجویز پیش کردی۔ جس نے اس کام میں تاخیر کردی۔"

یزید :۔ "وہ کون سی تجویز ہے؟"

ابن سرجون :۔ "حسینؓ نے سارا الزام اہل کوفہ پر ڈال دیا۔ اور تجویز پیش کی کہ یا تو انہیں یزید سے مل کر اپنا معاملہ طے کرنے کی اجازت دی جائے یا ــــــــ؟"

یزید :۔ "نہیں ہم نہیں ملنا چاہتے ــــــ اگر حسینؓ نے سرزمین شام میں قدم رکھا تو یہاں بھی ایک نیا فتنہ پیدا ہو جائے گا۔"

ابن سرجون :۔ "میں جانتا ہوں اور ابن زیاد بھی اس حقیقت سے واقف ہے۔"

یزید :۔ "پھر اس نے کیا کیا اس سلسلہ میں؟"

ابن سرجون :۔ "اس نے کہا :۔ ہم غیر مشروط اطاعت کے طالب ہیں ہتھیار ڈال دیجئے۔ امیرالمومنین کی بیعت کر لیجئے اور اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کر دیجئے۔ پھر ہم سوچیں گے کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک اور برتاؤ کرنا چاہیئے۔"

یزید :۔ (خوش ہوکر) "جزاک اللہ ــــــ بہت اچھا جواب دیا۔ اس نے تمہاری خوشنودی حاصل کر لی۔ واقعی وہ قسمت کا دھنی ہے۔"

ابن سرجون :۔ (ہنستے ہوئے) "یہی تو عرض کرتا تھا امیرالمومنین!"

یزید :۔ "ہاں، تمہاری بات ہمیشہ سچ ہوتی ہے۔"

ابن سرجون :۔ "ابن زیاد نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہر قیمت پر یہ کانٹا راستہ سے ہٹ جانا چاہیئے۔"

یزید :۔ "بے شک، ورنہ آج کوفہ کے لوگ بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کل بصرہ کے لوگ بھی کریں گے۔ پرسوں مصر میں یہی کھیل کھیلا جائے گا۔ پھر شام بھی کب تک اس فتنہ و فساد سے محفوظ و مامون رہ سکے گا۔"

ابن سرجون :۔ "بے شک ——— اس کا فیصلہ تو جنگِ صفین میں ہی ہو چکا۔"

یزید :۔ "حسینؑ کو اگر زندہ رہنے دیا گیا تو ہر وقت ہمارے سر پر تلوار لٹکتی رہے گی۔ ہر وقت یہ اندیشہ رہے گا کہ نہ جانے کب وہ قوت حاصل کر لیں اور ہمارے لئے ایک مصیبت بن جائیں۔"

ابن سرجون :۔ "جی ——— سب سے زیادہ خوشی اور مسرت کی بات یہ ہے کہ حسینؑ حدودِ حجاز سے باہر نکل آئے ہیں۔"

یزید :۔ "ہاں، وہاں ان پر کسی طرح کی سختی کی جاتی تو قیامت برپا ہو جاتی۔ اب وہ ہمارے چنگل میں ہیں۔ اب وہ بچ کر نہیں جا سکتے!"

ابن سرجون :۔ "یہ امیر المومنین کا اقبال ہے۔"

یزید :۔ "ابن زیاد کو لکھ بھیجو کہ حسینؑ کی کٹی ہوئی گردن ہمارے حضور میں روانہ کر دے۔"

ابن سرجون :۔ "غلام، امیر المومنین کے حسبِ ہدایت یہ بات پہلے ہی لکھ چکا ہے۔"

یزید :۔ "لیکن صرف حسینؑ کا قتل کافی نہیں ہے۔ اس خاندان کو بھی مٹ جانا چاہیئے۔ تاکہ آئندہ کوئی مدعیِ خلافت و امامت نہ پیدا ہو سکے۔ کوئی ہمیں چیلنج نہ کر سکے کوئی ہمارے لئے خطرہ اور وحشت کا سبب نہ بن سکے۔ کیا تمہیں ہماری رائے سے اتفاق نہیں ہے۔؟"

ابن سرجون :۔ "امیر المومنین کی یہ رائے بہت زیادہ صائب اور حالات کے قطعاً مناسب ہے۔"

یزید :۔ "ہم اتنا بڑا اقدام ہرگز نہ کرتے۔ اگر ہمارے وجود کو، ہماری حکومت کو، ہمارے جاہ و جلال کو خطرہ لاحق نہ ہوتا۔ یہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور چاہتے

ہیں کہ قرآن کی حکومت پھر سے قائم ہو جائے۔ یہ سنتِ رسولؐ کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ اسی کو دلیل راہ بنایا جائے۔ یہ لوگ اسلام کا نام لیتے ہیں اور زور دیتے ہیں۔ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کو داخل کر دیں۔ اور اس کی سلطانی قائم کر دی جائے باتیں بڑی اچھی ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہم اس کی۔ تعمیل نہیں کر سکتے۔"

ابن سرجون، "بے شک نہیں کر سکتے ——— اس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ امیرالمومنین تختِ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ قصرِ شاہی سنسان ہو جائے ——— یہاں کی حور وش اور پری جمال کنیزوں کو آزاد کر دیا جائے خزانۂ عامرہ کو عہد خلافت راشدہ کی طرح پھر سے بیت المال بنا دیا جائے۔ یہ شاعر جو دور دور سے آتے اور قصیدے سنا کر انعام و اکرام سے مالا مال ہو جاتے۔ فاقے کرتے رہیں۔ یہ لباسِ شاہی پھر دلق و گلیم سے بدل جائے۔ مختصر یہ کہ امیرالمومنین ہو رہیں۔ ایک مردِ فقیر بن جائیں۔ جس کا کام صرف یہ ہو کہ نماز پڑھے اور پڑھائے، روزہ رکھے اور رکھوائے۔ غریبوں کو عالی مرتبت لوگوں کی گرفت سے آزاد کر کے وہی مساوات قائم ہو جائے کہ اگر کوئی سلطانِ وقت بھی کسی عامی کے طمانچہ مار دے تو اسے بھی اپنا گال طمانچہ کے لئے پیش کرنا پڑے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ——— امیرالمومنین، امیرالمومنین ہیں۔ وہ بدلے ہوئے زمانے کے سلطان۔ ان کے قبضۂ قدرت میں ہفت اقلیم ہے۔ یہ خزانہ انہی کی جبروت سے جمع ہوا ہے۔ یہ ممالک انہی کے عساکر قاہرہ نے فتح کئے یہ حشمت و وجاہت خود انہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ وہ کیسے ان سب سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔!"

یزید نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"ابن سرجون! خاموش ہو جاؤ۔ ان باتوں سے دل دہلتا ہے۔ اس ذکر کو چھوڑو۔ حباب کو بلاؤ۔ ہم اس کا گانا سنیں گے۔ اس کا رقص دیکھیں گے۔ اس کے ہاتھ سے شراب پئیں گے ———!"

باب ۸۰

مومن کی معراج

دشمن کی فوجوں اور مسلح دستوں میں غیر معمولی اضافہ ہوچکا ہے۔ اور مزید آمد جاری ہے۔ حضرت امام حسینؑ، دشمن کی نیت بھانپ چکے ہیں۔ اور راضی بہ رضائے الٰہی ہوکر جنگ کا تہیہ کر چکے ہیں۔ وہ اپنے خیمہ میں تشریف فرما ہیں۔ اتنے میں شمر کے مشورے سے عمرو بن سعد الٹی میٹم بھیجتا ہے:۔

"اب صرف دو ہی صورتیں رہ گئی ہیں۔ جنگ یا اطاعت، یا تو بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو ہمارے حوالہ کر دیجئے۔ ورنہ پھر لڑائی کے لئے تیار ہو جائیے ——— !"

حضرت امام نے خاموشی کے ساتھ یہ پیام سنا فرمایا:۔

"ان لوگوں کو کل تک ٹالو۔ !"

عباسؓ بن علیؓ یہ سن کر باہر گئے۔ اور فرمایا:۔

"ہم تمہارے مطالبہ کا جواب کل دیں گے۔ اگر منظور کرنا ہوا تو منظور کرلیں گے اور اگر مسترد کرنا پڑا تو مسترد کر دیں گے !"

عمرو بن سعد اور شمر نے کچھ زیادہ حجت نہیں کی، چلے گئے۔

یہ نو محرم کا واقعہ ہے۔

حضرت امام حسینؑ نے اپنے بھائی عباسؓ بن علیؓ سے فرمایا:۔

"ہم نے یہ مہلت اس لئے لی ہے۔ کہ آج کی رات جی بھر کے اپنے رب

کی عبادت کرلیں۔ دعائیں مانگ لیں، استغفار کرلیں۔"
اس کے بعد حضرت امام نے اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کو مجتمع فرمایا۔ اور ان کے سامنے ایک خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:-

"میں خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور مصیبت و راحت ہر حالت میں اس کا شکر گزار ہوں ــــ"

اے اللہ!

"میں تیری حمد و ستائش کرتا ہوں کہ تو نے ہمارے خاندان کو نبوت سے سرفراز کیا۔ ہمیں کان دیئے کہ تیرا کلام سن سکیں۔ آنکھیں مرحمت فرمائیں کہ تیری بے شمار نعمتوں کا نظارہ کر سکیں۔ دل دیا کہ غور و فکر اور تدبر و تامل سے کام لے سکیں۔ تو نے ہمیں قرآن کا علم دیا اور دین کی فراست عطاء فرمائی۔ اب تو ہمیں اپنے سپاس گزار بندوں میں بھی شامل فرمالے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے زیادہ وفادار اور نیک ساتھی کہیں نہیں دیکھے۔ اور اپنے اہل بیت سے زیادہ نیکوکار اور صلۂ رحمی کرنے والے عزیز اور رشتہ دار کہیں نہیں پائے۔

اللہ تم سب کو جزائے خیر دے۔ تم نے ہمارے ساتھ نیک برتاؤ کیا۔ ہماری مدد کی۔ کل کا دن میرے اور دشمنوں کے درمیان آخری فیصلہ کا دن ہے۔ ان لوگوں کو صرف میری ضرورت ہے۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ واپس چلے جاؤ۔ رات نمودار ہو چکی ہے۔ میرے اہل بیت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو۔ اور تاریکی سے فائدہ اٹھاتے جہاں چاہو منتشر ہو جاؤ۔ اور اس طرح اپنی جانوں کو ہلاکت سے بچاؤ!"

حضرت امام کی یہ تقریر سب نے گوش و ہوش سے سنی۔ اور متفقہ طور پر یک زبان ہو کر کہا:-

"آپ کے بعد زندگی میں ہمارے لئے کیا لذت رہ جائے گی! خدا ہمیں وہ دن نہ

دکھائے کہ آپ نہ ہوں اور ہم ہوں!"

اس گفتگو کے بعد آپ اپنے خیمہ میں تشریف لے آئے۔ حضرت ابوذر غفاری کے خادم خاص جوین آپ کی تلوار پر صیقل کر رہے تھے۔ اور آپ کی زبان پر یہ اشعار جاری تھے:-

"اے زمانے!
تجھ پر افسوس ہے۔
تو کیسا بے وفا دوست ہے؟
صبح و شام تیرے ہاتھوں کتنے لوگ مارے جاتے ہیں!
تو کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا۔
اور کسی سے کوئی معاوضہ نہیں قبول کرتا۔
اب سارا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔
اور ہر زندہ
موت کے راستہ پر چلا جا رہا ہے!" لہ

آپ نے کئی بار یہ شعر دہرائے۔ حضرت زینب بنت علیؑ نے یہ شعر سنے تو دوڑتی ہوئی آپ کے پاس آئیں۔ اور کہنے لگیں:-

"کاش موت آج میری زندگی کا خاتمہ کر دیتی۔ میری ماں فاطمہؑ مجھے تڑپتا اور بلکتا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میرے والد علیؑ دنیا سے رخصت ہو گئے میرے بھائی حسنؑ بھی باقی نہ رہے۔ دنیا سے جانے والے ان لوگوں کے جانشین اور ہم سب کے پاسبان و نگہبان بس اب تم ہی رہ گئے ہو۔"

حضرت امام نے زینب کے یہ الفاظ سنے اور باوقار لہجہ میں ارشاد فرمایا:-

"میری بہن! اپنے علم اور وقار کو شیطان کے حوالے نہ کرو۔"

لہ:- یہ روایت حضرت امام زین العابدین کی ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

" جو مسلمان ہے وہ سب کچھ ہے۔ اسلام سے بڑا شرف اور فخر کوئی نہیں۔ اسی لئے اسلام نے مساوات کی تعلیم دی ہے ہم میں اگر کوئی برتر ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔"

ایک اور ساتھی نے عرض کیا:۔

" کل جنگ بڑی خونریز ہوگی؟"

آپ نے فرمایا:۔

" یہ زندگی، کون نہیں جانتا فانی ہے۔ ہم کل کی تیاری کر رہے ہیں۔ کہ لڑائی کریں گے۔ دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ لیکن اس کی ضمانت بھی کون دے سکتا ہے۔ کہ کل تک زندہ رہیں گے یا نہیں جب زندگی اتنی بے حقیقت اور سراب آسا چیز ہے تو کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی حماقت ہو سکتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دین کا سودا کر لیا جائے! افسوس لوگ یہی کرتے ہیں۔ اور نہیں سوچتے۔ کیا کر رہے ہیں! ان کا سودا کیسا گھاٹے کا سودا ہے۔ ان کی تجارت کیسے خسارہ کی تجارت ہے۔"

اس گفتگو کے بعد پھر اپنے خیمہ میں واپس تشریف لائے ــــــــــ اور عبادت میں مصروف ہو گئے۔ آپ کا معمول تھا کہ رات کا بڑا حصہ عبادت اور ریاضت میں صرف کرتے تھے۔

آپ کے فرزند و لبند حضرت امام زین العابدین بیمار تھے۔ اور حضرت زینب ان کی تیمار داری میں مصروف تھیں۔ حضرت امام کے الفاظ سے امام زین العابدین نے سمجھ لیا تھا کیا ہونے والا ہے اور حضرت زینب بھی محسوس کر رہی تھیں کہ حالات نے کیسی کروٹ لی ہے۔ اور اب کیا کچھ رونما ہونے والا ہے۔

زہیر اور ربیع اپنے خیمہ میں تھے۔ وہ دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز ہو کر سوچ رہے تھے کہ دشمن کی اس ٹڈی دل فوج کا کس طرح مقابلہ کیا جائے گا۔ باتیں کرتے کرتے ربیع نے کہا:۔

وہ کہنے لگیں :-

"خدا کی قسم، آپ کی باتوں سے میرے دل کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں"

یہ کہہ کر وہ رونے لگیں اور روتے روتے بیہوش ہو گئیں۔ آپ اُٹھے۔ ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو آپ نے پھر انہیں مخاطب کیا اور کہا :-

"بہن! خدا سے ڈرو۔ اس سے تسکین حاصل کرو۔ اور اچھی طرح اس حقیقت کو جان لو۔ کہ اس زمین پر بسنے والی ہر ہستی ایک دن مرے گی۔ باقی رہنے والی ذات صرف خدائے واحد و قیوم کی ہے۔ میرے والد علیؓ مجھ سے بہتر تھے۔ میری ماں فاطمہؓ مجھ سے بہتر تھیں۔ میرے بھائی حسنؓ مجھ سے بہتر تھے میرے اور ہر مسلمان کے لئے صرف ایک ذاتِ رسولِ اکرمؐ کی ایسی ہے جو اسوہ اور نمونہ ہے۔ تم اس نمونہ سے صبر حاصل کرو"

بڑی دیر تک آپ زینب سے اس طرح تسکین و تسلی کی باتیں کرتے رہے۔ پھر باہر تشریف لائے۔ اور اپنے ساتھیوں سے کل کی لڑائی کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔ اثناء گفتگو میں ایک شخص نے عرض کیا :-

"یہ لوگ چاہتے ہیں ہم ان کی غیر مشروط اطاعت کریں ـــــ حالانکہ ہماری گردن آج تک کسی کے سامنے خم نہیں ہوتی"

یہ سن کر پُر جلال لب و لہجہ میں آپ نے فرمایا :-

"گردن کسی کے سامنے خم نہ ہونا شرف اور فخر کی بات نہیں۔ یہ غلط قسم کا افتخار اسلام نے ختم کر دیا ہے۔ بخدا، نہ ہم اپنی سر بلندی اور سرفرازی کے متمنی ہیں۔ نہ دوسروں کو سرنگوں اور حقیر و ذلیل دیکھنا چاہتے ہیں۔ خدا کے نزدیک بزرگی کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ یہ لوگ اگر راہِ حق پر گامزن نہ ہوتے۔ اور اسلام کے سچے پیرو ہوتے۔ قرآن و سنت کو فراموش نہ کر چکے ہوتے تو ہم بڑی مسرت کے ساتھ ان کی اطاعت کرتے"

ایک آدمی نے پوچھا :-

"خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ ہوتے؟"

"میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ نہ شکست میرے ہاتھ میں ہے نہ فتح نہ کامرانی، نہ ناکامی، مجھے معلوم ہے ہم کتنی کم تعداد میں ہیں اور دشمن کے پاس کتنا عظیم الشان لشکر ہے۔ اگر سب سے پہلے مجھے شرف شہادت حاصل ہو گیا تو میں اپنے اوپر فخر کروں گا ــــــ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے سامنے حضرت امام پر کوئی آفت آئے۔"

باب ۸۱

جنت کا انتخاب

آج دس محرم ہے!

عمرو بن سعد کے لشکر نے ہر چہار طرف سے حضرت امام کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لشکر کا ایک آدمی بھی ادھر سے ادھر نہیں جا سکتا تھا۔ یزیدی لشکر میں آدمیوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی۔ ان میں پیادے بھی تھے، اور سوار بھی، تیر انداز بھی اور شمشیر زن بھی، نیزہ باز بھی اور پھکیت بھی، اور حسینی لشکر صرف ۷۲ آدمیوں پر مشتمل تھا۔

یہ ۷۲ آدمی کفن سر سے باندھے میدان میں اترے تھے۔ کہ حق پر اپنی زندگی قربان کر دیں گے۔ اسلام کی سربلندی پر اپنی آخری پونجی بھی نثار کر دیں گے۔"

گرمی کا موسم تھا۔ تپتی ہوئی ریت تھی۔ بادِ سموم کے جھکڑ چل رہے تھے۔ سامنے دریائے فرات بہہ رہا تھا۔ اور اس دریا پر پہرہ لگا ہوا تھا ——— کہ حسینؑ ابن علیؓ تک ایک قطرہ بھی نہ جا سکے۔ حسینؑ کے اہل و عیال پیاس سے تڑپتے رہیں، بلکتے رہیں۔ ان کے حلقوم و گلو پانی سے آشنا نہ ہوں۔

عین اس وقت کہ لڑائی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، عمرو بن سعد اور شمر ذی الجوشن کے سپاہی کیل کانٹے سے لیس جنگ کے لئے تلے کھڑے تھے۔ کہ امامِ عالی مقام نمودار ہوئے۔ آپ نے لشکرِ اشقیا پر ایک نظر ڈالی۔ اور حمد و ثنا کے بعد ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔ آپ نے فرمایا:-

" اے لوگو!

جلد بازی سے کام نہ لو۔ سنو میں کیا کہہ رہا ہوں؛ مجھے حق ہے کہ تمہیں سمجھاؤں۔ اور اس حق کو مجھے استعمال کر لینے دو۔ میں کیوں آیا؛

یہ معلوم کرو۔ اور یہ معلوم کرنے کے بعد اگر انصاف سے کام لوگے تو تمہارا شمار خوش بخت انسانوں میں ہوگا۔ اور اگر انصاف سے کام لینے پر تیار نہ ہوئے تو تمہیں اس کا بھی اختیار ہے۔ اپنے رفقاء سمیت سارا زور صرف کر ڈالو۔ اور جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو۔ میں خدا کی مرضی پر شاکر ہوں اور اپنا معاملہ اسی کو سونپتا ہوں!

لوگو!

میرے حسب نسب پر غور کرو۔ دیکھو میں کون ہوں؛ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو۔ اور خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔

سوچو، کیا تمہیں یہ بات زیب دیتی ہے۔ کہ مجھے قتل کر ڈالو؛ میری توہین کرو؛ کیا میں تمہارے نبی کا نواسا اور ان کے چچازاد بھائی کا بیٹا، اور ان کی بیٹی فاطمہؓ کا لختِ جگر نہیں ہوں۔ کیا تم اپنے رسولؐ کی وہ بات بھول گئے۔ جو انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں ارشاد فرمائی تھی؛ انہوں نے ہم دونوں کو جوانانِ جنّت کا سردار فرمایا تھا۔ اگر میرا یہ بیان سچا ہے اور بلاشبہ سچا ہے کیونکہ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ خدا جھوٹ بولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے آج تک کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ تو بتاؤ کیا تمہیں یہی سزاوار ہے کہ ننگی تلواروں سے میرا مقابلہ کرو؛ اگر مجھے جھوٹا سمجھتے ہو۔ تو آج بھی تم میں وہ لوگ موجود ہیں۔ جنہوں نے میرے بارے میں رسول اللہؐ کی حدیث سنی ہے۔ تم ان سے تصدیق کر لو۔

اے لوگو!

بتاؤ، کیا اس حدیث کے ہوتے ہوئے بھی تم میرا خون بہانے کے ارادہ

سے باز نہیں آؤ گے؟ پھر یہ سوچو، میں تم سے چاہتا کیا ہوں؟ میں تم سے کہتا کیا ہوں؟ میں تمہیں حکم کس چیز کا دیتا ہوں؟ میں تم سے یہ نہیں چاہتا کہ مجھے اپنا بادشاہ اور سلطان بنا لو۔ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دو۔ میں تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ قرآن و سنت کو فراموش کر دو۔ میں تو اس رشتہ کو جوڑنا چاہتا ہوں۔ جو تمہارے اور خدا کے درمیان تھا لیکن ٹوٹ گیا۔ میں صرف اس بات کا متمنی ہوں کہ تم مسلمان بن جاؤ۔ کسی فرد واحد کی اطاعت نہ کرو۔ خدائے واحد کی اطاعت کرو۔ ان قوانین کو، ان احکام کو، ان ہدایات کو ٹھکرا دو۔ جو قرآن و حدیث کے خلاف ہوں۔ وہ زندگی بسر کرو جس کی طرف اسلام رہبری کرتا ہے۔ جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبری فرمائی تھی۔ کیا میرا یہی جرم ہے۔ جس نے تمہیں میرے خون کا پیاسا کر دیا ہے۔ اس خطا پر تم مجھ سے لڑنے کے لئے یہ ننگی تلواریں لے کر نکلے ہو؟"

امام عالی مقام کی اس تقریر نے سنگ دل اور دغا باز کوفیوں کے دل پر کوئی اثر نہیں کیا۔ عمرو بن سعد اور شمر ذی الجوشن ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے۔ ان لوگوں کے دل میں بار بار ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ نادر موقع ہاتھ آگیا ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا چاہئے!

لیکن نہیں ——— اس لشکر میں ایک شخص تھا، جس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ جس کا سینہ محشرستان جذبات بنا ہوا تھا ——— یہ حُر تھا!

امام عالی مقام کی اس تقریر نے حُر کے دل کو پگھلا دیا۔ اس کا دل لرزنے لگا۔ اس نے محسوس کیا اس سانحہ کا جو بہت جلد رونما ہونے والا ہے۔ صرف وہی ذمہ دار ہے۔ اس کے دل نے آواز دی:-

"ابھی موقعہ ہے اور اس غلطی کی تلافی بوجہ احسن ہو سکتی ہے۔"

وہ سیدھا امیر لشکر عمرو بن سعد کے پاس گیا۔ اور اس سے کہا:-

"خدا تمہیں ہدایت عطا فرمائے۔ بتاؤ کیا واقعی تم نے فیصلہ کر لیا ہے، کہ سبطِ رسولؐ سے جنگ کرو گے؟"

عمرو بن سعد نے بغیر کسی تامل کے نہایت اطمینان کے ساتھ فیصلہ کن لہجہ میں کہا:۔

"ہاں! خدا کی قسم ضرور لڑوں گا۔ ایسی لڑائی لڑوں گا کہ تم اپنی آنکھوں سے سروں کو کٹتے اور شانوں سے ہاتھوں کو الگ ہوتے دیکھ لو گے۔"

حُر سے ضبط نہ ہو سکا:۔

تم بار بار جنگ کا نام کیوں لیتے ہو؟ ——— کیا یہ جنگ ہے؟ ایک طرف گنتی کے بہتر۷۲ نفوس، دوسری طرف دل بادل لشکر ——— کیا جنگ اسی طرح ہوتی ہے؟ کیا لڑائی یوں ہی لڑی جاتی ہے؟ حسینؑ کے پاس بھی لشکر ہوتا اور تمہارے اور ان کے لشکر میں صرف ۱۹، ۲۰ کا فرق ہوتا تو بات بھی تھی۔ پھر بیشک لڑائی کا مزہ تھا۔ لیکن اس تماشا کو جنگ کہتے ہوئے کم از کم ایک بہادر آدمی کو شرمانا چاہیئے ———!

عمرو بن سعد یہ باتیں سننے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ بگڑ گیا۔ اس نے کہا:۔

"تم حد سے آگے بڑھ رہے ہو۔ تمہارا کام، میرے احکام کی اطاعت ہے، مجھ پر نکتہ چینی نہیں۔ جنگ ہو گی اور تمہیں لڑنا پڑے گا؟"

یہ کہہ کر وہ غصہ اور برہمی کے عالم میں آگے بڑھ گیا ——— اور حُر نے آہستہ آہستہ اپنے قدم امام حسینؑ کے لشکر کی طرف بڑھانا شروع کیئے۔

حُر کے ایک ہم قبیلہ شخص مہاجر بن اوس نے اس سے پوچھا:۔

"کیا تم حسین پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہے ہو؟"

حُر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس وقت اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا وہ عجیب کشمکش کے عالم میں ہے۔

مہاجر نے حُر کی یہ حالت دیکھی تو اس کے دل میں اندیشہ ہائے دور دراز پیدا ہونے لگے۔ آخر وہ خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے کہا:۔

"میں نے کسی جنگ میں تمہارا یہ رنگ نہیں دیکھا۔ جو آج دیکھ رہا ہوں۔ اگر مجھے

دریافت کیا جائے۔ کوفہ میں سب سے جیالا اور دلیر شخص کون ہے ؟ تو بے تامل میری زبان پر جس شخص کا نام آئے گا۔ وہ صرف تم ہو۔ لیکن آج تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے ؟ —— خدا کے لئے بتاؤ۔ تمہاری کیا کیفیت ہے ؟"

حُر مسکرایا۔ اور اس نے کہا :۔

"اب تک میں کش مکش میں گرفتار تھا۔ میرے ایک طرف جنت تھی، ایک طرف دوزخ۔ اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب درپیش۔ اب میں خوش ہوں، بے فکر ہوں۔ میں نے انتخاب کر لیا ؟"

مہاجر نے پوچھا :۔

"کس چیز کا انتخاب کیا تم نے ؟"

وہ سرگوشی کے عالم میں گویا ہوا :۔

"میں نے جنت کا انتخاب کر لیا —— !"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ اور دم کے دم میں امام عالی مقام کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے عرض کیا :۔

"اے سبطِ رسول اللہؐ ! خدا مجھے آپ پر قربان ہونے کی سعادت عطا فرمائے۔ میں ہی وہ بدنصیب انسان ہوں۔ جس نے آپ کو اس جگہ محصور کر لیا۔ خدا علیم و خبیر ہے کہ مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کریں گے۔ میرا خیال تھا معاملات درست ہو جائیں گے۔ اگر ذرا بھی اندیشہ ہوتا کہ یہ اس سلوک پر اتریں گے تو بخدا اس گستاخی کا ارتکاب نہ کرتا۔ اب میں تائب، نادم اور شرمسار ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ جب تک زندہ ہوں آپ کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دوں گا۔ خواہ اس راستہ میں میرا ایک ایک عضو بدن کٹ جائے۔

یہ کہتے کہتے حُر کی آنکھیں موتیوں جیسے آنسو برسانے لگیں۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اور وہ خاموش ہو گیا۔

حضرت امام نے اسے گلے لگا لیا اور فرمایا:-

"میرے بھائی ندامت کے آنسو گناہ کے ہر دھبہ کو دھو دیتے ہیں۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری غلطیوں سے درگزر کرے۔"

حُر کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:-

"یا امام! میں نے صراطِ مستقیم پالی۔ میں دیکھ رہا ہوں یہ راستہ جنت کی طرف جاتا ہے!"

باب ۸۴

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

حُر اور حضرت امام حسینؑ میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ عمرو بن سعد اپنے لشکر کے علمبردار، کے ساتھ آگے بڑھا۔ اور ترکش سے ایک تیر نکال کر لشکرِ امام پر چلایا اور زور سے پکارا،

"لوگو! گواہ رہنا۔ سب سے پہلا تیر میں نے چلایا ہے"

اس کے بعد باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔

کچھ عرصہ تک انفرادی جنگ ہوتی رہی ایک آدمی لشکرِ یزید سے نکلتا، ایک لشکرِ امام سے۔ اور دونوں میں مقابلہ ہوتا۔ لیکن اس جنگ میں یزیدی لشکر کے بہت سے آدمی ہلاک ہوئے۔ اور لشکرِ امام سے جو آدمی نکلا کامیاب رہا۔ یہ دیکھ کر ابن سعد نے عام جنگ کا اعلان کر دیا۔ اور حسینؑ کا پورا لشکر ان ۷۲ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ جو خدا کی راہ میں جان دینے نکلے تھے۔ ٹوٹ پڑا اور گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں سب سے پہلے جس شخص نے جامِ شہادت نوش کیا وہ مسلم بن عوسجہ تھے۔

اتنے میں حضرت حبیب بن مظاہر تشریف لائے۔ اور انہوں نے کہا:۔

"میں تمہیں جنت کی بشارت دیتا ہوں۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ میں بھی بہت جلد تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ تو تم سے وصیت کی درخواست کرتا۔ اور اس کی تعمیل کرتا"

مسلم بن عوسجہ نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے حضرت امام کی طرف اشارہ کیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا:۔

"میں تمہیں صرف ان کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ مرجانا مگر اپنے سامنے ان پر کوئی آنچ نہ آنے دینا"

یہ کہا اور گردن ڈال دی ـــــ راہِ حق کا شہید اپنے رب سے انعام لینے اس کے دربار پہنچ گیا۔

پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

دونوں لشکر آپس میں گتھے ہوئے تھے۔ حضرت امام کے ساتھی جان توڑ کر لڑ رہے تھے۔ اس لئے کہ ان کے سامنے صرف شہادت تھی۔

اور یزید کے لشکر کے سورما تعداد میں بے انتہا زیادہ ہونے کے باوجود ان مردوں کے سامنے آتے ہوئے جھجکتے تھے۔ اس لئے کہ وہ زندہ رہنے کے لئے لڑ رہے تھے لشکر امام کا ایک ایک آدمی اس طرح میدان میں آتا تھا جیسے شیر کچھار سے جنگل میں آتا ہے۔ اور اسے دیکھتے ہی جنگل کے جانور ادھر ادھر دبکنے لگتے ہیں۔ وہ جس طرف رخ کرتا تھا صفوں کی صفیں الٹ دیتا تھا۔ انہی میں وہ مردِ مجاہد بھی تھا جس کا نام یزید بن کندی تھا۔ یہ اپنے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور تیر پر تیر چلانے شروع کر دیئے اس نے سو تیر چلائے جن میں صرف پانچ خطا گئے۔ اس کے ہر تیر پر حضرت امام حسینؓ فرماتے:۔

"اے اللہ! اس کے تیروں کو نشانہ پر بٹھا، اور اسے جنت عطا فرما!"

آخر جب لشکر امام کے غازیوں نے یزیدی لشکر کو نشانہ پر دھر لیا۔ تو سواروں کے سردار، عروہ بن قیس نے عمرو بن سعد سے مزید کمک طلب کی۔ اس نے کہا:۔

"ان مٹھی بھر آدمیوں نے ہمارا حال ابتر کر دیا ہے"

عمرو بن سعد نے فوراً پانچ سو تیر اندازوں کا ایک دستہ حصین بن نمیر کی سرداری

میں روانہ کردیا۔ ان لوگوں نے مسلسل تیر چلانا شروع کئے۔ حُرّ کا گھوڑا زخمی ہوگیا۔ وہ گھوڑے سے کود پڑا اور تلوار ہاتھ میں لے مردانہ وار دشمن کے لشکر میں گھُس گیا۔ اور پرے کے پرے صاف کردیئے۔ دشمن کے سواروں اور بہادروں نے ہر چہار طرف سے گھیر لیا۔ اور اُس پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے بارش کے قطرے۔ بالآخر راہِ وفا کا یہ رہرو بھی شرف شہادت سے سرفراز ہوا۔

ان شہید ہونے والوں میں عبداللہ بن عمیر کلبی بھی تھے۔ ان کی بیوی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ اپنے شہید شوہر کے سر سے مٹی صاف کرتی جاتی تھیں، اور کہتی جاتی تھیں۔

"تمہیں جنت مبارک ہو ——— میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں۔ تم نے آلِ محمدؐ کی خدمت میں اپنی جان دی ہے۔"

شمر نے یہ منظر دیکھا تو آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے اپنے غلام رستم سے کہا:۔

"دیکھتا کیا ہے، اس عورت کا خاتمہ بھی نہیں کرسکتا؟"

رستم نے خیمہ کی چوب سے اس شہید کی بہادر بیوی کا سر پھاڑ دیا۔ اور وہ بھی فوراً اپنے شوہر سے جا ملی۔

جنگ کی شدت، آفتاب کی حدت اور دھوپ کی تمازت بڑھتی جارہی تھی۔ اگرچہ بہت سے کوفی مارے جاچکے تھے۔ لیکن حضرت امام کے رفقاء میں سے بھی متعدد آدمی مرتبۂ شہادت پر فائز ہوچکے تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ یزیدی لشکر کے صدہا آدمی بھی اگر ہلاک ہوجاتے تو کوئی بات نہ تھی۔ لشکر کا دم خم قائم تھا۔ یہ کمی محسوس بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کے برعکس لشکرِ امام کے چند نفوس بھی شرفِ شہادت حاصل کرتے تھے۔ تو ناقابلِ تلافی کمی محسوس ہونے لگتی تھی۔ اسی حالت میں ظہر کا وقت آگیا آپ نے اپنے رفقا سے فرمایا:۔

"ظہر کا وقت آگیا ہے۔ دشمن سے کہو۔ ہمیں نماز پڑھنے کی مہلت دے۔"

لیکن شمر اور عمرو بن سعد نے یہ بات نہیں مانی۔ عمرو بن سعد نے کہا:۔

"یہ لڑائی کا میدان ہے، مسجد نہیں؟"

شمر نے جواب میں کہا :-

وہ وقت جلد آنے والا ہے، جب حسینؓ کی نماز پڑھی جائے گی۔ حسینؓ سے کہہ دو جنگ جاری رہے گی وہ ملتوی نہیں کی جا سکتی "

امام حسینؓ تک جب یہ جواب پہنچا۔ آپ نے فرمایا :-

" کوئی حرج نہیں۔ ہم جنگ بھی جاری رکھیں گے، اور نماز بھی پڑھیں گے "

پھر آپ نے نماز کا اہتمام شروع کر دیا۔ آدھے آدمیوں نے پہلے نماز پڑھ لی اور بقیہ نصف نے جنگ جاری رکھی۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے نماز کی نیت باندھی اور پہلے لوگوں نے جنگ شروع کر دی۔

نافع بن ہلال بجلی نے اپنے تیروں سے کوفی فوج کے بارہ آدمی ہلاک کئے اور ستو سے زیادہ آدمیوں کو مجروح کیا۔ شمر کا اشارہ پا کر ایک بہت بڑا دستہ ان کی طرف بڑھا اور انہیں اپنی حراست میں لے کر شمر کے پاس پہنچا دیا۔ شمر انہیں لے کر عمرو بن سعد کے پاس پہنچا اور کہا :-

" یہ ہے وہ شخص جس کے بے پناہ تیروں نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو مجروح کیا۔ اور بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا "

نافع کا سارا بدن خون سے تر تھا وہ لہولہان ہو رہے تھے۔ انہوں نے ابن سعد سے کہا :-

" میں نے تمہارے بارہ آدمیوں کو موت کا لقمہ بنایا اور سینکڑوں کو زخمی کر دیا ـــــ افسوس، میرا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا۔ اگر وہ سلامت ہوتا تو تمہارے آدمی کسی طرح مجھے گرفتار نہیں کر سکتے تھے "

شمر یہ سن کر غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنی تلوار میان سے نکال لی۔ نافع نے حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا :-

" اگر تو مسلمان ہوتا تو ہمارا خون کرتے ہوئے ڈرتا اور قاتل کی حیثیت سے خدا کے سامنے پیش ہوتے ہوئے جھجک محسوس کرتا۔ خدا کا شکر ہے۔ ہماری موت کے موجب

وہ لوگ ہیں۔ جو خدا کی بدترین مخلوق ہیں۔"

یہ سن کر شمر کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے تلوار سونت لی۔ اور ایک ہی وار میں خدا کے ایک نیک اور صالح بندے کی گردن اڑا دی اور جھلاتے ہوئے لہجہ میں کہا :-

"خدا کی بدترین مخلوق تو تھا جو ہمارے ہاتھ سے ہلاک ہوا ۔۔۔!"

نافع کے کٹے ہوئے سر پر وہ اطمینان تھا، وہ تابانی اور درخشانی تھی۔ جو نفس مطمئنہ کی مظہر تھی۔ اور جس سے ابن سعد محروم تھا ۔۔۔۔۔ ابن زیاد بھی اور شمر ذی الجوش بھی۔

جنگ پوری شدت اور ہولناکی کے ساتھ جاری تھی۔

کوفی فوج کے سوار اور پیادے دھڑا دھڑ قتل ہو رہے تھے۔ لشکر امام کے غازی اور مجاہد ہنستے مسکراتے اپنی جان نثار کر رہے تھے۔ بچے کھچے جاں نثاروں کے بھی عزم و حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ وہ حضرت امام کو اپنے گھیرے میں لیتے ہوئے تھے۔ خود قربان ہو جانا چاہتے تھے مگر یہ گوارا نہ تھا کہ امام حسینؓ زخمی بھی ہوں انہوں نے طے کر لیا تھا کہ جب تک ان میں سے ایک فرد بھی زندہ ہے۔ دشمن کو امامؑ تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ یہاں تک کہ اپنے امام کی حفاظت کرتے کرتے ان میں سے ہر ہر شخص مرتبہ شہادت حاصل کرے۔ یہ لوگ دشمن کا وار اپنے سر اور سینہ پر روک رہے تھے۔ ان کے بدن زخموں سے چھدے ہوئے تھے۔ اور حلقوم و گلو سے خون کے فوارے جاری تھے۔ لیکن عزم و استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے تیور وہی تھے۔ حوصلہ وہی تھا۔ جوش و خروش میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔

اسی اثناء میں ایک پُرجوش شخص حنظلہ بن سعد شبابی آگے بڑھا۔ یہ کوفہ کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس کی سرشت وہ نہ تھی جو کوفیوں کی تھی۔ اس نے دشمن کے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :-

" اے اہل کوفہ !

میں ڈرتا ہوں۔ تمہارا حشر بھی عاد و ثمود کی طرح نہ ہو۔ اور تم ہلاک و برباد نہ ہو جاؤ۔"
یہ کہہ کر حنظلہ تلوار سونتتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور دشمن کی صف میں گھس گئے ۔۔۔
یہاں تک کہ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اس طرح دو غفاری بھائی عبداللہ اور عبدالرحمان، پروانہ وار اپنے امام پر نثار ہو گئے۔ ان کے بعد دو جابری نوجوان سیف بن حارث اور مالک بن عبد آگے بڑھے۔ اور اس وقت تک لڑتے رہے۔ جب تک ان کی گردن نہ کٹ گئی۔ عباس بن ابی شبیب اور شوزب حضرت کو سلام کر کے میدان میں گئے۔ اور بے جگری سے لڑتے ہوئے دارِ فانی سے منزلِ بقا میں پہنچ گئے۔ اب خاندانِ اہلِ بیت کے علاوہ صرف دو آدمی اور رہ گئے تھے۔ سوید بن عمر اور بشیر بن عمرو، یہ بھی بغیر کسی ہراس کے لڑتے رہے، یہاں تک کہ اپنی جان رضائے الٰہی پر قربان کر دی ــــــــ اور ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو گئے۔ لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون ہ۔ "جو لوگ خدا کی راہ میں قتل ہوں۔ انہیں مردہ نہ کہو۔ یہ لوگ زندہ ہیں۔ لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے!"

باب ۸۳

قتلِ حسینؑ

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمین

کربلا کا میدان، محبانِ اہل بیت کے خون سے لالہ زار ہو رہا تھا ——— جاں نثارانِ حسینؑ ایک ایک کر کے رختِ سفر باندھ کر آخرت کی منزل کی طرف دست و پا بریدہ، حلقوم و گلو تراشیدہ، سرخ رو اور کامراں ہو کر روانہ ہو چکے تھے اب صرف چند افراد باقی رہ گئے تھے جو چمنستانِ رسالتؐ کے گل نو دمیدہ تھے۔

ذرا تصور کیجئے:-

یہ مسلمان ہیں۔ اپنے تئیں مسلمان کہتے ہیں۔ قرآن ان کی مذہبی کتاب ہے جو خدا کے برگزیدہ بندے اور آخری رسول پر نازل ہوئی تھی۔ اور یہ تلواریں سونتے، نیزے ہاتھ میں لئے، خنجر حمائل کئے۔ تیر و سناں سے مسلح۔ اس شخص کی گردن کاٹنے کے لئے اتنے بڑے لشکر کی صورت میں مجتمع تھے۔ جو ان کے رسولؐ کا نواسہ تھا۔ لختِ جگر تھا۔ وہ حسینؑ ہے جو عہدِ طفلی میں دوشِ رسولؐ پر سوار ہوتا تھا۔ یہ چمن نبوتؐ کا وہ گلِ سرسبد ہے۔ جس کے ہونٹوں کو دنیا کے سب سے افضل انسان، سرورِ انبیاء اور فخرِ موجوداتؐ نے چوما تھا، یہ وہ شہسوار ہے، جس کے بارے میں نطقِ رسالتؐ نے شہادت دی تھی کہ جوانانِ جنت کا سردار ہے۔ اور آج محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والے، محمدؐ کے نواسے کو، جوانانِ جنت کے سردار کو قتل کرنے کے درپے تھے۔ انہوں نے اس پر پانی بند کر دیا ہے۔ اس کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اور اسے غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور یہ حسینؑ ہے کون؟-

(خاکم بدہن) پسرِ نوح؟ جس سے احتراز واجب ہے اور اجتناب لازم آئے؟

نہیں ــــــ!

یہ حسینؑ ہے۔ اس کی رگوں میں فاطمہؑ بنت محمدؐ اور علیؑ ابن طالبؑ کا خون گردش کر رہا ہے۔ اس کی زندگی عبادت ہے، زہد و پارسائی سے اس کی راتیں عبادت و ریاضت میں بسر ہوتی ہیں۔ اس کا اخلاق بلند، اس کا کردار ارفیع، اس کی سیرت طاہر، اس کی شخصیت پاک ہے۔ یہ قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ حدیثِ رسولؐ کی نشر و تبلیغ میں مصروف ہے نوعمری کے زمانہ سے جہاد اور غزا کا مردِ میدان رہا ہے۔

یہ کیا چاہتا ہے؟

کیا یہ کہ اسے سلطان اور بادشاہ بنا لیا جائے؟

حکومت کا خزانہ اس کے ذاتی تصرف میں دے دیا جائے۔ کہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرے۔ سلطنت و حکومت اس کی اولاد کے لئے مخصوص کر دی جائے؟

نہیں ہرگز نہیں!

یہ اپنے گوشۂ عافیت سے اس لئے باہر نکلا ہے کہ

محمدؐ کا لایا ہوا اسلام جو حجاز میں پھلا پھولا اور پروان چڑھا تھا ــــــ جو عراق اور شام میں آ کر کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ اب نہ قرآن کی حکومت تھی نہ اسوۂ نبی کی، نہ کسی متقی اور پرہیزگار انسان کی، اب حکومت تھی اس شخص کی جو قرآن کے احکام کو پامال کر رہا ہے جو اسوۂ نبی کو فراموش کر چکا تھا جس نے وراثت کے طور پر یہ حکومت حاصل کی تھی۔ اور موروثی طور پر اپنی اولاد کے لئے چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

حسینؑ ــــــ! دینِ اسلام کی بے حرمتی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا مطالبہ ایک اور صرف ایک ہے:۔

"قرآن کی حکومت قائم کرو!"

یہ مسلمان جو صف باندھے تیر و تبر سے مسلح اُسے ہلاک کرنے اور قتل کرنے کے لئے کھڑے ہیں، مسلمان ہیں اور اسے گوارا نہیں کر سکتے۔ کہ قرآن ان پر حکومت کرے۔

اے گوارا کر رہے ہیں کہ یزیدان کا حاکم ہو۔ انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور یزید کو قبول کر لیا ہے۔ یہ خدا سے نہیں ڈرتے۔ یزید سے خائف ہیں۔ یزید کے سر پر انہوں نے تاج خسروی رکھ دیا ہے۔ اور حسینؑ کی گردن کاٹنے پر مچلے ہوئے ہیں۔

لیکن حسینؑ، حسینؑ ہے ——— !

وہ ظاہری ساز و سامان سے محروم ہے۔ اس کے پاس نہ فوج ہے نہ لشکر، نہ دولت ہے نہ سرمایہ، لیکن وہ مرد مسلمان ہے، بندہ مومن ہے۔ اس کا عزم پہاڑ سے ٹکرا سکتا ہے، اس کا حوصلہ سمندر سے لڑ سکتا ہے۔ اس کی استقامت چٹانوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے۔ اس کے پاس کوئی قوت نہیں، لیکن وہ قوت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیتا ہے۔ ابن زیاد، یزید کی شہ پر خدائی اور خداوندی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن حسینؑ نے اس کے چیلنج کو قبول کر لیا ہے۔ وہ اپنی جان قربان کر دینے پر تل گیا ہے۔ لیکن جب تک زندہ ہے۔ اسلام کی بے حرمتی نہیں برداشت کر سکتا۔ شعائر اسلام کی توہین نہیں گوارا کر سکتا۔ وہ خدا کے سامنے اسی کٹی ہوئی گردن کو لے کر پہنچے گا، اور کہہ دے گا:۔

"میں یہی کر سکتا تھا کہ تیرے دین کی سربلندی کے لئے اپنی زندگی قربان کر دوں سو میں نے کر دی۔ اب میں ہر ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ اب تو جان اور تیرے یہ بندے!"

دیکھنا ——— دیکھنا!

لشکر اعداء، مور و ملخ کی طرح حسینؑ کی طرف بڑھ رہا ہے اور اب کوئی نہیں جو اس کا ساتھ دے، جو اس کے لئے اپنی گردن کٹائے، جو اسے بچانے کے لئے خود قربان ہو جائے۔ جو ایسا کر سکتے تھے وہ اپنا فرض ادا کر گئے۔

لیکن نہیں ——— ابھی کچھ لوگ ہیں۔ دیکھنا یہ ایک نوجوان کس جاہ و جلال اور وقار و تمکین کے ساتھ میدان جنگ کی طرف بڑھ رہا ہے ——— ۱۸، ۱۹ سال کی عمر، چہرہ جیسے چودھویں رات کا چاند، خوب رو، خوش شکل، ایک تر و تازہ پھول جو ابھی شاخ گل سے

الگ نہیں ہوا ہے۔ وہ رجز پڑھتا صفِ اعداء میں گھس گیا۔ اس نے صفیں کی صفیں الٹ دیں۔ ہجوم اعداء سے نہ سراسیمہ ہے۔ نہ پریشان، وہ بجلی کی طرح اس صف سے اس صف میں جا رہا ہے۔ اور جدھر نکل جاتا ہے صفیں کی صفیں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ اسکی تلوار اس طرح چمکتی ہے جیسے بجلی کا کوندا چمکی اور غائب، وہ جس طرف بڑھتا ہے دشمن کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ اور اسے راستہ دے دیتے ہیں۔ اس کا ہاتھ تلوار چلاتے چلاتے شل ہو گیا تھا۔ اس کا بدن زخموں سے چور اور لہو لہان ہو رہا تھا۔ آخر ایک بدبخت نے نیزے کا وار کیا۔ وہ لڑکھڑایا اور زمین پر گر پڑا۔ دشمن اسی وقت کے منتظر تھے بھیڑوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اور تلواروں سے نعش کے ٹکڑے کر دیئے!

یہ شہید ہونے والا کون تھا؟

یہ علی اکبر تھا —— حسینؑ کا بیٹا، علیؑ کا پوتا!

حسینؑ نے یہ حادثہ دیکھا اور اپنے لختِ جگر کی نعش خیمے کے سامنے اٹھوا کر رکھ دی۔ جواب ہمیشگی کی نیند سو رہا تھا۔

یہ کتنا بڑا حادثہ تھا —— لیکن حسینؑ پر اور اس کے اہلِ بیت پر اس سے ذرا بھی وحشت کی کیفیت نہیں پیدا ہوئی۔ دیکھنا حسینؑ کے ویران خیموں سے یہ پانچ سوار نکلے۔ ان میں سے ایک مسلم بن عقیل کا لختِ جگر ہے۔ عبداللہ، دوسرے دو نوجوان عون و محمد ہیں۔ عبداللہ بن یقطر کے نورِ دیدہ اور آخری، عبدالرحمان اور جعفر ہیں۔ عقیل بن ابی طالب کے بیٹے۔ ان کی تلواریں بھی بجلی کی طرح چمک رہی ہیں۔ یہ بھی زخم پر زخم کھا رہے ہیں۔ گھائل ہو رہے ہیں۔ لیکن نہ ان کے ماتھے پر شکن ہے۔ نہ ان کے حوصلوں میں فرق، ان میں سے ایک ایک شہید ہو گیا۔ لیکن کسی نے بھی پیٹھ پر زخم نہیں کھایا۔ ہاں سینہ زخموں سے لالہ زار ہو رہا تھا!

ان پانچوں کی شہادت کے بعد ایک نوعمر سوار، شمر و ابن سعد کے لشکر کی طرف بہ ارادہ جنگ بڑھا۔ یہ بالکل نوعمر ہے۔ اس نے زندگی کی کوئی لذت نہیں حاصل کی ہے۔ اس نے اب تک کسی جنگ میں شرکت نہیں کی ہے۔ یہ اتنا خوش شکل ہے

کہ نور کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ یا اس طرح دشمن کے لشکر کی طرف بڑھ رہا ہے جیسے وہ اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا ——— دشمن اس کا استقبال تیر و پیکاں، تیغ و شمشیر اور خنجر و سناں سے کرتے ہیں۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دلیری اور شجاعت کے ساتھ لڑ رہا ہے۔ اتنے میں دشمن کے ایک ازدی سپاہی نے جھپٹ کر اس کے گلوئے نازک پر تلوار کا بھرپور ہاتھ مارا وہ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے اس کی زبان سے صرف ایک جملہ نکلا:۔

"عم محترم! الوداع!"

یہ جانباز قاسم تھا۔ حسینؑ کا بھتیجا اور حسنؑ کا فرزند دلبند!

حسینؑ باز کی طرح جھپٹے اور شیر کی طرح حملہ آور ہوئے۔ قاسم کا قاتل بھی خاک و خون میں لت پت تڑپ رہا تھا، اور حسینؑ، قاسم کے جسد بے روح سے کہہ رہے تھے:۔

قیامت کے دن یہ لوگ تیرے نانا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا جواب دیں گے ——— ! ہیہات، آج تیرے چچا کے دشمن بہت ہیں اور دوست کوئی نہیں۔!

قاسم کی نعش بھی علی اکبر کے پہلو میں رکھ دی گئی۔

حسینؑ، علی اکبر اور قاسم کی نعش کے پاس اپنے خیمہ کے سامنے کھڑے تھے کہ عین اسی وقت خیمہ سے ایک نوزائیدہ بچہ لایا گیا۔ شاید قدرت علی اکبر کا نعم البدل پیش کر رہی تھی۔ لیکن نہیں، حسینؑ نے اسے دیکھا۔ آنکھوں میں اس معصوم اور نووارد وجود کو دیکھ کر مہر و محبت کا دریا لہریں لینے لگا۔ ذرا کے ذرا ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ وہ اپنا منہ بچہ کے کان کے پاس لے گئے۔ اور اذان دے ہی رہے تھے کہ ایک سفاک شخص کا تیر (جو بنو اسد سے تعلق رکھتا تھا) اس نومولود کے حلق میں آکر پیوست ہوگیا۔ اور وہ جس نے ابھی زندگی کی ایک بہار بھی نہ دیکھی تھی۔ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ حسینؑ نے اپنے چلو میں اس کے حلق سے بہتا ہوا تازہ خون لیا اور اسے زمین پر گرا دیا۔ اور قاسم و علی اکبر کے پہلو میں یہ ننھا منا بچہ بھی سو گیا۔

حسینؑ کو بچانے کے لئے خاندان کے تمام لوگ ایک ایک کر کے شہید ہو رہے تھے۔ لیکن نہ ان پر ہراس طاری تھا نہ خوف و دہشت!

اب حسینؑ کے سوتیلے بھائی عبداللہ بن علیؑ، جعفر بن علیؑ، عثمان بن علیؑ اور محمد بن علیؑ، نیزے تانے اور تلواریں سونتے دشمن کے لشکر میں گھس کر شجاعت کے جوہر دکھانے لگے، خوب لڑے، جی کھول کر لڑے۔ کئی دشمنوں کو گھائل کیا، کئی کو موت کے گھاٹ اتارا اور آخر کار ایک ایک کر کے یہ بھی شہید ہوتے گئے۔ اور عین اسی وقت خیام اہل بیت میں سے ایک چھوٹا سا بچہ نکلا۔ اور خیمہ کے پاس کھڑا ہو کر ادھر ادھر خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ کیا ہو رہا ہے یہ تیر کیوں برس رہے ہیں؟ تلواریں کیوں چمک رہی ہیں؟ یہ اچھے بھلے لوگ کٹ کٹ کر کیوں گر رہے ہیں؟ سر کیوں لڑھک رہے ہیں؟ گردنیں کیوں قطع ہو رہی ہیں؟ ———— یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ یہی سب سوچ رہا تھا۔ لیکن یہ باتیں اس کی عقل و فہم سے بالاتر تھیں۔ حیران و پریشان، سراسیمہ اور مضطرب کھڑا یہ دلدوز منظر دیکھ رہا تھا کہ یکایک ایک خضری تیر انداز کا تیر اس کے سینہ میں پیوست ہوا۔ اور وہ جو جہاد و قتال کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ مرتبہ شہادت پر فائز ہو گیا۔

اس ساری مدت میں حسینؑ بھی برابر جنگ میں مصروف رہے۔ اب وہ زخموں سے چور چور ہو کر نڈھال ہو چکے تھے۔ پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ عباسؑ بن علیؑ کی معیت میں دریائے فرات کی طرف بڑھے۔ ابن زیاد کے حسب حکم شمر اور ابن سعد نے اس دریا کی بڑی سختی کے ساتھ ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ کہ ایک قطرۂ آب بھی آلِ رسولؐ کو نہ مل سکے۔ دشمن کے سواروں نے جو آپ کو آتے دیکھا تو روکنے کے لیے بڑھے۔ لیکن حسینؑ تلوار کا جواب تلوار سے دیتے ہوئے لبِ دریا تک پہنچ گئے۔ مشکیزہ میں پانی لے کر پینا ہی چاہتے تھے کہ ابن زیاد کے معتمد خاص حصین بن نمیر نے تاک کر ایک تیر مارا جو گلے

میں پیوست ہوگیا۔ آپ نے تیر کھینچا۔ تو خون کا فوارہ بہنے لگا ــــــ اور دونوں چلو خون سے بھر گئے۔ آپ نے یہ مقدس خون آسمان کی طرف پھینکا اور فرمایا:۔

"اے اللہ!
میں تجھی سے شکوہ کرتا ہوں۔ دیکھ تیرے رسولؐ کے نواسے کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے!"

دشمنوں کا نرغہ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عباس بن علیؑ آپ سے جدا ہو گئے۔ وہ جہاں تھے وہاں برسرِ پیکار تھے۔ آخر عباس زخموں کی تاب نہ لاکر گرے اور مرتبہ شہادت پر فائز ہو گئے۔

ادھر حسینؓ پر شمر نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ یورش کی وہ اگرچہ زخمی تھے، پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے گلے سے خون جاری تھا، لیکن استقامت اور حوصلہ کا یہ عالم تھا کہ تازہ دم نوجوانوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ جو بد قسمت سامنے آجاتا دو نیم ہو جاتا تھا۔ لیکن ایک زخمی آدمی بہت سے دشمنوں سے کب تک لڑ سکتا ہے۔ آخر ایک کندی شخص مالک کی تلوار آپ کے سر مبارک پر پڑی۔ اور ٹوپی کو چیرتی ہوئی سر میں گھس گئی۔ ساری ٹوپی خون سے بھر گئی۔ آپ نے ٹوپی اتاری، سر پر پٹی باندھی اور اس پر عمامہ باندھ لیا۔ اور پھر مصروف جنگ ہو گئے۔

اتنے میں خیمہ کے اندر سے ایک نوعمر لڑکا برآمد ہوا۔ یہ حسینؓ کا بھتیجا اور حسنؓ کا لڑکا عبداللہ تھا۔ چچا کا یہ حالِ زار دیکھ کر ضبط نہ کر سکا۔ اور خیمہ کی لکڑی اکھاڑ کر حملہ آور کی طرف بڑھا۔ اور معصومانہ جوش و جذبہ کے عالم میں چلایا:۔

"کمبخت تو میرے چچا کو قتل کرے گا!"

یہ سن کر حملہ آور کعب نے اس لڑکے پر تلوار چلائی۔ اس نے ہاتھ پر اس کا وار روکا۔ ہاتھ کٹ گیا۔ حسینؓ نے اسے گود میں اٹھا لیا اور کہا:۔

"جانِ عم!
اس مصیبت پر صبر کر۔ خدائے بزرگ و برتر تجھے بھی تیرے پاک اور مطہر بزرگوں

تک پہنچا دے گا!"

پھر آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا:۔

"اے اللہ!

ان لوگوں نے ہمیں بلایا۔ اور ہماری مدد کا وعدہ کیا، لیکن جب ہم آگئے، تو ہمارے خلاف میدان جنگ میں کود پڑے اور ہمیں قتل کر دیا۔!"

آپ شجاعت اور دلیری کے ساتھ پھر جنگ میں مصروف ہو گئے۔ آپ کی تلوار جس پر پڑتی تھی اسے دو نیم کر دیتی تھی۔ دشمن آپ کو دیکھ کر اس طرح پھٹ جاتے تھے جیسے کائی، بہت زیادہ زخمی ہو چکے تھے لیکن حوصلہ میں فرق نہیں آیا تھا۔ لڑ رہے تھے اور فرما رہے تھے:۔

"مجھے خدائے بزرگ و برتر عزت بخشے گا۔ اور تم سے اس طرح انتقام لے گا۔ جس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے!"

لیکن دشمن کے سوار اور پیادہ رہ رہ کر تنہا ذات پر ہجوم اور یورش کر رہے تھے۔ شمر انعام کا لالچ دے رہا تھا۔ طرح طرح کی امیدیں دلاتا اور سبز باغ دکھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک شخص کی تلوار آپ کے بائیں بازو پر لگی۔ اور وہ قطع ہو گیا۔ پھر آپ کے شانے پر تلوار پڑی۔ آپ لڑکھڑائے۔ شمر نے بڑھ کر مبارک ہاتھ کاٹ لیا اور خولی کے حوالہ کر دیا۔

شہادت کے بعد دیکھا گیا تو اندازہ ہوا۔ جسم اطہر پر تیر کے بے شمار زخموں کے علاوہ نیزوں کے ۳۳ اور تلوار کے ۳۴ زخم تھے۔

اس حادثہ کے بعد اہلِ بیت کے خیمے لوٹ لئے گئے ——— اور اہلِ بیت کا جتنا کچھ بھی سامان تھا وہ مالِ غنیمت بن گیا۔ ابن سعد نے خیموں پر چوکی پہرہ قائم کرایا اور اس کے بعد اعلان کیا۔

"حسینؓ کا جسم روندنے کے لئے کون کون لوگ تیار ہیں؟" لشکر میں دس آدمی آگے بڑھے۔ اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے وہ پاک اور مقدس جسم روند

ڈالا جس میں جوانانِ جنت کے سردار کی روح نے اپنا نشیمن بنایا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس روندے ہوئے جسم کے ہونٹوں کو رسول اکرمؐ نے چوما اور پیار کیا تھا ـــ آہ یہ کتنا بڑا حادثہ تھا ــــــ لیکن کس آسانی سے ان لوگوں کے ہاتھوں واقع ہوگیا جو اپنے تئیں مسلمان کہتے تھے۔ دنیا نے ٹریجڈی کے بڑے بڑے زہرہ گداز اور ہولناک واقعات دیکھے ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر بھی کوئی واقعہ اب تک گزرا ہے؟

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمین

امام حسینؓ کے ساتھ ۷۲ آدمی تھے۔ اور یہ سب کے سب اپنے سردار اور امام پر قربان ہو چکے تھے۔ ان کے بے روح اور بے کفن اجسام خاک وخون میں لتھڑے پڑے تھے۔ شمر نے حکم دیا ان ساری نعشوں کے سر کاٹ لئے جائیں۔ ان سروں کو نیزوں پر لٹکایا جائے اور ابن زیاد کی خدمت میں کوفہ روانہ کر دیا جائے ــــــ شہادت کے بعد ابن سعد، امام حسینؓ کی صاحبزادیوں، بہنوں، ننھے اور شیر خوار بچوں اور عابد بیمار یعنی زین العابدین کو اپنے ساتھ لے کر کوفہ روانہ ہوا۔ جب یہ قافلہ اس مقام سے گزرا۔ جہاں امام حسینؓ اور دوسرے شہداء کی بے گور و کفن اور سر بریدہ نعشیں پڑی تھیں۔ تو دیکھنے والوں کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ اور جن لوگوں نے ان جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ خود ان کے دل بھی دہل گئے۔ فاطمہؓ اور علیؓ کی دختر اور حسینؓ کی بہن زینب نے یہ روح فرسا اور دلگداز منظر دیکھا۔ تو ضبط نہ کر سکیں بے ساختہ ان کے منہ سے یہ الفاظ جاری ہوگئے۔

"اے محمدؐ! ـــــ جس کی ذاتِ مقدس پر آسمان کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔ دیکھئے یہ خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاش کس کی ہے؟۔ اس چٹیل میدان میں جس لاش کے بکھرے ہوئے ٹکڑے پڑے ہیں یہ حسینؓ کا جسم ہے، وہ حسینؓ جسے آپ چاہتے تھے؛ جو بچپن میں آپ کے کندھوں پر سواری کرتا تھا۔ آپؐ خطبہ دیتے ہوتے اور یہ آجاتا تو آپؐ بیتاب ہو کر اسے گود میں لے لیتے تھے جسے آپؐ نے جوانانِ جنت کا سردار فرمایا تھا اور یہ آپؐ کی بیٹی کی بیٹیاں ہیں جو قیدی بنالی گئی ہیں۔ آپؐ کی اولاد قتل کر

دی گئی ہے۔ اور تیز و تند ہوا۔ ان کے مقتول و مجروح جسموں پر خاک اڑا رہی ہے!

یہ الفاظ نہ تھے، خنجر کی نوک تھی جو سننے والوں کے دلوں میں پیوست ہو گئی۔ دوست، دشمن سب ہی متاثر تھے۔ سب کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ جو دشمن تھے وہ سوچ رہے تھے۔ کتنا بڑا جرم سرزد ہوا ہے ان سے! جو دوست تھے۔ وہ ضبطِ گریہ کی ناکام کوشش کر رہے تھے! ——— لیکن نہ اب دوست کچھ کر سکتے تھے نہ دشمن۔ معاملہ خدا کو سونپا جا چکا تھا۔ اور وہ اپنا آخری فیصلہ صادر کرنے والا تھا۔!

باب ۸

قتل، قتل، قتل!

ابن زیاد اپنے دارالامارۃ میں کبر و نخوت، غرور و پندار اور قہر و جلال کا پیکر بنا بیٹھا ہے۔ سامنے ایک طشت میں حسینؓ ابن علیؓ کا کٹا ہوا سر رکھا ہے۔ ایک چھڑی اس کے ہاتھ میں ہے۔ اور بار بار اپنے دستِ نجس سے وہ چھڑی آپ کے ہونٹوں پر مارتا ہے ـــــ اور مسکراتا جاتا ہے۔ گویا اس کٹی ہوئی گردن کی تذلیل و توہین میں بھی ایک لذت اور نشۂ فتح محسوس کر رہا ہے۔ حاضرین میں مشہور اور کہن سال صحابی رسولؐ زید بن ارقم بھی تھے جو ابن زیاد کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو وہ ابن زیاد کی یہ حرکت دیکھتے رہے آخر ضبط نہ ہو سکا۔ انہوں نے غم و غصہ کے ملے جلے جذبات میں فرمایا :-

"کمبخت! یہ کیا کرتا ہے؟ ان پاک اور مقدس لبوں سے اپنی چھڑی ہٹا لے اس خدا کی قسم، جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ان ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھتے اور انہیں چومتے تھے"

بے بسی کا غصہ آدمی کو رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ زید بن ارقم کی بھی یہی کیفیت ہوئی یہ بات کہی اور رونے لگے۔

ابن زیاد نے حقارت کی نظر سے زید بن ارقم کو دیکھا اور حاکمانہ پندار کے ساتھ جواب دیا :-

"خدا کی قسم، اگر تو بوڑھا نہ ہوتا۔ اور سٹھیا نہ گیا ہوتا تو ابھی گردن تلوار سے قلم

کر دیتا ہے ؎

حضرت زید بن ارقم نے ابن زیاد کو کچھ جواب نہیں دیا۔ حاضرین کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

"اے اہل عرب!

آج سے تم غلام بن گئے۔ کیونکہ تم نے فاطمہ کے لختِ جگر کو قتل کر دیا۔ اور ابن زیاد کو اپنا حاکم بنا لیا جو تمہارے نیک لوگوں کو قتل کرتا اور بدکرداروں کو نوازتا ہے۔"

یہ کہہ کر غصہ اور برہمی کے عالم میں اٹھ کر چلے گئے۔

اس کے بعد ابن زیاد کے دربار میں حضرت زینب، زین العابدین اور خاندانِ اہل بیت کے دوسرے افراد پیش کئے گئے۔ ان لوگوں کی حالت اس وقت عجیب ہو رہی تھی۔ غم و اندوہ نے ان کے تر و تازہ چہروں کو افسردہ اور مضمحل کر دیا۔ ان کے کپڑے میلے تھے ——— اور جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے بھی۔ زینب آکر محل کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئیں۔ کچھ خادمائیں تھیں۔ وہ ان کے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ ابن زیاد نے دریافت کیا:-

"یہ کون خاتون ہے؟ جو محل کے اس گوشہ میں آکر بیٹھی ہے۔ اور ہر چہار طرف سے عورتیں اسے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں؟"

اس سوال کا جواب کسی نے نہ دیا۔ جب دوبارہ اس نے اپنا یہ سوال دہرایا۔ تو زینب کی ایک خادمہ نے کہا:-

"یہ رسول اللہ کی نواسی اور فاطمہ کی بیٹی زینب ہیں۔"

یہ سن کر ابن زیاد جھلا گیا۔ اور اس نے بڑے فخر و غرور کے عالم میں زینب کو مخاطب کر کے کہا:-

---

؎ تاریخ کی تمام متداول اور مستند کتابوں میں یہ واقعہ موجود ہے۔

"خدا کا شکر ہے۔ جس نے تمہیں ذلیل کیا اور تمہاری تکذیب کی!"

زینب نے فرمایا :-

"خدا کا شکر ہے۔ جس نے ہمیں اپنے نبی آخرالزمان کے ذریعہ عزت بخشی ہمیں گندگی اور ناپاکی سے پاک کیا ذلیل ہم نہیں، فاسق ذلیل ہوتے ہیں اور فاجر جھٹلائے جاتے ہیں!"

ابن زیاد :- "تو نے دیکھا، خدا نے تیرے اہل بیت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

زینب :- "ہاں میں جانتی ہوں۔ ان کی قسمت میں مرتبہ شہادت لکھا جا چکا تھا۔ وہ مقتل پہنچے اور شہید کر دیئے گئے۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے۔ جب تو اور وہ ایک جگہ (محشر میں) جمع ہوں گے۔ اس وقت تم ایک دوسرے سے سوال و جواب کر لینا۔"

ابن زیاد :- (تلملا کر) "خدا نے تیرے خاندان کے باغی اور سرکش لوگوں کے قتل سے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔ میں بہت خوش ہوں۔"

زینب :- "تو نے ہمارے نیک اور پاک لوگوں کو شہید کیا۔ ہماری شاخوں کو کاٹا اور ہمارے خاندان کو برباد کر دیا۔ اس کارنامہ سے اگر تیرا دل ٹھنڈا ہوتا ہے تو اسے خوب ٹھنڈک پہنچا لے۔ اور خوش ہو سکتا ہے تو جی بھر کے خوش ہو لے!"

ابن زیاد :- "یہ شاعری ہے۔ تیرا باپ (علیؑ) بھی شاعر ہی تھا۔"

پھر ابن زیاد کی خونخوار نظریں زین العابدین پر پڑیں۔ نخوت اور تکبر کے ساتھ پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

زین العابدین :- "میرا نام علیؑ بن حسینؑ ہے۔"

ابن زیاد :- "کیا خدا نے حسینؑ ابن علیؑ کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیا؟"

زین العابدین :- "مارنا اور جلانا خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ کسی نفس کی یہ مجال نہیں کہ خدا کی مرضی اور اجازت کے بغیر مر جائے یا زندہ رہے۔"

ابن زیاد :- (برہم ہو کر) "اوہ، تیری یہ جرأت کہ میرے سامنے زبان چلاتا ہے اور مجھ سے دوبدو گفتگو کرتا اور میری باتوں کا جواب دیتا ہے؟"

زین العابدین :۔ "میں نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی۔ جو تو نے پوچھا اس کا جواب دیا۔ جو تو نے کہا۔ اُس کا جواب سنا!"

ابن زیاد :۔ "کیا تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟"

زین العابدین :۔ "جانتا ہوں۔ تو ابن زیاد ہے۔ اور تختِ حکومت پر بیٹھ کر خدائی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن تیری ان حرکتوں میں نہ کوئی ندرت ہے نہ جدت۔ تجھ سے پہلے فرعون، شداد، ہامان اور دوسرے بہت سے بدخو غلط لوگ تختِ حکومت کو۔ تختِ کبریائی بنانے کی کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن خدا کی حکومت آج بھی قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔ اور خدائی کے وہ مدعی کب کے گل سڑ کر زمین کی خوراک بن چکے ہیں۔"

ابن زیاد :۔ "ان الفاظ کی تجھے جواب دہی کرنی پڑے گی۔ تو گستاخی سے کام لے رہا ہے اس کی تجھے سزا ملے گی۔ تیرے الفاظ میں طنز ہے اور یہ طنز تجھے مہنگا پڑے گا۔"

زین العابدین :۔ "کیا تو نے نہیں دیکھا۔ ہم موت سے نہیں ڈرتے؟ ہمارے خاندان کے سب آدمی کربلا کے میدان میں ہنستے کھیلتے شہید ہو گئے۔ ان میں سے ایک آدمی بھی موت سے نہیں ڈرا۔ کوئی بھی جنگ کے میدان میں کودنے سے نہیں ہچکچایا کسی نے بھی موت کی پرواہ نہیں کی۔ کسی نے بھی پیٹھ پر زخم نہیں کھائے۔"

ابن زیاد :۔ "معلوم ہوتا ہے تو بھی عروسِ مرگ سے ہمکنار ہونے کے لئے بیقرار ہو رہا ہے۔"

پھر اپنے آدمیوں کو حکم دیا :۔

"جاؤ اس کی بھی گردن اڑا دو۔ اسے بھی وہاں پہنچا دو۔ جہاں اس سے پہلے اس کے بزرگ پہنچ چکے ہیں۔"

یہ سن کر زینب سامنے آگئیں۔ وہ ابن زیاد اور زین العابدین کے مابین حائل ہو گئیں۔ انہوں نے فرمایا :۔

"اگر تو اس بیمار اور کمزور لڑکے کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ تو پہلے مجھے قتل کر۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اسے قتل ہوتا نہیں دیکھ سکتی"

ابن زیاد شرما گیا۔ زین العابدین کے ارادہ قتل سے باز آیا۔ مسجد میں پہنچا اور منبر پر کھڑا ہو کر تقریر کرنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے حق کو ظاہر کیا ــــ امیرالمؤمنین یزید اور اس کے لشکر کو فتح مبین عطا فرمائی اور جھوٹوں کے جھوٹے (نعوذ باللہ) حسینؓ ابن علیؓ اور اس کے ساتھیوں کو موت سے ہمکنار کر دیا" [1]

یہ سن کر عبداللہ بن حنیف اردی کھڑے ہو گئے، یہ نابینا تھے۔ ان کی ایک آنکھ جنگ جمل میں اور دوسری جنگ صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئی تھی۔ اور اب ان کا کام صرف عبادت تھا۔ دن رات مسجد میں پڑے رہتے اور عبادت و ریاضت میں وقت گزارتے۔ انہوں نے کہا:۔

"اے ابن زیاد! عقل کے ناخن لے، ہوش کی آنکھیں کھول تو نبیوں کے بیٹوں کو قتل کرتا، اور سچوں اور صدیقوں کی جگہ ممبر پر کھڑا ہوتا ہے۔ جھوٹا تو ہے اور تیرا باپ، جھوٹا وہ ہے جس نے تجھے یہاں کا حاکم بنایا اور اس کا باپ بھی!" [2]

یہ سنتے ہی ابن زیاد کے آدمیوں نے بلہ کر کے عبداللہ کو پکڑ لیا۔ ابن زیاد نے حکم دیا:۔

"قتل کر دو اس بدزبان کو"

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور عبداللہ کی گردن قلم کر دی گئی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ابن زیاد نے حکم دیا کہ قافلہ اہل بیت، اس حالت میں کہ مقتولوں کے سر نیزوں پر چڑھے ہوں یزید کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے؟

---

[1] تاریخ اسلام
[2] تاریخ اسلام

باب ۸۵

مردِ مجاہد

ریحان اور عامر (دیلمی) بدستور اپنے خیمہ میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ نعیم اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مرتبہ کچھ ایسا گیا۔ کہ کئی دن ہو گئے مگر اب تک نہیں آیا۔ ورنہ عام طور پر رات بھر سے زیادہ غیر حاضر نہیں رہتا تھا۔ سارے قبیلے میں کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ کیا ہو گیا؟ عورتیں رو رہی تھیں، بچے بلک رہے تھے۔ بوڑھے اور بیمار پریشان تھے۔ لڑکیاں ایک ایک میل دور نکل جاتیں کہ اگر آتے دیکھیں تو جلدی سے آکر یہ خوش خبری سنائیں۔ لیکن ہر روز جاتیں اور مایوس و نامراد واپس آجاتیں ایک روز ریحان نے عامر سے کہا:۔

"آخر ہم کب تک یونہی قید و بند کی بے کیف اور بے مزہ زندگی بسر کرتے رہیں گے؟"

عامر نے جواب دیا:۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں! میری خود طبیعت اُکتا گئی ہے ____ کوئی تدبیر کرو اور بھاگ چلو!"

ریحان: "لیکن بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ خیمہ کے چاروں طرف پہرہ ہے۔"

عامر: "اب نہیں رات کو، کسی طرح دم دے کر نکل چلو یہاں سے۔"

ریحان: "تم نے سلمیٰ کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا۔ اس کی زیارت کبھی نہیں ہوئی کہ ذرا جی بہلتا۔ کم از کم اسے مزاج پرسی کے لئے تو آنا چاہیئے تھا۔"

عامر :- "کیا کرے گی اگر ؛ وہ یقین کر چکی، میں دغاباز ہوں۔ دغابازوں کی بھی کوئی مزاج پرسی کرتا ہے ؟"

ریحان :- "نہیں، یہ نہ کہو۔ محبت ہر رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ آگئے یہ آوازیں سن رہے ہو ؟"

عامر :- "خیمہ کی طرف جاتے ہوئے، ہاں آگئے۔ دیکھو وہ نعیم ہے۔ وہ اس کے ساتھی لیکن یہ ان کے ساتھ لاش کس کی ہے ؟"

ریحان :- "کسی ساتھی کی ہوگی ؟"

عامر :- "کوئی معمولی ساتھی نہیں معلوم ہوتا۔ سب ہی مغموم، مضمحل اور پریشان و افسردہ نظر آ رہے ہیں۔ یقیناً کوئی بڑا حادثہ ہوا ہے۔ خدا خیر کرے۔ نعیم اسی طرف آ رہا ہے۔ لیکن نہیں۔ وہ دوسرے خیمہ میں چلا گیا۔"

اسی طرح تین چار دن گزر گئے۔ نہ نعیم اس خیمہ میں آیا۔ نہ اس نے ان لوگوں کو اپنے ہاں طلب کیا۔ اب تو ریحان اور عامر کو فکر دامن گیر ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے ؛ اب تک تو یہ امید تھی کہ نعیم آجائے گا تو کوئی صورت نکلے گی۔ لیکن اسے آئے ہوئے چار روز ہو چکے ہیں۔ مگر ہماری کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے ؟ کیا ہم اسی طرح گھُل گھُل کر مریں گے۔"

عامر :- "عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ تم ٹھہرے ایک کاہل اور سست لس بستر سے لگے بیٹھے ہو۔"

ریحان :- "اور تم کونسی چہل قدمی کرتے رہتے ہو ؟"

عامر :- "میں دن بھر اس روزن سے جھانک جھانک کر حالات کا جائزہ لیتا رہتا ہوں اور اصل بات یہ ہے کہ اس مرتبہ کوئی خاص بات ضرور ہوئی ہے۔"

ریحان :- "لیکن وہ بات کیا ہے ؛ یہ بھی تو معلوم ہو ؟"

عامر :- "معلوم ہو تو بتاؤں۔ اتنا جانتا ہوں کہ اس مرتبہ حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں ایک بات تو یہ محسوس کر رہا ہوں۔ کہ اب پانچوں وقت اذان دی جاتی اور

نماز ہوتی ہے۔"

ریحان :۔" ہاں ۔ یہ تو میں بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محسوس کرتا رہتا ہوں اور ؟"

عامر :۔" دوسرے یہ کہ جب سے نعیم آیا ہے۔ ڈاکہ مارنے نہیں گیا۔"

ریحان :۔" وہ تو اپنے ساتھی کی وجہ سے نہیں گیا۔ جس کی لاش اپنے ساتھ لایا تھا۔"

عامر :۔" نہیں وہ لاش نہیں تھی۔ کوئی زخمی تھا۔ لاش ہوتی تو خیمہ میں اتنے دِن تک پڑی رہتی۔ نہ تدفین ہوئی۔ نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ؟"

ریحان :۔" ہاں، بات تو معقول ہے۔ لیکن یہ اسرار کیا ہے ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا !"

عامر :۔" خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میری عقل خود حیران ہے !"

اتنے میں ایک آدمی آیا۔ اس نے ان دونوں سے کہا :۔

"چلئے ، آپ کو سردار نے یاد کیا ہے ؟"

یہ دونوں نعیم کے خیمہ میں پہنچے۔ وہ مسند پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے اور تلوار سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ واقعی اس مرتبہ نعیم کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ نہ آنکھوں میں چمک تھی۔ نہ چہرے پر وہ وحشت اور خونخواری تھی۔ ڈاڑھی کے بال بے ترتیبی کے ساتھ بڑھ گئے تھے لباس میلا تھا۔ صورت پُرغم و اندوہ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نعیم نے ان دونوں سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا یہ بیٹھ گئے۔ پھر وہ گویا ہوا۔

"میں تم دونوں کو آزاد کرتا ہوں ۔ جہاں چاہو چلے جاؤ !"

ریحان کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ عامر کو بھی حیرت آمیز مسرت ہوئی۔ اسے یہ ہرگز امید نہ تھی کہ اس آسانی سے رہائی عمل میں آجائے گی۔ کم از کم اپنے بارے میں تو اسے یقین تھا۔ کہ اب یہاں سے زندہ واپس جانا ناممکن ہے۔

عامر نے شکریہ ادا کرنے کے لئے سردار کی طرف دیکھا۔ تو اسے نظر آیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔ اس نے کہا :۔

"ہم دونوں آپ کا یہ احسان تازندگی یاد رکھیں گے ———— خاص طور پر میں —— !"

نعیم :۔ خاص طور پر تم کیوں یاد رکھو گے؟"

عامر :۔ "اس لئے کہ میں نے آپ کے احسان کا بدلہ فرار کی صورت میں دیا تھا۔ اور میں آج تک اس پر شرمندہ ہوں۔"

نعیم :۔ "گئی گزری باتوں کا ذکر بیکار ہے۔ اگر تم نے کوئی خطا کی بھی تھی تو ہم نے صدقِ دل سے معاف کیا۔ اور تم سے بھی درخواست ہے کہ ہماری طرف سے جو زیادتی ہوئی ہو معاف کر دو۔"

عامر :۔ "یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟ —— اگر گستاخی نہ سمجھا جائے تو معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس مرتبہ جب سے آپ تشریف لائے ہیں۔ کچھ بدلے ہوئے سے نظر آتے ہیں؟"

نعیم :۔ "پیچ کہتے ہو تم۔ واقعی میں بدل گیا ہوں —— اب تک میں ایک ڈاکو تھا، لٹیرا تھا۔ ایک قزاق تھا۔ لوگوں کو قتل کر ڈالتا تھا۔ ان کا مال چھین لیتا تھا۔ نہ عورتوں کی عزت میری نظر میں کوئی چیز تھی۔ نہ مردوں کی زندگی میرے لئے کوئی اہمیت رکھتی تھی۔"

عامر :۔ "لیکن اب —— ؟"

نعیم :۔ "لیکن اب میں نے محسوس کر لیا ہے کہ زندگی بے ثبات ہے۔ زندگی کے جاہ و جلال کو قیام نہیں۔ یہ زندگی عارضی ہے —— اور حیف ہے اس شخص پر جو عارضی زندگی کے لئے دوسرے جہاں کی زندگی کو غارت کر دے اب تک میں ڈاکو تھا۔ لیکن اب میں ایک مجاہد کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ دعا کرو خدا مجھے توفیق دے کہ اس ارادہ پر قائم رہ سکوں۔"

عامر :۔ "اصل چیز ارادہ اور نیت ہے۔ خدا ضرور آپ کو ثبات و استقلال مرحمت فرمائے گا۔"

نعیم :۔ "آمین —— میں نے ایک مجاہد کا دامن پکڑ لیا ہے۔ وہ حق کے لئے لڑتے لڑتے تقریباً اپنی جان قربان کر چکا تھا۔ اس کے بدن پر نیزوں، تیروں اور

تلواروں کے درجنوں زخم تھے۔ میں جب مالِ غنیمت سے لدا پھندا اس کی طرف سے گزرا تو اس کے ساتھی زندگی اور موت کی کش مکش سے آزاد ہو چکے تھے۔ ان کی گردنیں کاٹی جا چکی تھیں۔ صرف یہ ایک نوجوان ایسا تھا۔ جو اب تک موت سے کشتی لڑ رہا تھا۔ خون بے انتہا نکل چکا تھا۔ بیہوشی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اگر میں تھوڑی دیر کے بعد پہنچتا تو شاید یہ ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن میں پہنچ گیا۔ میں نے اس میں زندگی کی رمق دیکھی۔ میں نے وہیں پڑاؤ کیا۔ جہاں اس کے ساتھی قتل ہوئے تھے اور کئی دن تک اس کی مرہم پٹی کرتا رہا۔ پھر جب اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو یہاں لے آیا۔ یہاں آکر اور زیادہ توجہ سے علاج کیا۔ اب خدا کے فضل سے وہ اچھا ہے۔ جانے کے لئے مچل رہا تھا۔ اسے اصرار تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہے گا۔ شہادت کا جذبہ اسے بیقرار اور مضطرب کئے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے قدم پکڑ لئے۔ میں نے اس کا دامن تھام لیا۔ میں نے کہا اے مردِ مجاہد! تو نے اپنا جذبہ میرے سینہ میں بھی منتقل کر دیا ہے۔ تو اکیلا کیوں جاتا ہے؟ ہم سب تیرے ساتھ ہیں۔ تیرے مقصد بلند کی خاطر ہم اپنی زندگی قربان کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اس ظالم اور جابر حکومت کا وجود ہمارے لئے ناقابلِ برداشت بن چکا ہے۔ یہ خلیفہ، یہ اس کے امراء یہ ان کے طور طریق، یہ ان کی اسلام سے دوری، یہ ان کا کفر سے تقرّب یہ ان کی حق کشی، یہ ان کی باطل پرستی۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ہمارے درد کا درمان بن سکے۔ ہم مسلمان بن کر اگر زندہ نہیں رہ سکتے تو ایک مسلمان کی موت تو مر سکتے ہیں۔ ہم چند آدمی ہیں۔ لیکن اگر ہماری نیت نیک ہے ہمارا ارادہ خالص ہے۔ ہمارا جذبہ درست ہے ——— ہمارا فیصلہ صحیح ہے۔ تو ضرور ہم کامیاب ہوں گے۔ ہماری تلواریں کاٹ میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اب یہ اسلام کے دشمنوں کا سر کاٹیں گی ———

عامر! اس مردِ مجاہد نے میری درخواست منظور کر لی یہ میری بات مان لی۔ میری تمنا پوری کر دی۔ تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ۔ میں کوفہ جاتا ہوں، کوفہ دغاباز ہے، بزدل ہے، فرض

ناشناس ہے۔ لیکن ہم وہیں جائیں گے۔ وہیں سے اپنا کام شروع کردیں گے۔ اور اسلام کے دشمنوں کو ایسا سبق دیں گے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ اب ہماری منزل دوسری ہے ہمارا مقصد کچھ اور ہے۔ ہماری راہِ عمل کچھ اور ہوچکی ہے۔ آج ہی ہمارا کارواں روانہ ہوجائے گا؟

عامر (لیلی) کو، کوفہ ہی کی طرف جانا تھا۔ اس کے اور نعیم کے مقاصد میں۔ اب اختلاف نہیں تھا۔ کامل آہنگی پیدا ہوگئی تھی۔ مقصد ایک تھا، منزل ایک تھی، راستہ ایک تھا۔ اس نے کہا:۔

"اگر اجازت ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟ مجھے بھی وہیں جانا ہے، اور میرے سینہ میں بھی وہی آگ بھڑک رہی ہے۔ جو آپ کے سینہ میں روشن ہے"

نعیم نے جواب دیا:۔

"میرے عزیز! اب میں کچھ نہیں ہوں۔ میری رائے کچھ نہیں ہے۔ میرا فیصلہ کوئی چیز نہیں۔ میں اب سردار بھی نہیں ہوں۔ صرف ایک سپاہی ہوں مجھ سے نہ پوچھو۔ اس خیمہ کی پشت پر جو دوسرا خیمہ ہے وہاں چلے چلو۔ اور جو وہ کہے، کرو۔

عامر نے اشتیاق و انتظار کے عالم میں دوسرے خیمہ کا رخ کیا۔ سامنے ایک شخص یاس و حرماں لیکن انتقام و جلال کا پیکر بنا ٹہل رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ عامر کے منہ سے بے ساختہ نکلا —— ربیع ——!"

اور وہ بیہوش ہوکر گر پڑا۔ اس کے ساتھ اس کا عمامہ بھی گرا۔ اور اس کی لمبی لمبی زلفیں نمایاں ہوگئیں۔ ربیع نے اسے پہچان لیا اور —— لیلے، میری لیلے —— کہہ کر اس کی طرف لپکا۔ لیکن دو قدم بھی نہ چل سکا۔ بیہوش ہوکر گر پڑا۔

باب ۸۶

حضرت زینبؓ اور یزید کا مکالمہ !

کاروانِ اہل بیت دمشق پہنچ چکا ہے۔ یزید مسندِ شہریاری پر الیسا کج کلاہ بنا بیٹھا تھا۔ جس کے اسلاف کی کبھی یہ مجال نہ تھی کہ ان قیدیوں کے اسلاف کے قدموں میں بیٹھ سکتے زین العابدینؑ جس کے رحمۃ اللعالمین نانا محمد رسول اللہ نے فتح مکہ کے وقت، اپنے اور اسلام کے بدترین دشمن ابوسفیان کو اور اس کی خطاؤں کو معاف کر کے اسے حیاتِ نو بخشی تھی۔ آج ابوسفیان کا پوتا یزید محمد کے نواسے حسینؑ کو شہید کرانے کے بعد اس کے مظلوم متعلقین کی توہین و تذلیل کر رہا تھا۔ زین العابدین اس کے سامنے تھے اور بیڑیوں اور زنجیروں میں لپٹے ہوئے یزید نے انہیں دیکھا۔ اور کبر و نخوت کے ساتھ گویا زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا:۔

"تمہارے باپ نے میرا حق فراموش کر دیا۔ حکومت میں مجھ سے جھگڑا کیا اور پھر خدا نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا۔ وہ تم نے دیکھ لیا"

زین العابدینؑ نے جواب دیا:۔

ولا تفرحوا بما اتاکم	"جو کچھ ہم (خدا) نے تمہیں دیا ہے اس
واللہ لا یحب کل	پر غرور نہ کرو۔ اللہ ہر غرور کرنے اور
مختال فخور (قرآن)	فخر کرنے والے کو ناپسند کرتا ہے"

زین العابدینؑ کے قریب ہی ان کی پھوپھی حضرت زینب خستہ اور دریدہ لباس میں ملبوس تشریف فرما تھیں۔ اور ان کے پاس فاطمہ بنت حسینؑ یہ باتیں ہو

رہی تھیں کہ اسی اثناء میں ایک شامی نوجوان نے فاطمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا،
"امیرالمومنین! یہ لڑکی مجھے مرحمت کر دی جائے۔"
یہ سن کر فاطمہ سہم گئیں۔ اور کانپتے ہوئے انہوں نے زینب کی چادر پکڑلی زینب کا چہرہ وفورِ غیرت سے سرخ ہوگیا۔ خونِ ہاشمی جوش میں آیا۔ اور انہوں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا:۔
"تو بدبخت ہے ــــــ تیری گستاخی اور بدنگاہی اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ اہل بیت نبی کی لڑکیوں پر نگاہ ڈالتا ہے۔ یاد رکھ۔ کہ نہ تجھے یہ اختیار حاصل ہے نہ یزید کو ــــــ!"
ان باتوں سے، بجائے اس کے کہ یزید شرماتا، الٹا برہم ہوگیا۔ اس نے بپھرے ہوئے لہجہ میں کہا:۔
"مجھے یہ حق حاصل ہے۔ اور اگر چاہوں تو ابھی ایسا کر سکتا ہوں۔"[1]
زینب نے اس سے زیادہ بپھرے ہوئے لہجہ میں وقار اور تمکنت کے ساتھ کہا،
"تو غلط کہتا ہے۔ خدا نے ہرگز تجھے یہ حق نہیں دیا ہے کہ تو دوسروں کی اور خاص طور پر، اہل بیت نبی کی لڑکیوں کو بانٹتا پھرے۔ ہاں اگر تو اسلام کو ترک کر دینے کا اعلان کر دے۔ ہماری ملت سے خارج ہو جائے۔ اور کوئی دوسرا دین اختیار کر لے تو دوسری بات ہے!"
یزید نے بہت زیادہ برہم ہو کر کہا:۔
"تم میرے سامنے ایسی باتیں کرتی ہو! ــــــ دین سے تمہارا باپ نکل چکا ہے۔ تمہارا بھائی نکل چکا ہے۔"
زینب نے ترکی بترکی جواب دیا فرمایا:۔
"تو نے تیرے باپ نے، تیرے دادا نے، اللہ کے دین سے، میرے

---

[1] تاریخ اسلام (دارالمصنفین)

باپ کے دین سے، میرے بھائی کے دین سے اور میرے نانا کے دین سے ہدایت پائی ہے۔ کیا تو اس سے انکار کر سکتا ہے؟ اس حقیقت سے وہی انکار کر سکتا ہے جو اوّل درجے کا جھوٹا ہو۔"

یزید کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ اس نے جھلا کر اور تقریباً بیخود ہو کر کہا :-

"جھوٹ تم بولتی ہو!"

حضرت زینب نے فرمایا :-

"تو جور و ظلم کے بل پر فرمانروا اور حاکم بن بیٹھا ہے، تو ظالم ہے بدزبان ہے اور اپنی قوت و طاقت کے زور سے لوگوں کو دباتا ہے۔"

یہ کھری کھری باتیں سن کر یزید شرمندہ ہو کر خاموش ہو گیا [۱]

لیکن اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا۔ کہ بہت زیادہ برہم ہے بس نہیں چلتا۔ ورنہ نہ جانے کیا سلوک ان لوگوں کے ساتھ بھی کر گزرتا۔ ان لوگوں کا تو کچھ نہ کر سکا۔ لیکن آئی گئی ایک اور شخص پر ہو گئی۔ یزید کے حاضرین دربار میں ایک شخص ایسا موجود تھا جو اس کے جاہ و جلال سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ یہ بلال بن غالب تھا۔ یہ اُٹھا اور اس نے یزید کو مخاطب کر کے کہا :-

"اے شخص! تو آج اس مسند حکومت پر بیٹھ کر گھمنڈ محسوس کر رہا ہے شاید تو سمجھتا ہے یہ حکومت ہمیشہ تیرے قبضہ میں رہے گی۔ یہ خدم و حشم قبر میں بھی تیرے ساتھ جائے گا۔ یہ تلواریں اور سنگینیں جن کے بل پر تو نے حکومت حاصل کی ہے۔ میدان محشر میں بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اگر تیرا یہ خیال ہے تو غلط ہے۔

---

[۱] یہ واقعہ تمام مستند کتابوں میں مرقوم ہے۔ دار المصنفین اعظم گڑھ کی کتاب "تاریخ اسلام" میں بھی اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور مصر کی جدید الشیوع کتاب "الحسین" میں بسط و تفصیل کے ساتھ مذکورہ مکالمات کے یہ واقعہ منقول ہے۔ (ر۔ا۔ج)

تو بھی ایک دن مرے گا۔ جس طرح دوسرے لوگ مرتے ہیں۔ تو بھی قبر کے تنگ و تاریک مکان میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔ جس طرح دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہاں تیرے اعمال کی پرسش ہوگی اور تو کوئی جواب نہ دے سکے گا۔ ہاں ایک ذات ہوگی جو شفاعت کر سکے گی۔ اور وہ ذات محمدؐ کی ہوگی۔ بتا، تو کس منہ سے ان کی شفاعت کی امید رکھے گا۔ جب کہ تیرے جیب و دامن پر حسینؓ کے خون ناحق کے چھینٹے ہوں گے۔ تو خاندان مصطفےٰ کی توہین کر رہا ہے۔ تو محمدؐ کی نواسیوں کو رسوا کر رہا ہے تیرے سامنے ایک بدبخت، بدزبان اور بدتمیز شخص، فاطمہ بنت حسینؓ کو اس طرح طلب کرتا ہے۔ جس طرح میدانِ جنگ سے لائی ہوئی باندیاں طلب کی جاتی ہیں۔

اور تیری غیرت نہیں بھڑکتی۔ تیری اسلامی حمیت جوش میں نہیں آتی۔ تیری قریشی عصبیت بھی جوش میں نہیں آتی۔ تو پوری خیرہ چشمی اور دیدہ دلیری کے ساتھ محض اپنی بات کو پیچ کرنے کے لئے زینبؓ سے کہتا ہے کہ تجھے حق ہے۔ کہ فاطمہ کو چاہے، دے دے، تو جھوٹا ہے۔ تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ تجھ میں اگر اسلامی حمیت کا شائبہ بھی ہوتا۔ تو اس شامی کی گردن قلم کر چکا ہوتا۔ تیری تلواریں، اہل بیت نبویؐ کی مقدس گردنوں کو کاٹنا جانتی ہیں لیکن بدنظر، بدزبان اور بدبخت لوگوں کے لئے کند ہو جاتی ہیں۔ تو آج اس دربار میں فرعون اور نمرود کی طرح خدا سے بے نیاز ہو کر اس کے غضب کو فراموش کر بیٹھا ہے اور سمجھ بیٹھا ہے کہ تیری زندگی غیر فانی ہے۔ تیری حکومت لازوال ہے۔ لیکن یہ صرف فریب نفس ہے اور کچھ نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ تو بے بسی اور بے کسی کی موت مرے گا۔ تیرے خاندان پر ادبار آئے گا۔ تیری اولاد کی اس سے زیادہ رسوائی اور تذلیل ہوگی۔ مگر تو کچھ نہ کر سکے گا ——"

بلال کی اس تقریر نے یزید کے دربار پر سناٹا طاری کر دیا۔ خود یزید کی یہ کیفیت تھی کہ دم بخود تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

اس موقع پر ابن سرجون دستگیری کے لئے بڑھا اس نے بلال کو مخاطب

کر کے کہا:-

"اے شخص! تو نہیں جانتا۔ دربارِ خلافت کے آداب کیا ہیں؛ تو یہ بھی بھول گیا کہ کس سے مخاطب ہے؛ اور تجھے یہ بھی پرواہ نہیں کہ اس دریدہ دہنی اور گستاخی کی سزا صرف موت ہے۔"

ہلال نے کڑے تیوروں سے ابن سرجون کو دیکھا۔ اور بے خوفی کے ساتھ کہا:-

"جانتا ہوں۔ اور یہ جانتے ہوئے اپنے دل کی بات کہی ہے۔ میری گردن ضرور کٹے گی لیکن کچھ گردنیں قلم کر کے۔ تیرا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہوں۔ لیکن یہ شامی اب زندہ نہیں بچ سکتا—!"

اس کے بعد دفعتاً ایک تلوار فضا میں چمکی اور دھڑ کی آواز آئی۔ لوگوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ کہ وہ شامی جس نے فاطمہ بنت حسینؑ پر نگاہِ بد ڈالی تھی رقصِ بسمل کا تماشہ دکھا رہا ہے۔ اس کی گردن الگ ہو چکی تھی۔ اور سر بریدہ جسم قلابازیاں کھا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی سرعت کے ساتھ ہوا کہ نہ کوئی ہلال کا ہاتھ پکڑ سکا۔ نہ شامی کو بچا سکا۔

شامی کو قتل کرنے کے بعد ہلال کی تلوار ایک مرتبہ پھر چمکی۔ اور اس مرتبہ وہ ابنِ سرجون کے سر پر پڑی۔ لیکن اب لوگ ہوشیار ہو چکے تھے۔ ابنِ سرجون اگرچہ زخمی ہوا لیکن بچ گیا۔ ہلال پکڑ لیا گیا۔ اور آن کی آن میں اسے قتل کر دیا گیا۔ قتل ہوتے ہوئے اس نے امام زین العابدین کو مخاطب کیا اور کہا:-

"الوداع، اے ابنِ رسول اللہؐ! اب حوضِ کوثر پر یہ خادم آپ کا دیدار کرے گا۔"

باب ۸۷

بخت واتفاق

بعض مرتبہ اتفاقات بھی عجائبات و معجزات سے کم حیرت انگیز نہیں ہوتے۔ کون کہہ سکتا تھا نعیم، قزاقی کا پیشہ ترک کر کے ایک مردِ صالح اور نیکوکار بن جائے گا! کسی کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ نعیم کے لٹیرے ساتھی صوم و صلوٰۃ کے پابند، بندۂ خاشع، صائم النہار اور قائم اللیل بن جائیں گے؛ وہ لوگ جن کے دن کی سرگرمیاں اور رات کی جولانیاں، قتل و غارت، کشت و خون، سفاکی اور شقاوت، لوٹ مار اور مالِ حرام کے حصول میں صرف ہوتی تھیں ——— اب وہی ذوق و شوق کے ساتھ تلاوتِ قرآن کرتے ہیں۔ ذکرِ رسولؐ پر جن کی آنکھوں سے جوئے اشک رواں ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی کیا کچھ کم عجوبہ تھا کہ ربیع نے میدان کربلا میں جاں نثاری اور فداکاری کا جوہر دکھانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ دشمنوں نے اس کی جان لینے پر کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پھر بھی وہ ہلاک نہ ہوا۔ زندہ بچ گیا۔ اور یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ جب وہ موت و زلیست کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ کشتوں کے ڈھیر میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ نعیم پہنچ گیا۔ گیا تھا لوٹ مار کرنے۔ لیکن اہلِ بادیہ نے حادثہ کربلا کی نشان دہی کر کے۔ اس کی غیرت و حمیت کو ابھارا، اور بے قابو ہو کر اس میدان میں پہنچا جہاں سر بریدہ نعشیں پڑی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک ایک کے قدموں کو بوسہ دیا تلواروں کو آنکھوں سے لگایا۔ رویا اور جی بھر کے رویا۔ پھر باچشمِ خوں فشاں، ان

سب کی تجہیز و تدفین کا بندوبست کیا۔ ابن سعد اور شمر نے یہ لاشیں تپتی ہوئی ریت پر اس لئے چھوڑ دی تھیں۔ کہ ان کی زیادہ سے زیادہ بے حرمتی ہو۔ نعیم نے ان کی تدفین کی۔ اور انہیں عزت و احترام کے ساتھ دفن کر دیا۔ ربیع یہیں ملا تھا۔ اور وہ اپنے زندہ جانے پر نادم تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ اس غم میں خودکشی کرے گا۔ لیکن نعیم نے اسے سنبھالا، سہارا دیا، سمجھایا۔ اسے ابھارا کہ مرنے کی باتیں نہ کرو، زندہ رہو۔ اور اس لئے زندہ رہو کہ قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لو۔ انہیں زندہ نہ رہنے دو۔ انہیں عبرت انگیز طور پر ہلاک کرو۔

ربیع اور لیلے کی ملاقات بھی بالکل اتفاقی تھی۔ لیلے، ربیع سے مایوس ہو چکی تھی اور ربیع، لیلے سے مایوس ہو چکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مردہ یا کم از کم لاپتہ سمجھ لیا تھا۔ لیکن بخت و اتفاق نے انہیں پھر ملا دیا۔ اور وہ پھر ایک جان دو قالب بن کر ایک دوسرے سے بالکل قریب رہ کر، لیکن ایک دوسرے سے دور زندگی بسر کرنے لگے۔ دونوں اپنے عہد کے پابند تھے۔ اور عہد یہ تھا کہ جب تک قاتلانِ حسینؑ زندہ ہیں۔ ہم زندگی کی کسی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ ہماری زندگی کا نیا اور مسرت آفریں دور اسی وقت شروع ہوگا۔ جب اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ جب ہماری زندگی کی زمین بدل جائے گی۔ آسمان بدل جائے گا۔"

دن گزرتے جا رہے تھے۔ اور نعیم و ربیع کی جماعت بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ جماعت کوفہ میں قائم ہوئی تھی۔ اور خفیہ طور پر اپنے خیالات و مقاصد کی نشر و تبلیغ کا کام شروع کر رہی تھی۔ اس جماعت کا نام "توابین" تھا۔ اس میں وہ لوگ شامل ہو رہے تھے۔ جنہوں نے یزید اور ابن زیاد کی دہشت یا داد و دہش یا غفلت اور سستی کے باعث میدان کربلا میں امام عالی مقام کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اب یہ اپنی حرکتوں پر نادم اور شرمسار تھے۔ اور اپنی عظیم کوتاہی کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنا نام توابینؔ یعنی گناہ اور غلطی سے توبہ کرنے والے

لوگ رکھا تھا۔ توابین کی جماعت خفیہ طور پر اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس کے تاثرات اس طرح پھیل رہے تھے، جیسے جنگل کی آگ ——— !

باب ۸۸

قاتلانِ حسینؑ کا انجام !

یزید مر گیا ـــــــــ یہ فتح اسے راس نہ آئی ۔ اس فتح کے بعد وہ چند سال بھی حکومت نہ کر سکا ۔ اس کا ایک لمحہ بھی راحت و آرام ، اطمینان اور بے فکری سے بسر نہیں ہوا ۔ قتل حسینؑ ایسی چیز نہیں تھی ۔ جسے امتِ مسلمہ چپ چاپ برداشت کر لیتی ۔ ہر طرف بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ شورش اور بدامنی کے آثار پیدا ہونے لگے ۔ بغاوت اور سرکشی کی سر بر بفلک موجیں ، عالمِ اسلام کے گوشہ گوشہ سے اُٹھ اُٹھ کر دمشق کے ایوانِ خلافت سے ٹکرانے اور اسے زیر و زبر کرنے لگیں ۔ یزید یہ سب کچھ دیکھ کر سہما جا رہا تھا ۔ لرز رہا تھا ـــــــــ جس حکومت کو اس نے خونریزی کے بعد حاصل کیا تھا ۔ اس کے ستون ہلتے نظر آ رہے تھے ۔ وہ محسوس کر رہا تھا ۔ ہر شخص اسے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھ رہا ہے ۔ جو نظر اٹھتی ہے اس میں نفرت کا زہر چمک رہا ہے ۔ اس کا نظام حکومت متزلزل ہو گیا تھا ۔ اس کا ایوانِ حکومت لرز رہا تھا ۔ اور خود اسے اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی ۔

یزید کے انتقال نے حالات اور زیادہ ابتر کر دیئے ۔ اسکا بیٹا اور ولی عہد ۔ معاویہ بن یزید ۔ باپ سے زیادہ سمجھدار اور دور اندیش تھا ۔ وہ مسجد جامع میں پہنچا اور اس نے تقریر کرتے ہوئے کہا :-

"لوگو !

میں یہ حکومت تمہیں واپس کرتا ہوں ۔ اس حکومت کی بنیاد ظلم و جور پر ہے ۔

اسلام دشمنی اور مسلم آزادی پر ہے ۔ خاندانِ نبوت کی توہین اور ساری
امت کی تذلیل پر ہے۔ میں اس حکومت سے دستبردار ہوتا ہوں ۔"

معاویہ بن یزید کی دستبرداری[1] نے اموی حکومت کی چولیں ڈھیلیں کر دیں۔ یزید کی حکومت میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کا جانشین بن سکتا ۔ اس کا ایک لڑکا تھا خالد ۔لیکن وہ بالکل نوعمر تھا ـــــ خالد کی ماں اور یزید کی بیوی نے مروان سے شادی کر لی تھی، وہ بوڑھا تھا لیکن نہایت چالاک ۔طے یہ ہوا تھا کہ وہ خالد کو ولی عہد نامزد کرلے گا۔ لیکن تختِ خلافت پر قبضہ کرنے کے بعد خالد کی نامزدگی کے وعدہ سے مکر گیا۔ اور اپنے بیٹے عبدالملک کو اپنا جانشین بنا کر سب سے اس کی ولی عہدی پر جبری بیعت لے لی ۔ بالکل اسی طرح جیسے یزید کے لیے جبری بیعت لی گئی تھی ۔تاریخ اپنے آپ کو یونہی دہراتی ہے واقعات اسی طرح پلٹا کھاتے ہیں ۔ اپنے کرتوتوں کا چلن اسی طرح انسانوں کو دیکھنا پڑتا ہے یزید کی بیوی نے اپنے نئے لیکن بوڑھے شوہر سے یوں انتقام لیا کہ تکیوں میں دبوچ کر اس کا دم گھونٹ کر ہلاک کر دیا[2] اور وہ غریب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا ۔ اپنی حسرتیں ساتھ لے گیا۔ لیکن مروان کی موت نے یزید کی بیوی کو کہیں کا نہ رکھا۔ عبدالملک جوان تھا زندہ دل تھا ـــــ ہوشیار اور چالاک تھا۔ خالد جیسا لڑکا اس کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ خلافت یزید کے خاندان سے نکل گئی ۔ اور ایک دوسرے خاندان میں منتقل ہو گئی ۔ اب عبدالملک بن مروان تختِ خلافت پر قابض تھا۔

عبدالملک بیٹھنے کو تو تختِ خلافت پر بیٹھ گیا۔ لیکن اسے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ کب تک اس تخت کو اپنے قبضہ میں رکھ سکے گا۔

عبداللہ بن زبیر نے خلافت کا دعویٰ کیا تھا ۔ اور سارا حجاز ان کا مطیع بن گیا تھا۔

---

[1] تاریخ اسلام - (عہد بنوامیہ)
[2] تاریخ اسلام (دارالمصنفین)

انہیں عام مجرموں کی طرح سزائیں دی تھیں انہیں قتل کیا تھا ـــــ بتاؤ، آخر تمہارا وہ دبدبہ کہاں گیا؟ وہ قوت و اطاعت کیا ہوئی؟ تم نے یزید کے بل پر گناہ کئے، پاپ کیا۔ خونِ ناحق تک سے گریز نہ کیا۔ بتاؤ، کیا آج تمہیں یزید بچا سکتا ہے؟

لیکن ان لوگوں کو سانپ سونگھ گیا تھا یہ جواب دینا بھی چاہتے تو کیا دیتے؟

مختار نے کہا:۔

"آج تمہیں عبرت انگیز موت سے دوچار ہونا پڑے گا"

یہ کہہ کر اس نے ریحان اور نعیم سے کہا:۔

"ان سب لوگوں کو ہلاک کر دو۔ لیکن نہایت بے دردی کے ساتھ ـــ تاکہ مرنے سے پہلے یہ محسوس کر لیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا"

حکم کی تعمیل شروع ہوئی ـــــ شمر کی لاش کتوں سے بھنبھوڑوا دی گئی۔ باقی میں کچھ کو آگ میں جلا کر مارا گیا۔ بعض کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے کچھ ایسے تھے جنہیں شکنجہ میں کس دیا گیا اور تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی گئی۔ خولی وہ تھا۔ جو امام حسینؓ کی گردن کاٹنے کے لئے ان کی شہادت کے بعد بڑھا تھا۔ مختار نے حکم دیا اسے قتل کر دو۔ پھر اس کی لاش آگ پر جلوادی۔ اور بہت جلد وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی[1]

ان سب کے قتل سے فارغ ہو کر مختار نے کہا:۔

"آج میرے دل کا بوجھ اترا۔ آج میں خوش ہوں۔ بہت زیادہ خوش، آج ان انسان نما درندوں کو انہی کے طریقوں سے میں نے ہلاک کر دیا ـــــ جو ننگِ اسلام تھے، ننگِ انسانیت تھے ـــــ لیکن ابن زیاد اب تک میرے تصرف سے باہر ہے ابراہیم بن اشتر اور ربیع اس سے لڑنے گئے ہیں وہ شام سے بہت بڑا لشکر لے کر نکلا ہے۔ نہ جانے اس جنگ کا انجام کیا ہوا ـــ؟"

اتنے میں شاداں و فرحاں نیزے پر ابن زیاد کا سر آویزاں کئے ہوئے ربیع داخل

---

[1] "الحسین" مطبوعہ مصر۔

کوفہ اور بصرہ پر بھی ان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور عبدالملک کی خلافت و امارت قفس میں دم توڑ رہی تھی۔

کوفہ پر مختار بن ابی عبید الثقفی عبداللہ بن زبیر کی طرف سے حاکم تھا۔ اس کے دستِ راست نعیم اور ربیع تھے۔

مختار اسی دارالامارۃ میں قیام پذیر تھا۔ جہاں ابن زیاد کا طوطی بولتا تھا۔ جس کی چھت پر امام حسینؑ کے قاصدوں اور دوسرے محبانِ اہلِ بیت کو دھکیل دھکیل کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس دارالامارۃ میں پہلے خدا کے نیک بندوں کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ اب کسی کی مجال نہیں تھی کہ بد زبانی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کر سکے۔ پہلے اس دارالامارۃ میں وہ سپاہی گشت کرتے رہتے تھے۔ جن کی تلواریں اور سنگینیں خدا کے نیک صالح بندوں کو قتل کرنے کے لئے بے چین رہتیں تھیں۔ اب تلواریں ان لوگوں کے ہاتھ میں تھیں جو حق کی خاطر میدانِ جنگ میں اترنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

آج کا دن بڑا مبارک دن تھا۔ آج مختار کی کوششیں بارآور ہوئی تھیں۔ ربیع کی تمنا پوری ہوئی تھی۔ نعیم کی آرزو برآئی تھی۔

وہی دارالامارۃ تھا جہاں ابن زیاد، نمرود و فرعون کا قائم مقام بن کر بیٹھا تھا۔ اور اس کے سامنے وقت کا نیکوکار، پارسا اور اصحاب نبیؐ مجرم اور ملزم کی حیثیت سے پیش ہوتے تھے۔ اور وہ انہیں سزا دیتا تھا۔ ان کی توہین و تذلیل کرتا تھا۔ آج اسی دارالامارۃ میں، اسی مسند پر مختار حاکم کی حیثیت سے بیٹھا ہے۔ اور شمر و ابن سعد، حصین بن نمیر اور خولی وغیرہ ملزم کی حیثیت سے حاضر ہیں۔ یہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ ان کے چہروں پر پھٹکار برس رہی ہے۔ اور مختار ان سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

اے شمر ——— اے ابن سعد ——— اے خولی ——— ! تم وہ ہو۔ جنہوں نے سبطِ رسولؐ کی گردن کاٹی تھی۔ جنہوں نے مسلمان ہو کر اسلام کو رسوا کیا تھا۔ جنہوں نے پاکبازوں، پارساؤں، نیکوکاروں اور اصحابِ رسولؐ تک کی توہین و تذلیل کی تھی۔

ہوا۔ اس نے کہا:۔

"ابن زیاد بہت بڑا لشکر لے کر شام سے مقابلہ کو آیا تھا۔ نہر خازر پر ایک ہولناک جنگ ہوئی۔ اس کا لشکر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہ بھی بھاگ رہا تھا۔ لیکن میں اس کی تاک میں تھا۔ میں نے پہلے اسے گرفتار کیا پھر قتل کر دیا۔ اس نے، بہت منتیں کیں۔ خوشامد کی رشوت پیش کی، مناصب کا لالچ دیا۔ لیکن میں نے اس کی زبان کاٹ لی اس کے ہاتھ تراش دیئے۔ پھر اس کی گردن قلم کر دی۔"

مختار نے خوشی سے بیخود ہو کر کہا:" جزاک اللہ! تم نے بہت بڑا کام کیا۔ تم نے بہت بڑے موذی کو ہلاک کر دیا۔ اگر میری گردن بھی انعام میں مانگو تو فخر اور مسرت کے ساتھ پیش کر دوں گا۔ یہ کام مجھے کرنا چاہیئے تھا لیکن تم نے اسے انجام دیا۔ اور نہایت شاندار طور پر ——— لیکن ابھی تمہیں ایک اور کام کرنا ہے۔"

ربیع نے اشتیاق کے ساتھ کہا:" فرمایئے وہ کون سا کام ہے جو مجھے ابھی انجام دینا ہے؛ سر آنکھوں سے انجام دوں گا۔!"

مختار نے کہا: مدینہ جاؤ اور ابن زیاد۔ ابن سعد اور خولی کے سر لیتے جاؤ ——— انہیں امام زین العابدینؓ کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کر دو میری طرف سے۔"

نعیم نے کہا:" اس سعادت میں، مَیں بھی حصہ لینا چاہتا ہوں ——— زندگی کے باقی دِن میں انہی کی خدمت میں وقف کر دینا چاہتا ہوں۔!"

مختار نے خوشی سے اجازت دے دی۔

باب ۸۹

اے فلک رشک سے نہ جل مرنا

اور دوسرے روز ایک مختصر سا قافلہ کوفہ سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوگیا۔
اس قافلہ میں ربیع تھا، ریحان تھا، نعیم تھا، اس کا خاندان تھا۔ اس کے ساتھی تھے اور لیلیٰ تھی۔

بہت جلد یہ قافلہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ امام زین العابدینؓ کی خدمت میں جب یہ سرپیش کئے گئے تو وہ سجدے میں گر پڑے۔ اور انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا:۔

"میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ کہ اس نے خطا کاروں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ لیکن میں ان کے کٹے ہوئے سر دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوں۔ جتنی خوشی اس وقت ہوتی۔ جب انہیں غلطی پر نادم دیکھ لیتا۔ بہرحال خدا کی مرضی یہی تھی!"

اور دوسرا روز کتنا مبارک، کتنا مسرت بخش اور کتنا نشاط آفریں تھا۔
آج امام زین العابدینؓ نے بنفسِ نفیس ربیع کا نکاح لیلےٰ سے اور سلمیٰ کا نکاح ریحان سے پڑھایا۔

ربیع اور ریحان کی مسرت کا تو کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ لیکن لیلیٰ اور سلمیٰ کی مسرت کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سلمیٰ اور لیلیٰ دلہنیں بنی پاس پاس بیٹھی تھیں۔ اور سلمیٰ اسے چھیڑ رہی تھی۔

"عامر بن کر تم نے میرے ساتھ دغا بازی کی۔ اب لیلیٰ بن کر ربیع کی قسمت نہ پھوڑ دینا۔"

لیلیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلمیٰ کے ایک چٹکی لی اور مسکرا دی ——!

ختم شد

کتابت :- محمد اقبال، حضرت کیلیانوالہ شریف